ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ اور تنظیمِ اسلامی

ایک تعارف

تاریخی پس منظر دعوت طریقۂ کار

نظم کی اساس متفرق دستاویزات

بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کی تحریروں اور تقریروں پر مشتمل تالیف

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ اور تنظیم اسلامی ایک تعارف

بسم الله الرحمن الرحيم

نام کتاب : ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ اور تنظیمِ اسلامی ......ایک تعارف

ترتیب جدید : مرکز تعلیم و تحقیق، قرآن اکیڈمی یٰسین آباد، کراچی

ناشر : شعبۂ مطبوعات، انجمن خدام القرآن سندھ کراچی
قرآن اکیڈمی یٰسین آباد، شارع قرآن اکیڈمی،
بلاک 9، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔
فون: 021-36806561 فیکس: 021-36337346
ای میل: publications@quranacademy.com
ویب سائٹ: www.quranacademy.com

طبع سوم : ۴ رجب ۱۴۳۳ھ مطابق 26 مئی 2012ء

اشاعت خاص : تعداد : ہدیہ :

اشاعت عام : تعداد : ہدیہ :

Email: publications@tanzeem.org
website : **www.tanzeem.org**

دیگر مکتبہ جات

KARACHI:
Phones : (+92-21) 3534 00 22, 3534 00 23

ISLAMABAD :
Phones : (+92-51) 443 44 38, 443 54 30

PESHAWAR :
Phones : (+92-91) 221 44 95, 226 29 02

QUETA :
Phone : (+92-81) 284 29 69

HYDERABAD :
Phone : (+92-22) 265 29 57

GUJRANWALA :
Phones : (+92-55) 301 55 19, 389 16 95

LAHORE:
Phones : (+92-42) 3584 50 90, 3636 66 38

FAISALABAD :
Phone : (+92-41) 262 42 90

MULTAN :
Phones : (+92-61) 52 10 70, 814 92 12

JHANG :
Phone : (+92-47) 762 83 61

SUKKUR :
Phone : (+92-71) 563 10 74

HAROONABAD :
Phone : (+92-63) 225 11 04

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشتے پرے داری
بیا با من ترا آموزم طریقِ شاہبازی را

علامہ اقبال

اگر تمہاری رگوں میں کچھ خون ہے، اگر کچھ بال و پَر رکھتے ہو...... میرے پاس آؤ میں تمہیں طریقِ شاہ بازی سکھاؤں۔

فہرست

عرضِ ناشر ۹

تقدیم ۱۱

حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

حصہ اوّل

بانیٔ تنظیمِ اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے حالاتِ زندگی اور دینی خدمات ۱۶

حافظ انجینئر نوید احمد حفظہ اللہ

حصہ دوم

تنظیمِ اسلامی کا تعارف اور تاریخی پس منظر
بانیٔ تنظیم کی تحریروں کے آئینے میں

باب اوّل — اُمّتِ مسلمہ کے عروج و زوال کے ادوار
اور
موجودہ احیائی مساعی کا اجمالی جائزہ ۴۰

باب دوم — عزم تنظیم
یعنی
تنظیم اسلامی کے قیام کے فیصلے کا اعلان ———— ۷۷

باب سوم — قرار دادِ تاسیس مع توضیحات و تقاریظ ———— ۱۲۷

باب چہارم — روداد منتقلی امارت ———— ۱۸۱

حصّہ سوم

تنظیم اسلامی کی فکر اور طریق کار

باب اوّل — فرائض دینی کا جامع تصوّر
مختصر تحریر اور مفصّل تقریر ———— ۱۹۴

باب دوم — رسولِ انقلاب کا طریقۂ انقلاب ———— ۲۳۱

باب سوم — اسلامی نظم جماعت میں بیعت کی اہمیت ———— ۲۸۰

چند ضمیمے

تنظیمِ اسلامی کے متفرق دستاویزات

(ا) عقائد اور بنیادی دینی تصوّرات ____ ۳۱۲

(ب) منشور ____ ۳۲۵

(ج) دستور ____ ۳۳۳

(د) نظامُ العمل ____ ۳۴۶

(ہ) عہد نامۂ رفاقت ____ ۳۸۷

(و) ذاتی اصلاحی یادداشت ____ ۳۸۹

تمت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کررہا تھا میں مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

زیرِ نظر کتاب اصلاً ''نسخہ ہائے وفا'' کی تالیف ہی ہے۔ اس مجموعۂ خیال کے اجزاءِ فرد فرد کی حیثیت تنظیم اسلامی کے لٹریچر کو حاصل ہے۔ دراصل ماجرا یہ ہے کہ بانیٔ تنظیم اسلامی، داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے افکارِ عالیہ کے اظہار وابلاغ کے لئے تقریر وخطابت کو اپنا اصل Medium بنایا اور اسے خوبی کے ساتھ برت کر دکھایا۔ وقتاً فوقتاً یہ دروس وخطبات کیسٹ کی رِیل سے اُتر کر صفحۂ قرطاس کی رونق بنتے رہے۔ انہی دروس وخطبات پر مبنی کتابچے، تنظیم اسلامی کا لٹریچر کہلائے اور ساتھ ہی کچھ مختصر مگر قیمتی تحریریں بھی بانیٔ محترمؒ کے قلم سے صادر ہوئیں اور اس لٹریچر کی زینت بنیں۔

الحمدللہ! تنظیمی وسعت اور دعوتی کام کے پھیلاؤ کے پیشِ نظر اس بات کی ضرورت عرصے سے محسوس کی جارہی تھی کہ ایک ایسی کتاب تیار کی جائے جو بہت زیادہ ضخیم بھی نہ ہو مگر تنظیم اسلامی کے ایک جامع تعارف کے لئے کفایت کرجائے۔

اس خیال کے پیشِ نظر بانیٔ تنظیمؒ کی خدمت میں، اُنہی کے کتابچوں کے منتخب حصوں پر مبنی ایک تالیف کا خاکہ پیش کیا گیا۔ یہ غالباً، 2009ء کی بات ہے۔ ابتدائی منظوری کے بعد اُس نقشے پر کام کا آغاز کردیا گیا اور حتمی منظوری کے لئے مسودہ تیاری کے مراحل میں تھا کہ بانیٔ محترمؒ کی وفات کا سانحۂ عظیم پیش آگیا۔ بعد ازاں امیرِ محترم حافظ عاکف سعید صاحب' جو پہلے ہی سے اس پروجیکٹ میں خصوصی رہنمائی فراہم کررہے تھے، نے فیصلہ فرمایا کہ اب اس کتاب میں تنظیم اسلامی کے ساتھ ساتھ بانیٔ تنظیم اسلامی کے حالاتِ زندگی اور دینی خدمات کا مختصر تعارف بھی شامل ہونا چاہئے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے حافظ انجینئر نوید احمد صاحب کا مضمون ''ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ، حالاتِ زندگی اور دینی خدمات'' کو بھی شاملِ اشاعت کیا جارہا ہے۔

یہ تالیف تین حصوں اور چند ضمیمہ جات پر مبنی ہے۔ حصہ اول میں جیسا کہ عرض کیا گیا، بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی اور دینی خدمات کا مختصر تعارف حافظ انجینئر نوید احمد صاحب کے قلم سے پیش کیا گیا ہے۔ حصہ دوم میں تنظیم اسلامی کا تعارف اور تاریخی پسِ منظر بانی تنظیم کی تحریروں اور تقریروں کے آئینے میں پیش کیا گیا ہے۔ حصہ سوم تنظیم اسلامی کی دعوت اور طریقۂ کار کے بیان پر مشتمل ہے۔ کتاب کے آخر میں شامل ضمیمہ جات اصلاً چند اصولی اور انتظامی نوعیت کی دستاویزات پر مشتمل ہے۔

ان متفرق اجزاء کے مابین ایک معنوی اور مقصدی ربط پایا جاتا ہے، جس کی رعایت کرتے ہوئے ان اجزاء کو ایک تالیفی کل میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی نسبت سے قارئین کی سہولت کے لئے ہر حصے، باب یا فصل سے پہلے ایک مختصر ادارتی نوٹ درج کیا گیا ہے۔ اس نوٹ میں ماقبل و مابعد کے درمیان پائی جانے والی مناسبت کو واضح کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اُس تحریر کے زمانی و مکانی سیاق وسباق کی وضاحت اور تنظیمی لٹریچر میں اُس کے محلِ وقوع کی نشاندہی کی گئی ہے۔

یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ کتاب میں موجود حاشیے بانی محترمؒ ہی کے تحریر کردہ ہیں، سوا اُن حاشیوں کے کہ جن کے اختتام پر قوسین میں ''مرتب'' لکھا ہوا ہے۔

کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کے اعتبار سے ممکنہ سعی کی گئی ہے، البتہ ہم قارئین کی جانب سے کسی غلطی کی نشاندہی پر اُن کے شکر گزار رہوں گے اور آئندہ ایڈیشن میں تصحیح کر لی جائے گی۔ (ان شاء اللہ)

آخر میں ہم اللہ رب العزت کے حضور دعا گو ہیں کہ وہ اس اشاعت کو اسلام اور مسلمانوں کے حق میں دنیا اور آخرت کے اعتبار سے مفید بنائے اور اسلام کے اس انقلابی فکر کی امانت، جو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے ہوتے ہوئے بانی تنظیم محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ ہم وابستگانِ تنظیم اسلامی تک پہنچی ہے، کو بڑے پیمانے پر بندگانِ خدا تک پہنچانے کا ذریعہ بنا دے۔ آمین

ناظم، شعبۂ مطبوعات
قرآن اکیڈمی یٰسین آباد

ہفتہ 26 جمادی الاولیٰ 1432ھ
بمطابق 30 اپریل 2011ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم

امیرِ تنظیم اسلامی **حافظ عاکف سعید** حفظہ اللہ

دورِ حاضر کے عظیم داعیِ قرآن اور دینی رہنما ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ —— جو راقم کے محسن و مربی ہی نہیں، والد گرامی بھی تھے —— گزشتہ برس 14 اپریل 2010ء بمطابق 28 ربیع الثانی 1431ھ ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ اُن کی شخصیت مسلمانان پاکستان کے لیے ہی نہیں، دنیا کے ہر کونے اور گوشے میں بسنے والے اردو بولنے اور سمجھنے والے افراد کے لیے بھی محتاج تعارف نہیں تھی۔ تاہم اکثر لوگ ان کی ذات کے حوالے سے بس اسی قدر واقف ہیں کہ وہ ایک بے مثال مدرس و معلّم قرآن تھے، انہیں اللہ نے غیر معمولی قوتِ بیانیہ سے نوازا تھا اور ایسا دل پذیر اور موثر اندازِ خطابت عطا فرمایا تھا کہ جب وہ قرآن کو بیان کرتے تو نہ صرف یہ کہ قرآن کے حرف حرف میں پوشیدہ پیغام ہدایت پوری وضاحت کے ساتھ سننے والوں کو سمجھ میں آتا تھا بلکہ وہ قلب و ذہن میں سرایت کرتا اور ہلچل مچاتا محسوس ہوتا تھا۔ اُن کا درس قرآن' سننے والوں کے ایمان ویقین میں اضافے کا موجب بھی بنتا تھا اور اس سے قرآن حکیم کی عظمت کا ایک واضح نقش بھی ذہن وقلب پر ثبت ہو کر رہتا تھا۔ انہوں نے بے شمار اہم دینی موضوعات کو اپنے خطابات کا موضوع بنایا۔ ہر خطاب سننے والوں کی ذہنی الجھنوں کو رفع کرنے اور دینی شعور میں اضافے کا موجب بنتا۔ اللہ نے اُنہیں وہ غیر معمولی قوتِ بیانیہ عطا فرمائی تھی کہ وہ کسی ایک دینی موضوع پر قرآن وسنت کی روشنی میں علمی اور تحلیلی (Analytical) انداز میں گھنٹوں خطاب فرماتے اور سننے والے ہزاروں سامعین کی محویت اور انہماک آخری لمحے تک برقرار رہتی۔ بین الاقوامی سطح پر ڈاکٹر صاحبؒ کے اس تعارف کے وسعت پذیر ہونے میں پاکستان کے مختلف ٹی وی چینلز بالخصوص QTV اور ARY کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر ذاکر نائیک کے قائم کردہ Peace TV کا کردار خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اُن کے دروس وخطابات سے استفادے کے دائرے کو بے پناہ وسعت دینے کے لیے عالم اسباب میں مذکورہ بالا چینلز کو ذریعہ بنایا۔ چنانچہ ان کی وفات کی خبر کو مسلمانانِ پاکستان کے ساتھ ساتھ بھارت اور مقبوضہ

کشمیر کے کروڑوں مسلمانوں نے بھی ذاتی صدمے و رنج کے طور پر محسوس کیا بلکہ دنیا کے کونے کونے سے ٹیلی فون اور ای میل کے ذریعے تعزیتی پیغامات کا ایک سیلاب اُمڈ آیا تھا جس سے اندازہ ہوا کہ پوری دنیا میں پھیلا ہوا اردو بولنے اور سمجھنے والے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ اپنے صدمہ و رنج کے اظہار کے لیے بے چین اور بے تاب تھا۔ چنانچہ تعزیتی پیغامات کا سلسلہ ان کی وفات کے مہینوں بعد تک جاری رہا۔ اسی طرح مرحوم کے جنازے میں اہل لاہور کی والہانہ شرکت اور عقیدت مندوں کا سیل رواں مرحوم کے حلقہ تعارف کی بے پناہ وسعت اور ان کے ساتھ اس بے پناہ قلبی تعلق خاطر کی چغلی کھا رہا تھا جس کا واحد سبب یہی تھا کہ قرآن حکیم کا پیغام عوام الناس تک موثر انداز میں پہنچانے کی خدمت کو اللہ نے شرف قبول بخشا ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

تاہم دنیا کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ان کروڑوں عقیدت مندوں کی ایک عظیم اکثریت انہیں محض ایک عظیم داعی و مدرس قرآن کی حیثیت سے جانتی ہے۔ بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ انہوں نے جہاں قرآن کے آفاقی پیغام کو عام کرنے اور دنیا کے مسلمانوں کی دینی حوالے سے فکری و علمی رہنمائی کا عظیم فریضہ سرانجام دیا، وہاں قرآن کی آفاقی ہدایت پر عمل پیرا ہونے اور دین کے عملی تقاضوں بالخصوص غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد کی خاطر ایک منظّم جماعت کی داغ بیل بھی ڈالی اور اس کٹھن اور پُرصعوبت راہ پر عملی طور پر قدم رکھنے کی خاطر ایک قافلہ بھی تشکیل دیا جو گزشتہ کم و بیش 36 برس سے اس مملکتِ خداداد پاکستان میں ''تنظیم اسلامی'' کے نام سے نظام خلافت کے قیام کی جدوجہد میں سرگرم عمل ہے اور وہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس تنظیمی قافلے کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کی خاطر اپنے جسم و جاں کی تمام تر توانائیاں اس درخت کے سیراب کرنے میں خرچ کرتے رہے۔ اس حوالے سے ان کی پوری زندگی' ایک عظیم تحریکی شاعر ملک نصر اللہ عزیز کے اس شعر کی عملی تفسیر تھی کہ۔

مری زندگی کا مقصد' تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں' میں اسی لیے نمازی

ان کے نزدیک اللہ سے محبت اور اس کی رضا کے حصول کے دیگر لازمی تقاضوں کے ساتھ ساتھ ایک نہایت اہم تقاضا غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد میں تن من دھن لگا کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی وفاداری کے

امتحان میں پورا اترنا ہے۔سورۃ الحدید کی آیت 25 میں اسی اہم حقیقت کی طرف رہنمائی ملتی ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۞

''ہم نے بھیجے اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتارے اُن کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ سیدھے رہیں عدل پر اور ہم نے اُتارا لوہا اس میں لڑائی کی سخت قوت ہے اور لوگوں کے لئے دیگر فائدے بھی، تاکہ معلوم کرے اللہ کون مدد کرتا ہے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی بن دیکھے۔ بے شک اللہ زورآور اور زبردست ہے''

ان کا مؤقف تھا کہ قرآن حکیم کی تعلیم و تعلّم کا کام یقیناً اپنی جگہ نہایت فضیلت کا حامل ہے' اور اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان کہ ''خیر کم من تعلم القرآن وعلمہ'' (تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو قرآن کا علم حاصل کرے اور دوسروں کو قرآن کی تعلیم دے) بلاشبہ حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے' لیکن قرآن حکیم کے تعلّم و تعلیم کے نتیجے میں اس کے جو عملی تقاضے اور دینی ذمہ داریاں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں اُن سے پہلوتہی اور کوتاہی کرنا اپنے ایمان کو خطرے میں ڈالنے اور نفاق کا خطرہ مول لینے کے مترادف ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کو نہ صرف اپنی انفرادی دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی کی فکر کرنا ہوگی بلکہ فی زمانہ امت کی اجتماعی ذمہ داریوں یعنی شہادتِ حق اور غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد میں بھی اپنا حصہ ڈالنا ہوگا' اس لیے کہ آج دین مغلوب ہے۔ روئے ارض پر کسی ایک مقام پر بھی حقیقی معنوں میں اللہ کا کلمہ سربلند نہیں ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اُن 57 ممالک میں بھی جہاں مسلمانوں کی عددی اکثریت ہے اور ان ممالک میں اکثر و بیشتر اقتدار و اختیار بھی مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں ہے' اللہ کا دین قائم ہے نہ اُس کے رسول ﷺ کی لائی ہوئی شریعت نافذ ہے ـــــ!!! آج پوری دنیا میں مسلمانوں کی ذلت و رسوائی اور بے بسی و زبوں حالی کا اصل سبب بھی یہی ہے۔ یعنی قرآن کی ہدایت اور اللہ کے دین سے عملی پہلوتہی اور گریز کی روش!

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

والد محترم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مسلمانوں کا یہ مجرمانہ طرزِ عمل ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی تباہی و

خسارے کا موجب بن سکتا ہے۔ اللہ کے دین سے اس کھلی بے وفائی اور بے اعتنائی کے نتیجے میں آج اللہ کی طرف سے پوری امت پر ذلت ومسکنت کا عذاب مسلط ہے۔ اور اگر ہم نے اپنی روش تبدیل نہ کی تو عاقبت برباد ہونے کا بھی شدید اندیشہ ہے۔ **اعاذنا اللّٰہ من ذٰلک!**

بہرکیف‘ غلبہ واقامتِ دین کی اس جدوجہد کی ضرورت واہمیت کا احساس انہیں زمانۂ طالب علمی ہی میں ہو گیا تھا۔ اسی کا مظہر تھا کہ لاہور میں میڈیکل کی تعلیم کے دوران انہوں نے اسلامی جمعیت طلبہ کی رکنیت اختیار کی اور اس میں نہایت فعال کردار ادا کیا۔ 1954ء میں ایم بی بی ایس مکمل کرنے کے فوراً بعد اسی مقصد کے لیے جماعت اسلامی میں شمولیت کے لیے درخواست دے دی اور وہاں بھی بہت جلد اپنی غیر معمولی صلاحیتوں‘ جذبۂ صادق اور فعالیت کے باعث ایک مقام حاصل کیا —— بعد میں جب حکمت عملی اور لائحہ عمل کے اختلاف کے باعث جماعت اسلامی کو خیر باد کہا تب بھی مقصدیت کی لگن نے انہیں چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ ابتدا میں انہوںؒ نے مذکورہ بالا اختلاف کی بنیاد پر جماعت اسلامی سے الگ ہونے والے افراد کو جن میں بعض اکابر بھی شامل تھے‘ جمع کر کے غلبہ واقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے ایک نیا قافلہ تشکیل دینے کی سرتوڑ کوشش کی۔ لیکن جب یہ کوشش بوجوہ بارآور نہ ہوسکی تو تن تنہا اس مقصد عظیم کی خاطر دروس قرآن کی شکل میں قرآن حکیم کے انقلابی پیغام کے ابلاغ کی بنیاد پر ’’تنظیم اسلامی‘‘ کے نام سے ایک قافلہ ترتیب دیا جس نے مارچ 1975ء میں بفضل اللہ تعالیٰ اپنے سفر کا آغاز کیا۔ اور اپنی زندگی کے آخری سانس تک وہ اسی قافلے کی آبیاری اور اس کے ذریعے غلبہ واقامتِ دین کی جدوجہد میں سرگرم رہے۔ بحمداللہ تعالیٰ وبفضلہٖ غلبہ واقامتِ دین کا یہ قافلہ ان کی وفات کے بعد بھی جانب منزل رواں دواں ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ عصر حاضر کے عظیم داعیٔ قرآن ہی نہیں‘ غلبہ واقامتِ دین کی جدوجہد کے نہایت عظیم داعی اور اس راہ کے بے مثال مجاہد بھی تھے!

زیر نظر کتاب میں والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کے مختصر تعارف کے بعد ان کی کتابِ زندگی کے انہی ابواب کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو غلبہ دین حق کی ایک بے مثال اور پیہم جدوجہد سے عبارت ہیں‘ اس لیے کہ اس کے بغیر ان کا شخصی تعارف ہر اعتبار سے ادھورا اور تشنہ رہے گا۔ ان کی زندگی کا یہ گوشہ ان کے قریبی ساتھیوں اور پاکستان کے تمام دینی تحریکی حلقوں پر تو خوب روشن ہے لیکن عوام الناس کی عظیم اکثریت جو ان کی خدمت قرآنی سے تو متعارف بھی ہے اور اس کی معترف بھی‘ ان کی زندگی کے اس

نہایت اہم گوشے سے قطعی نابلد ہے جو اپنی جگہ نہایت اہم بھی ہے اور درخشاں بھی!

چنانچہ زیرنظر کتاب کے حصہ اوّل میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کے حالاتِ زندگی اور دینی خدمات کے عنوان سے ان کے ایک شاگر دِرشید انجینئر حافظ نوید احمد صاحب کی ایک تحریر شامل ہے جس میں مرحوم کے سفرحیات کے چیدہ چیدہ سنگ ہائے میل کا تذکرہ بھی ہے اور ان کی ہمہ جہت دینی خدمات کا ایک مختصر جائزہ بھی۔ جبکہ حصہ دوم کا عنوان ہے: ''تنظیم اسلامی کا تعارف اور تاریخی پس منظر''۔ اس حوالے سے بانی تنظیمؒ کی بعض نہایت اہم تحریروں کو شامل کتاب کیا گیا ہے جس سے تنظیم کا ہمہ جہت تعارف نکھر کر سامنے آتا ہے۔ حصہ سوم ''تنظیم اسلامی کی فکر اور طریق کار'' کی وضاحت پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی بانی تنظیمؒ کی تحریروں اور خطابات کو بنیاد بنایا گیا ہے جن کے ذریعے نہ صرف تنظیم اسلامی کے تحریکی افکار و تصورات کی عمدگی کے ساتھ وضاحت ہوتی ہے بلکہ غلبہ دین کے لیے عملی طریق کار اور منہج کیا ہو' اس اہم سوال کا واضح جواب بھی صراحت کے ساتھ مل جاتا ہے۔ آج اسلامی دنیا میں بالعموم غلبہ دین کی منزل کے حصول کے دو ہی طریقے رائج ہیں: بیلٹ یا بُلٹ' یعنی الیکشن کی سیاست کا راستہ یا مسلح عسکری جدوجہد۔ بانی تنظیم اسلامیؒ نے منہج انقلاب نبویؐ کو بنیاد بناتے ہوئے دین کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں آج کے دور کے لیے ایک تیسرا راستہ تجویز کیا ہے جو نہ صرف روح دین سے پورے طور پر ہم آہنگ ہے بلکہ روح عصر کے تقاضوں کا بھی عمدگی کے ساتھ احاطہ کرتا ہے اور اب روایتی علماء کے طبقوں میں بھی اس تصور کو پذیرائی مل رہی ہے۔ **فالحمد للّٰہ علٰی ذٰلک!** __________ کتاب کے آخری حصے میں تنظیم کے دینی فکر اور عملی طریق کی مزید وضاحت کے لیے چند مختصر مضامین اور چند دستاویزات شامل کی گئی ہیں جو اپنی جگہ نہایت مفید مطلب ہیں۔

اس کتاب کی تیاری میں راقم کے ایک بزرگ تحریکی ساتھی محترم عبدالرزاق کوڈ اوی صاحب اور ایک نوجوان رفیق کار عزیزم اویس پاشا کی بے پناہ محنت' لگن اور خلوص شامل ہے۔ دعا ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ان دونوں حضرات کو اجرعظیم سے نوازیں ______ اور بانی تنظیم اسلامیؒ کی دینی' قرآنی اور تحریکی مساعی کو شرفِ قبول عطا فرمائیں اور ہمیں حقیقی معنوں میں ان کے لیے صدقہ جاریہ بنادیں۔ آمین!

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!

خاکسار **عاکف سعید** عفی عنہ

امیر تنظیم اسلامی پاکستان

۱۹ رمئی ۲۰۱۱ء بمطابق ۱۵ جمادی الثانیہ ۱۴۳۲ھ

حصہ اوّل

بانیٔ تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے حالاتِ زندگی اور دینی خدمات

حافظ انجینئر نوید احمد حفظہ اللہ

زیرِ نظر کتاب کا یہ حصہ اول دورِ حاضر کے عظیم داعیٔ قرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی کے حالاتِ زندگی اور دینی وتحریکی مساعی کے مختصر تذکرے پر مشتمل ہے۔ صاحبِ مضمون، حافظ انجینئر نوید احمد صاحب، بانیٔ تنظیم اسلامیؒ کے اُن ہونہار اور ممتاز شاگردوں میں شامل ہیں جنہوں نے محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے دروسِ قرآن اور فکرِ دینی سے نہ صرف بھرپور استفادہ کیا بلکہ پیغامِ قرآنی کے فروغ اور دین کے انقلابی تصور کی نشر واشاعت میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔

اس مختصر وجامع مضمون میں حافظ انجینئر نوید احمد صاحب نے بانیٔ محترمؒ کی حیاتِ دنیوی کو چھ بڑے ادوار میں تقسیم کر کے چند اہم اور نمایاں واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ عنوان یعنی ”حالاتِ زندگی اور دینی خدمات“ کم از کم پانچ سو صفحات کے تحقیقی مقالے کا متقاضی ہے۔ سردست قارئین کی سہولت کے لئے محترم ڈاکٹر صاحبؒ کی زندگی کا ایک خاکہ پیش کرنے پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ (مرتب)

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

حالاتِ زندگی اور خدماتِ دینی

حافظ انجینئر نوید احمد

سورۃ النحل آیت ۹۷ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے ﴿مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجۡزِيَنَّهُمۡ اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ﴾ ''جس نے اچھا عمل کیا خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ عمل ایمان واخلاص کے ساتھ ہو تو ہم اُسے ضرور پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور اُس کی نیکیوں کا عمدہ اجر عطا فرمائیں گے''۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ بلاشبہ اِس آیت میں دی جانے والی بشارت کے مصداق تھے اور وہ ایک پاکیزہ زندگی گزار کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ امید ہے کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں ایک مطمئن نفس کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ ایسا نفس جو مطمئن ہوگا کہ میں نے دنیا کی عارضی زندگی کے اوقات اُس کام میں لگائے جن میں یہ اوقات لگنے چاہیے تھے۔ گویا ڈاکٹر صاحبؒ اُن نفوس میں شامل ہوں گے جو ﴿لِسَعۡيِهَا رَاضِيَةٌ﴾ یعنی اپنی محنتوں پر شاداں وفرحاں ہوں گے۔ آیئے ڈاکٹر صاحبؒ کے حالاتِ زندگی اور اُن کی خدماتِ دینی کا ایک اجمالی جائزہ لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبؒ کی حیاتِ باسعادت کو چھ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دور...... ولادت تا شعوری زندگی

۱۹۳۲ء تا ۱۹۴۷ء

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے آباء واجداد کا تعلق یو پی کے ضلع مظفر نگر سے تھا اور وہ وہیں آباد تھے۔ ۱۸۵۷ء میں تحریکِ آزادی میں حصہ لینے کی وجہ سے آپ کے دادا کو انگریز سرکار کی طرف سے عتاب کا اندیشہ تھا لٰہذا وہ اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے مشرقی پنجاب آ گئے۔ ڈاکٹر صاحبؒ کی ولادت ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو مشرقی پنجاب کے ایک قصبہ حصار میں ہوئی۔

ڈاکٹر صاحبؒ بچپن ہی سے انتہائی حساس مزاج کے حامل تھے اور اللہ نے انہیں کم عمری ہی میں شعور کی دولت عطا فرمائی تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں جب اُنہیں علامہ اقبال کے وصال کی خبر ملی تو اُنہوں نے اِسے ایک ذاتی صدمے اور قومی نقصان کے طور پر محسوس کیا جبکہ ان کی عمر صرف چھ برس تھی۔ علامہ اقبال سے دلی لگاؤ کا عالم یہ تھا کہ

محض ۱۰ برس کی عمر میں اُن کی اردو شاعری کے پہلے مجموعہ ''بانگِ درا'' کا مطالعہ مکمل کرلیا۔ اقبال کے اُن اشعار نے آپ کو بہت زیادہ متاثر کیا جن میں امت کے پھر سے عروج کے لیے امید افزا پیغام ہے، مثلاً

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
نوا پیرا ہوا اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

البتہ جوابِ شکوہ کے ایک شعر نے ڈاکٹر صاحبؒ کو ہلا کر رکھ دیا:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اِس شعر سے یہ حقیقت آپ پر واضح ہوگئی کہ امت کے زوال کا اصل سبب قرآن سے دوری ہے اور گویا اوائل عمر ہی سے خدمتِ قرآن کا جذبہ آپ کی سوچ میں سرایت کرگیا۔ اِس کے بعد اسلام کو پھر سے غالب کرنے کا ولولہ آپ کے اندر بڑی شدت سے موجزن ہوگیا جب آپ نے ۱۳ برس کی عمر میں حفیظ جالندھری کا ''شاہنامہ اسلام'' پڑھا جس کا عنوان یہ شعر ہے کہ:

کیا فردوسیِ مرحوم نے ایران کو زندہ
خدا توفیق دے تو میں کروں ایمان کو زندہ

۴۷-۱۹۴۶ء میں جب ڈاکٹر صاحبؒ شعور کی عمر میں داخل ہو رہے تھے تو اُس وقت برصغیر میں مسلمانوں کے بہی خواہ نظریاتی اعتبار سے تین دائروں میں تقسیم تھے۔ ایک سوچ جمعیت علمائے ہند کی تھی کہ ہماری اوّلین ترجیح ہندوستان کو انگریزی استعمار سے آزاد کرانا ہے۔ اِس کے لیے ہمیں ہندوؤں سے اتحاد کرلینا چاہیے۔ اگلے مرحلہ میں ہم شریعتِ اسلامی کے نفاذ کے لیے جدوجہد کریں گے۔ ہندو اگر اس جدوجہد کے مخالف ہوئے تو ہم اُن کا مقابلہ کرلیں گے کیونکہ ہم نے اُن پر کئی سو سال حکومت کی ہے۔ مسلم لیگ کا موقف یہ تھا کہ انگریزی اقتدار کے خاتمہ کے بعد ہم ہندو قوم کے ظلم وستم کا شکار ہوجائیں گے کیونکہ ہمیں بار بار اُن کی مسلم دشمنی اور تعصب کا تجربہ ہو چکا ہے۔ ہمیں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے علیحدہ ریاست کے قیام کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ اِس ریاست میں ہم اسلام کی عادلانہ تعلیمات کے نفاذ سے

لوگوں کو اسلام کے اصولِ حریت واخوت ومساوات کا نمونہ دکھا دیں گے۔ جماعتِ اسلامی کا نظریہ یہ تھا کہ ہمارا مقصد مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ نہیں بلکہ اسلام کی سربلندی ہونا چاہیے۔ نسلی مسلمانوں اور نسلی غیر مسلموں کے سامنے دینِ اسلام کی دعوت اور اِس کے عملی تقاضے رکھے جائیں۔ جو لوگ شعوری طور پر اِس دعوت کو قبول کرلیں اُن ہی کی اسلام کی سربلندی کے لیے جدوجہد نتیجہ خیز ہوگی۔ اسلام غالب ہوگیا تو نہ صرف دنیا میں حقوق و برکات ملیں گی بلکہ آخرت کی تیاری کے لیے بھی سازگار رفضا میسر آئے گی۔

ڈاکٹر صاحبؒ جمعیت علماء ہند میں شامل علماء کرام کے تقویٰ اور خلوص کا اعتراف کرنے کے باوجود اُن کی سوچ سے اتفاق نہیں کرسکے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ انگریزوں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی سے اب ہندو زندگی کے ہر شعبے میں بہت ترقی کرچکے تھے اور اُن کے اندر مسلمانوں سے اپنی ہزار سالہ شکست کا انتقام لینے کی آگ بھڑک رہی تھی۔ علماء کو اِس کا اندازہ نہیں تھا لیکن مسلمان عوام مسلسل مختلف معاملات میں ہندو تعصب کا سامنا کررہے تھے۔ اِسی لیے مسلم عوام نے ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کے موقف کی تائید کی اور اُس کے حق میں بھاری اکثریت سے رائے دی۔

ڈاکٹر صاحبؒ کی رائے میں خالص اصولی اعتبار سے جماعت اسلامی کا نظریہ درست معلوم ہوتا تھا' لیکن انگریز اور ہندو کی دوہری غلامی میں پسے ہوئے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ خطہ زمین کا حصول وقت کی اہم ضرورت تھی جس کے لیے مسلم لیگ سرگرمِ عمل تھی۔ ان کے نزدیک یہ گویا ایک ہی مقصد کے دو مراحل تھے۔ پہلے مسلمانوں کے لیے علیحدہ ملک کے حصول کی کوشش کی جائے اور پھر وہاں اسلام کے غلبہ کے لیے ٹھوس اسلامی انقلابی جدوجہد کی جائے۔ اِسی وجہ سے ڈاکٹر صاحبؒ نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور ایک فعال کردار ادا کیا۔ وہ ضلع حصار میں مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری رہے۔ اِسی حیثیت میں وہ اُس وفد میں شامل تھے جو حصار سے لاہور قائداعظم سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔

۱۹۴۷ میں ڈاکٹر صاحبؒ نے امتیازی نمبروں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ جماعت اسلامی کے دعوتی لٹریچر اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کی کتب ورسائل کا مطالعہ کیا۔ پھر جب ہندوستان کی تقسیم کے وقت فسادات شروع ہوئے تو حفاظتی کیمپوں میں جماعت اسلامی کے رسالہ ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' میں شائع ہونے والے ''تفہیم القرآن'' کے حواشی کا مطالعہ کیا۔ نومبر ۴۷ میں ہجرت کرکے پاکستان تشریف لائے۔ ہجرت کے دوران ۲۰ دن میں ۱۷۰ میل کا سفر پیدل طے کیا۔

دوسرا دور...... فکرِ مودودیؒ کے ساتھ وابستگی

۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۷ء

پاکستان آمد کے بعد محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا۔ اُس وقت آپ جماعت اسلامی کے حلقہ ہمدردان میں شامل ہو گئے۔ اب آپ نے جماعت اسلامی کے لٹریچر کا تفصیلی مطالعہ کیا، جس کے نتیجے میں دین کا انقلابی فکر آپ کے قلب و ذہن میں رچ بس گیا اور غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد ترجیح اول بن گئی۔ اسی دوران جماعت اسلامی کی نفاذِ دستورِ اسلامی مہم میں بھرپور حصہ لیا۔ اِس مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ مارچ ۱۹۴۹ میں قراردادِ مقاصد دستورِ پاکستان میں شامل کر دی گئی۔ اِس کے ذریعہ اصولی اعتبار سے طے کیا گیا کہ پاکستان میں کوئی قانون سازی قرآن و سنت کے منافی نہ ہو گی۔

۱۹۵۰ میں ڈاکٹر صاحبؒ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں داخل ہو گئے اور باقاعدہ اسلامی جمعیت طلبہ میں شمولیت اختیار کر لی۔ جمعیت کے پلیٹ فارم نے آپ کی تحریری، تقریری اور تدریسی صلاحیتوں کو خوب نکھرنے کا موقع فراہم کیا۔ جمعیت میں رہتے ہوئے آپ نے دعوتی مضامین تحریر کیے۔ جمعیت کے ترجمان کے طور پر ایک رسالہ ''عزم'' کے نام سے جاری کیا۔ لاہور کے علاوہ پاکستان کے دیگر شہروں میں جا کر بھی درسِ قرآن دیتے رہے اور کچھ ہی عرصہ میں آپ ایک نمایاں مدرسِ قرآن کے طور پر مشہور ہو گئے۔ جمعیت میں فعال سرگرمیوں کی وجہ سے پہلے ناظمِ لاہور پھر ناظمِ پنجاب اور آخر کار ناظمِ اعلیٰ پاکستان کے منصب تک پہنچے۔

جمعیت میں مختلف مناصب کی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحبؒ نے کئی تربیت گاہوں کا انعقاد کیا۔ اِن تربیت گاہوں میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے دروسِ قرآن سے خوب استفادہ کرتے رہے اور بذاتِ خود جماعت اسلامی کے تحریکی اور فکری لٹریچر کی تدریس کی ذمہ داری ادا کرتے رہے۔

۱۹۵۴ میں جب ڈاکٹر صاحبؒ نے MBBS کر لیا اور طالب علمی کا دور ختم ہوا تو اُنہوں نے جماعت اسلامی کی رکنیت کی درخواست دی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کی زندگی کا ایک دن بھی جماعت کے بغیر بسر ہو۔ نومبر ۱۹۵۴ میں اُن کی درخواست منظور ہوئی اور وہ باقاعدہ جماعت اسلامی کے رکن بن گئے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ ساہیوال منتقل ہو گئے اور وہاں جماعت اسلامی کی ایک ڈسپینسری میں ملازمت اختیار کی۔ اُنہیں کچھ ہی عرصہ میں جماعت اسلامی ساہیوال کا امیر بنا دیا گیا۔

۱۹۵۵ء میں جماعت اسلامی میں ایک بحران کی کیفیت پیدا ہونی شروع ہوئی۔ کئی ارکین جماعت نے محسوس کیا کہ جماعت کی سرگرمیوں کا رخ رفتہ رفتہ بدل گیا ہے۔ اب فردکی اصلاح کے بجائے زیادہ زور نظام حکومت کی اصلاح کی طرف ہے جس سے ارکینِ جماعت کی ذاتی تربیت کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ اِس حوالے سے جب بے

بے چینی زیادہ محسوس ہونے لگی تو امیر جماعت مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا عبد الغفار حسنؒ، مولانا عبد الرحیم اشرفؒ اور شیخ سلطان احمد پر مشتمل ایک جائزہ کمیٹی بنائی۔ کمیٹی کو ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ پورے ملک میں اراکینِ جماعت سے رابطہ کرے اور جو لوگ بے چینی محسوس کر رہے ہیں اُن کے احساسات کی ایک رپورٹ مرتب کرے۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ایک بیان اس کمیٹی کے حوالے کیا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے تجزیہ کیا کہ جماعت اسلامی کا رخ انتخابی سیاست میں شامل ہونے کی وجہ سے بدل گیا ہے۔ پہلے ہماری ترجیح افراد کی ذہن سازی، تطہیر افکار، تزکیہ نفس اور تعمیر سیرت تھی۔ اب ہمارا رُخ حکومت پر تنقید اور نظام حکومت کی اصلاح کی جانب ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے اِس تجزیہ کے لیے بطور دلیل جماعت کے اکابرین کی تحریروں کا ایک تقابلی جائزہ پیش کیا۔ یہ تقابل ۱۹۴۷ سے قبل لکھی جانے والی تحریروں اور پھر ۱۹۴۷ کے بعد کی شائع ہونے والی تحریروں کا تھا۔

ڈاکٹر صاحبؒ کے اختلافی بیان نے جماعت اسلامی کی شوریٰ کے کئی اراکین کو بہت متاثر کیا۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا تاثر یہ تھا کہ اِس نوجوان نے ہمیں ہماری تحریروں کی صورت میں ایک آئینہ دکھا دیا ہے۔ شوریٰ میں شامل اکابر کی اکثریت کی رائے تھی کہ جماعت کو انتخابی سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ مولانا مودودیؒ کو اِس رائے سے اتفاق نہ تھا۔ اُنہوں نے جماعت کی امارت سے مستعفی ہونا چاہا۔ اصلاحی صاحب کا موقف تھا کہ جماعت کے فطری امیر مولانا مودودیؒ ہیں اور جماعت صرف اُن کی امارت ہی میں کام کر سکتی ہے۔ البتہ مولانا مودودیؒ کو شوریٰ کی اکثریت کی رائے پر عمل کرنا چاہیے۔ مولانا مودودیؒ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ امیرِ جماعت، شوریٰ کی اکثریت کی رائے کا پابند ہو۔ اُنہوں نے دلچسپ بات کہی کہ آپ چاہتے ہیں کہ امامت تو میں کروں لیکن رکوع اس وقت کروں جب شوریٰ اللّٰہ اکبر کہے اور رکوع سے اُس وقت اُٹھوں جب شوریٰ سمع اللّٰہ لمن حمدہ کہے۔ امیر کو اراکین کو گننا نہیں تولنا چاہیے۔ جائزہ کمیٹی نے اپنی رپورٹ جماعت اسلامی کی مرکزی شوریٰ کے اجلاس منعقدہ نومبر/ دسمبر ۱۹۵۶ء میں پیش کی۔ اس اجلاس میں مجلس شوریٰ کے تمام فعال اور با اثر ارکان واضح طور پر دو گروہ میں منقسم ہو گئے۔ ایک گروہ کی رائے یہ تھی کہ جماعتِ اسلامی غلط رخ پر بڑھ آئی ہے۔ ۴۷ء میں طریق کار میں جو تبدیلی کی گئی وہ اصولاً اور مصلحتاً دونوں ہی اعتبار سے غلط تھی اور اب خیریت اسی میں ہے کہ فوراً اس سے رجوع کیا جائے اور ''اوپر سے نیچے'' انقلاب لانے کے خواب دیکھنا چھوڑ کر پھر وہی ''نیچے سے اوپر'' کی طرف تبدیلی لانے کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ جبکہ دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ یہ فیصلہ جماعت اسلامی کے حق میں مہلک ثابت ہوگا۔ جماعت کو اسی موجودہ طریقِ کار پر کاربند رہنا چاہئے۔ مولانا مودودیؒ نے جائزہ کمیٹی کی سفارشات سے اتفاق نہیں کیا اور اسی طریق کار کو جاری رکھنے پر اصرار کیا۔ ماچھی گوٹھ کے اجتماع منعقدہ فروری ۱۹۵۷ء میں ارکان جماعت اسلامی کی اکثریت نے مولاناؒ کی رائے پر صاد کیا۔ چنانچہ اس اجتماع کے بعد جماعت

اسلامی اندرونی طور پر شدید اختلاف وانتشار کا شکار ہوگئی جس کے نتیجے میں جماعت کے اکابرین کی قابل ذکر تعداد نے جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ان اکابر کے ساتھ کچھ ''اصاغر'' بھی اسی زمانے میں جماعت سے علیحدہ ہوئے جن میں ایک ڈاکٹر صاحبؒ بھی تھے۔

تیسرا دور...... جماعت اسلامی سے تنظیم اسلامی تک سفر: چند درمیانی مراحل

۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۷ء

جماعتِ اسلامی سے علیحدگی کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ نے جماعت کی ڈسپینسری کی ملازمت ترک کردی اور ساہیوال میں اپنا مطب قائم کرلیا۔ دینی سرگرمیوں کے اعتبار سے ڈاکٹر صاحبؒ نے دروسِ قرآن کے کئی حلقے قائم کیے۔ کالج کی سطح کے طلبہ کے لیے ایک ہاسٹل بنایا تاکہ وہاں مقیم طلبہ کی دین کے وسیع تصور کے اعتبار سے ذہن سازی کی جاسکے۔ جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے اکابرین سے بار بار رابطے کیے تاکہ ایک نئی اجتماعیت قائم کی جاسکے جو جماعت اسلامی کے ابتدائی طریقۂ کار کو پھر سے اختیار کر کے افراد کی ذہن سازی اور عملی تربیت کا اہتمام کرسکے تاکہ غلبہ واقامتِ دین کی راہ ہموار ہوسکے۔ ساہیوال میں قیام کے دوران تبلیغی جماعت کے ساتھ بھی دوسال تک رابطہ رہا۔ ڈاکٹر صاحبؒ شبِ جمعہ کے بیان میں شرکت کرتے اور فجر کے بعد تبلیغی جماعت کے اجتماع میں دروسِ قرآن دیتے رہے۔ البتہ جب محسوس ہوا کہ تبلیغی جماعت کی اصل توجہ صرف افراد کی اصلاح پر ہے۔ وہ اقامتِ دین کے لیے کوئی واضح لائحہ عمل پیش کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اب ڈاکٹر صاحبؒ کا تبلیغی جماعت سے مزید ربط جاری نہ رہ سکا۔ ساہیوال میں ڈاکٹر صاحبؒ کی مذکورہ بالا سرگرمیاں ۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۲ء جاری رہیں۔

۱۹۶۲ء میں ڈاکٹر صاحبؒ کے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کو اپنی تعمیراتی کمپنی قریشی کنسٹرکشن کہ جس میں ڈاکٹر صاحبؒ کے چھوٹے بھائی بھی حصہ دار تھے' میں ڈاکٹر صاحبؒ کی معاونت کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ اُنہوں نے ڈاکٹر صاحبؒ کے سامنے تجویز رکھی تھی کہ آپ کراچی آکر میری کمپنی میں کچھ عرصہ معاونت کریں۔ اِس سے آپ مالی اعتبار سے اِس قابل ہوجائیں گے کہ بعد میں اپنے آپ کو کل وقتی دینی سرگرمیوں کے لیے وقف کرسکیں۔ ڈاکٹر صاحبؒ اُن کی تجویز پر ۱۹۶۲ء میں کراچی تشریف لے آئے۔ مذکورہ کمپنی میں آپ نے جنرل منیجر کی حیثیت سے کام کیا۔

کراچی میں قیام کے دوران ڈاکٹر صاحبؒ کی رہائش کچھ عرصہ کے لیے کورنگی میں دارالعلوم کراچی کے بالکل ساتھ اظہار لمیٹڈ کی فیکٹری میں رہی۔ اِس دوران ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مفتی شفیع صاحبؒ، مفتی رفیع عثمانی صاحب اور مفتی تقی عثمانی صاحب کی قربت بھی حاصل رہی۔ کراچی میں قیام کے دوران ڈاکٹر صاحب نے دروسِ

قرآن دینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ قبل ازیں' کراچی میں کچھ عرصہ ڈاکٹر مسعود عثمانی صاحب کے ساتھ بھی کام کیا تھا جو جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے تھے۔ البتہ مسعود عثمانی صاحب کے مزاج میں بعض دینی تصورات بالخصوص توحید کے ضمن میں حد سے بڑھی ہوئی شدت کہ جس کے باعث بعض جلیل القدر اکابر امت بھی مشرک قرار پائے' ڈاکٹر صاحبؒ کا ان کے ساتھ اشتراکِ عمل زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ قیامِ کراچی کے دوران ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر صاحبؒ نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کا امتحان پاس کیا اور پہلی پوزیشن کے حق دار ٹھہرے۔

۱۹۶۵ء میں قریشی کنسٹرکشن کمپنی کو مالی دشواریوں کی وجہ سے بینک سے سودی قرض لینا پڑا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے اِس پر احتجاج کیا اور کمپنی سے قطع تعلق کر کے والدین سمیت ساہیوال آ گئے۔ والد صاحب اِسی سال وفات پا گئے۔ اب ڈاکٹر صاحبؒ نے شہرِ لاہور کو اپنی دینی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کا فیصلہ کیا۔

لاہور میں ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنی اب تک کی جمع شدہ پونجی سے کرشن نگر میں ایک مکان خریدا۔ اِس مکان میں اپنا مطب قائم کیا۔ مکان کی بالائی منزل پر رہائش اختیار کی اور دعوتی کتب کی اشاعت کے لیے دارالاشاعتِ الاسلامیہ قائم کیا۔ دارالاشاعت سے ڈاکٹر صاحبؒ نے کئی دعوتی کتب شائع کیں اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تفسیر تدبر قرآن کی اشاعت کا بھی آغاز کیا۔ لاہور میں آپ نے دروسِ قرآن کے کئی حلقے قائم کیے اور جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے اکابرین سے رابطوں میں تیزی پیدا کر دی تاکہ احیاءِ اسلام کے لیے ایک نئی اجتماعیت قائم کی جا سکے۔

۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر صاحبؒ نے ماہنامہ میثاق کا دوبارہ اجرا کیا جسے مولانا اصلاحی صاحب نے ۱۹۵۹ء میں جاری کیا تھا لیکن اب وہ مالی دشواریوں کی وجہ سے شائع نہیں ہو رہا تھا۔ اِسی سال ڈاکٹر صاحبؒ نے جماعت اسلامی کے حوالے سے اپنے اختلافی بیان کو ''تحریکِ جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ علمی حلقوں میں ایک طرف تو اِس بیان کی خوب تحسین ہوئی، اہلِ علم نے حیرت کی کہ ڈاکٹر صاحبؒ نے محض ۲۴ برس کی عمر میں جماعتِ اسلامی کے طریقۂ کار میں تبدیلی کا کتنا مدلل تجزیہ کیا اور معین کر کے بتایا کہ جماعت کے طریقۂ کار اور ترجیحات میں تبدیلی کا سبب کیا تھا؟ دوسری طرف علمی حلقوں کی طرف سے اُن حضرات پر تنقید بھی کی گئی جنھوں نے پالیسی کے اختلاف کی بنیاد پر جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد کوئی اجتماعی جدوجہد شروع نہ کی۔ اِس تنقید کا مثبت اثر ان حضرات پر یہ ہوا کہ اُنھوں نے ایک اجتماعیت کے قیام پر سنجیدہ غور و فکر شروع کر دیا۔

چوتھا دور...... احیاءِ اسلام کے لیے منظم اجتماعی جدوجہد کی تیاری

۱۹۶۷ءتا۱۹۷۵ء

ماہنامہ ''میثاق'' کے اجراء اور ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' کی اشاعت کے بعد 1967ء کے اوائل ہی سے محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے ان دیرینہ ساتھیوں سے جو 1957ء میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے تھے' رابطوں کا سلسلہ تیز کر دیا۔ اس معاملے میں مولانا عبدالغفار حسنؒ اور شیخ سلطان احمد صاحب نے بھی بھرپور تعاون کیا' جس کے نتیجے میں جون 1967ء میں رحیم آباد میں چند افراد جمع ہوئے اور ایک نئی جماعت کے قیام کے حوالے سے ایک قرارداد متفقہ طور پر منظور کی گئی اور اسے جولائی 1967ء کے ''میثاق'' میں ''قراردادِ رحیم آباد'' کے نام سے شائع کر دیا گیا۔ اس کاوش کے نتیجے میں 58-1957ء میں جماعت اسلامی سے نکلنے والے کم و بیش چالیس حضرات کا ایک مشاورتی اجلاس مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کی صدارت میں 6-7 ستمبر 1967ء میں رحیم یار خان میں ہوا اور مذکورہ بالا قرارداد کو اس کی توضیحات سمیت معمولی کمی بیشی کے بعد متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا (یہ قرارداد اور اس کی توضیحات اصلاً ڈاکٹر صاحبؒ ہی کے مرتب کردہ تھے) اور اس طرح ایک نئی جماعت کا قیام عمل میں آیا جس کا نام مولانا اصلاحی صاحب نے تنظیم اسلامی تجویز کیا۔

قراردادِ تاسیس کے بعض نکات کی مزید تشریح کے ضمن میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اور مولانا عبدالغفار حسن صاحب نے بہت عمدہ تقاریر کیں۔ طے پایا کہ نئی اجتماعیت کے لیے کنوینر مولانا امین احسن اصلاحی صاحب ہوں گے۔ وہ پورے پاکستان کا دورہ کریں گے اور خدمتِ دین کا جذبہ رکھنے والوں کو نئی اجتماعیت کے مقاصد اور طریقۂ کار سے آگاہ کریں گے۔ بعد ازاں اِس اجتماعیت میں شمولیت کا ارادہ کرنے والوں کا ایک ملک گیر اجتماع ہوگا جس میں اجتماعیت کے قیام کا باقاعدہ اعلان کیا جائے گا۔

حسبِ پروگرام مولانا امین احسن اصلاحی صاحب مختلف شہروں کے دورہ پر نکلے۔ سکھر میں ایک اجتماع عام کے دوران ایک حادثہ پیش آ گیا اور بعض دوسرے حوادث اس کے کچھ عرصے بعد رونما ہو گئے جن کے نتیجے میں ایک جانب تو مولانا اصلاحی کی طبیعت تو بُجھ کر رہ گئی اور دوسری جانب بعض اہم رفقاء کے مزاج میں بھی تکدّر پیدا ہو گیا۔ لہٰذا ''حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے'' کے مصداق ایک اجتماعیت کے قیام کا معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔ بعد ازاں جب ڈاکٹر صاحبؒ نے تنظیم اسلامی قائم کی تو مذکورہ قراردادِ تاسیس ہی کو تنظیمِ اسلامی کی اساس کے طور پر اختیار کیا۔

1967ء ہی میں ڈاکٹر صاحبؒ کے قلم سے وہ معرکۃ الآراء تحریر منصۂ شہود پر آئی جو بعد میں ''اسلام

کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' کے عنوان سے پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوئی۔ اس تحریر میں اولاً انہوں نے واضح فرمایا کہ دورِ حاضر کا اصل المیہ یہ ہے کہ مادہ پرستانہ فکر نے پوری نوع انسانی کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ یورپ میں بے پناہ سائنسی ترقی ہوئی لیکن چونکہ پاپائیت کے اُس غلط تصورِ مذہب کے باعث جو خلافِ عقل وفطرت بھی تھا' عیسائی دنیا نفسِ مذہب سے پہلے ہی شدید متنفر ہو چکی تھی' لہٰذا پوری عیسائی دنیا میں یہ سوچ مستحکم ہوتی چلی گئی کہ مذہب اور اس کے ماورائی تصورات کے مقابلے میں اصل قابل لحاظ اور قابل توجہ چیزیں یہ مادی کائنات اور ہماری مادی ضروریات وتقاضے ہیں جو حقیقی اور واقعی ہیں۔ ——— چنانچہ مادہ پرستانہ سوچ نے مغرب کے فکر وفلسفہ پر بھی فیصلہ کن تسلط حاصل کر لیا۔ نتیجتاً ماورائی حقائق کا وہ علم جو آسمانی وحی کی صورت میں نوع انسانی کو عطا کیا گیا اور جس پر ایمان لانے کا مطالبہ پہلے ہی قدم کے طور پر ''الذین یومنون بالغیب'' کی صورت میں سامنے آتا ہے' مسلمانوں کے ذہنوں میں بھی دھندلانے لگا ہے اور نظر کو خیرہ کرنے والی سائنسی ترقی اور مغربی اقوام کی مرعوبیت نے ایمان ویقین کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے واضح فرمایا کہ مادہ پرستانہ سوچ وفکر کا یہ سیلاب اتنا شدید تھا کہ مسلمان اقوام میں مغرب کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنے والی دینی جماعتیں بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکیں۔

لہٰذا عالمی سطح پر احیاءِ اسلام کے لیے اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن کے ابدی پیغام کے ذریعے تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا کی جائے اور اس کے ساتھ ایک زبردست علمی تحریک ایسی اُٹھے جو اُن کے اپنے الفاظ میں:

> ''جو سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات اور معاشرے کے ذہین ترین عناصر کے فکر ونظر میں انقلاب برپا کر دے ——— اور انہیں مادیت والحاد کے اندھیروں سے نکال کر ایمان ویقین کی روشنی میں لے آئے اور خدا پرستی وخود شناسی کی دولت سے مالا مال کر دے۔ خالص علمی سطح پر اسلامی اعتقادات کے مدلل اثبات اور الحاد و مادہ پرستی کے پُر زور ابطال کے بغیر اس مہم کا سر ہونا محال ہے! ساتھ ہی یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ چونکہ موجودہ دور میں فاصلے بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں اور پوری نوع انسانی ایک کنبے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ لہٰذا علمی سطح کا تعین کسی ایک ملک کے اعتبار سے نہیں بلکہ پوری دنیا کے اعلیٰ ترین معیار کے مطابق کرنا ہوگا۔''

۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر صاحبؒ کے قلم سے ''مسلمانوں پر قرآنِ مجید کے حقوق'' کے موضوع پر ایک اور معرکۃ الآرا تحریر صادر ہوئی' جو ایک اعتبار سے اُس تحریک رجوع الی القرآن کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی جو بعد میں

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور اور اس کے تحت قرآن اکیڈمی کے قیام کی صورت میں موثر طور پر آگے بڑھی۔ بعدازاں، اسی نہج پر خدمتِ قرآنی کے ادارے کراچی، ملتان، فیصل آباد، جھنگ، پشاور، سرگودھا اور اسلام آباد میں بھی قائم ہوئے۔ اِس تحریر کے ذریعہ ڈاکٹر صاحبؒ نے واضح کیا کہ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہی نہیں، نوع انسانی کے لیے اللہ کا عظیم ترین تحفہ بھی ہے۔ یہ کتابِ ہدایت بھی ہے اور منبع ایمان و سرچشمہ یقین بھی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ قرآنِ مجید کے حقوق ادا کر کے اُس کے ساتھ اپنے تعلق کو زندہ اور مضبوط کیا جائے۔ اِس کتاب کے کئی زبانوں میں تراجم ہوئے لاکھوں کی تعداد میں یہ کتاب دنیا کے طول و عرض میں تقسیم ہوئی۔

۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۱ء کا دور ڈاکٹر صاحبؒ کے لئے دو اعتبارات سے بہت مشکلات کا دور تھا۔ جسمانی اعتبار سے تھکا دینے والی محنت اور مالی اعتبار سے شدت کے ساتھ وسائل کی کمی۔ ڈاکٹر صاحبؒ لاہور شہر میں درسِ قرآن کے کئی حلقے جاری رکھے ہوئے تھے۔ دروسِ قرآن کے لیے لاہور کے علاوہ ملتان، رحیم یار خان، صادق آباد، سکھر اور کراچی تک اسفار کا سلسلہ جاری تھا۔ ۱۹۶۷ء سے جامع مسجد خضراء سمن آباد میں اجتماعِ جمعہ سے خطاب کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ ماہانہ میثاق کے لئے مضامین کی تیاری، اُن کی کتابت، طباعت کے لئے کاغذ کی فراہمی اور پھر طباعت کے کام کی نگرانی بذاتِ خود کرتے رہے۔ اپنے مطب کی ضروریات کی فراہمی کا بوجھ بھی آپ کے کاندھوں پر تھا۔ مزید یہ کہ رہائش گاہ مطب کے ساتھ ہونے کی وجہ سے آرام کے وقت بھی مریضوں کی آمد اُن کے لئے مشقت کا باعث تھی۔ اس ہمہ جہت مشقت کا صحت پر منفی اثر ظاہر ہونے لگا اور مسلسل بخار کی سی کیفیت نے ایک دائمی مرض کی صورت اختیار کر لی۔ اور ڈاکٹر صاحب یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ دینی اور تحریکی مساعی اور مطب دونوں کو ساتھ لے کر چلنا ممکن نہیں، اب کسی ایک جانب یکسو ہونے کی ضرورت ہے۔ دوسری طرف مالی صورت حال بھی کچھ حوصلہ افزا نہیں تھی۔ مالی اعتبار سے ڈاکٹر صاحبؒ کی جمع پونجی کا بڑا حصّہ ''دارالاشاعت الاسلامیہ'' میں منجمد ہو گیا تھا۔ ماہنامہ میثاق کی اشاعت کے لیے ہر ماہ کثیر مالی وسائل درکار رہتے تھے۔ لہٰذا مطب یکسر بند کر دینا بھی ظاہر میں ممکن نظر نہ آتا تھا۔

۱۹۷۰ء میں ایک ایسی صورت پیدا ہوگئی کہ ڈاکٹر صاحب کو حجازِ مقدس کا سفر کرنا پڑا۔ پاکستان میں عام انتخابات کا انعقاد ہو رہا تھا۔ جمعیت علماء اسلام کی طرف سے ڈاکٹر صاحبؒ کو صوبائی اسمبلی کے لئے ٹکٹ دینے کی پیشکش ہوئی بلکہ اِس حوالے سے کافی اصرار بھی کیا گیا۔ دوسری طرف جماعت اسلامی کی طرف سے بھی حمایت کی یقین دہانی موصول ہوئی۔ اُنہوں نے عافیت اِسی میں سمجھی کہ کچھ عرصہ کے لیے ملک سے باہر چلے جائیں۔ اُنہوں نے حجازِ مقدس کے سفر کا ارادہ کیا اور پورے چار ماہ حجاز میں رہے۔ وہاں عمرہ اور حج دونوں کی سعادت حاصل کی۔

حج کے بعد حجاز مقدس ہی میں ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنی زندگی کا وہ اہم ترین فیصلہ کیا جس کی ضرورت کا احساس گذشتہ کئی سالوں سے محسوس کر رہے تھے۔ اُنہیں جب یہ احساس ہوا کہ وہ قمری اعتبار سے ۴۰ برس کی عمر کو پہنچ چکے ہیں تو طے کیا کہ اب بقیہ زندگی خالصتاً خدمتِ دین کے لئے وقف کر دی جائے۔ نبی کریم ﷺ پر اسی عمر مبارک میں نبوت کا ظہور ہوا تھا اور آپ ﷺ نے بھی اس کے بعد ایک لمحہ بھی کسبِ معاش کے لئے صرف نہیں کیا تھا لہٰذا اس نبی ﷺ کے طریقے کی اتباع ہو جائے گی۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے جب زندگی دین کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کیا تو اُس وقت اُنہیں معاشی اعتبار سے شدید قلت کا سامنا تھا لیکن اُنہوں نے خالصتاً اللہ پر توکل کرتے ہوئے یہ پر عزیمت فیصلہ کیا۔ وطن واپسی کے بعد اپنا مطب بند کر دیا اور مطب کے تمام اثاثہ جات فروخت کر دیے۔

پیشِ نظر علمی کام کے لیے ڈاکٹر صاحبؒ نے ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ دارالاشاعت الاسلامیہ کے تمام اثاثہ جات انجمن نے خرید لئے جس سے ڈاکٹر صاحبؒ کی مالی مشکلات میں کمی آئی۔ انجمن کی طرف سے ڈاکٹر صاحبؒ کو رہائش فراہم کی گئی۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنا کرشن نگر کا گھر کرائے پر دے دیا جس سے ڈاکٹر صاحبؒ کے گزراوقات کی سبیل پیدا ہو گئی۔ البتہ ڈاکٹر صاحبؒ نے طے کیا کہ ان کی مطبوعات پر اُن کا کوئی حق نہیں ہوگا اور اُن سے ہونے والی تمام آمدنی انجمن کے لئے وقف ہوگی۔ بعد ازاں اِس انجمن کے تحت ۱۹۷۷ء میں ماڈل ٹاؤن لاہور میں قرآن اکیڈمی قائم ہو گئی۔ بلاشبہ یہ اکیڈمی خدمتِ قرآن اور دعوت رجوع الی القرآن کا ایک بہت بڑا مرکز بن گئی جس میں بیش بہا تدریسی، تبلیغی، تصنیفی اور تحقیقی کام جاری و ساری ہیں۔

1972ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے قیام کے ساتھ ہی محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے دستورِ انجمن میں اپنا یہ عزم ظاہر فرما دیا تھا کہ وہ انجمن کے قیام ہی کو اپنی منزل نہیں سمجھتے بلکہ ان کے پیش نظر اصل کام ایک ایسا تحریکی قافلہ تشکیل دینا ہے جو غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے اپنا تن من دھن نچھاور کر سکے۔ 1966ء تا 1974ء حلقہ ہائے دروسِ قرآن کے ذریعے شہر لاہور میں قرآن کے انقلابی پیغام کو پہنچانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پڑھے لکھے طبقات پر مشتمل ایک حلقۂ احباب وجود میں آ گیا جو اپنی تمام دینی ذمہ داریوں اور بالخصوص اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے قلباً و ذہناً آمادہ ہو چکے تھے۔ 1974ء کی قرآنی تربیت گاہ کے اختتام پر ڈاکٹر صاحبؒ نے اعلان کر دیا کہ وہ مذکورہ بالا مقصد کی خاطر ایک اجتماعیت تشکیل دینے کا پختہ ارادہ رکھتے ہیں (ان کا یہ اہم خطاب زیرِ نظر کتاب میں ''عزمِ تنظیم'' کے عنوان سے شامل ہے)۔

پانچواں دور......احیاء اسلام کے لیے منظم اور پیهم اجتماعی جدوجهد

۱۹۷۵ء تا ۲۰۰۲ء

ڈاکٹر صاحبؒ نے ۱۹۷۵ء میں تنظیمِ اسلامی تو قائم کر دی لیکن ابتدا میں اِس جماعت کی امارت کی ذمہ داری قبول نہیں کی بلکہ کنوینر کے طور پر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کی خواہش تھی کہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے اُن بزرگ حضرات کے لئے جو ۱۹۶۷ء میں تنظیم اسلامی کے قیام پر متفق ہوئے تھے، تنظیم کے دروازے کھلے رکھے جائیں۔ اور انہی میں سے کوئی بزرگ اِس جماعت کی امارت کا منصب سنبھالیں۔ ڈھائی سال کے انتظار کے باوجود کوئی بزرگ اِس کے لئے تیار نہ ہوئے۔ بالآخر اگست ۱۹۷۷ء میں تنظیم اسلامی کے تیسرے سالانہ اجتماع کے موقع پر ڈاکٹر صاحبؒ نے تنظیمِ اسلامی کی امارت کی ذمہ داری قبول کی اور طے کیا کہ اِس جماعت کی اساس قرآن وسنت اور سلف صالحین کے آثار سے ماخوذ بیعت سمع وطاعت کے اصول پر ہوگی۔

۱۹۷۷ء میں ڈاکٹر صاحبؒ نے باغ جناح لاہور میں واقع مسجد دارالسلام میں خطابِ جمعہ دینے کا آغاز کیا۔ اِس سے قبل ڈاکٹر صاحبؒ یہ سعادت دس سال سے مسجد خضراء سمن آباد لاہور میں حاصل کر رہے تھے۔ مارچ ۱۹۷۷ء میں جب دینی وسیکولر جماعتوں کے اتحاد یعنی پاکستان قومی اتحاد نے انتخابات میں دھاندلی کے خلاف تحریک چلائی تو اُسے تحریکِ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کا نام دے دیا۔ مسجد خضراء کی انتظامیہ کی خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحبؒ اِس تحریک کی حمایت میں خطابِ جمعہ کے ذریعہ میں بیانات ارشاد فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحبؒ کا موقف تھا کہ یہ تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے لیے نہیں بلکہ فی الحقیقت یہ صرف بھٹو حکومت گرانے کے لیے ہے۔ عوام کو سڑکوں پر لانے کے لیے نظامِ مصطفیٰ ﷺ کا نعرہ اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن مسجد خضراء کی انتظامیہ کی مخالفت کے باعث ڈاکٹر صاحبؒ نے خطابِ جمعہ کی ذمہ داری سے سبکدوشی اختیار کی۔ بعدازاں وقت نے ثابت کیا کہ ڈاکٹر صاحبؒ کا موقف کس قدر برحق تھا۔

۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لگا کر اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اُنہوں نے آتے ہی اسلام کے نفاذ کو اپنی حکومت کا مقصد قرار دیا اور دینی و مذہبی رہنماؤں سے قریبی ربط وضبط رکھا۔ وہ ماضی میں ڈاکٹر صاحبؒ کے دروسِ قرآنی میں شریک ہوتے رہے تھے لہٰذا اُنہوں نے ابتدا میں ڈاکٹر صاحبؒ کے لیے بھی پذیرائی کا خاص اہتمام کیا۔ کئی مقامات پر اعلیٰ فوجی افسران کے سامنے ڈاکٹر صاحبؒ کو سیرت کے موضوع پر خطاب کے مواقع فراہم کیے۔ پاکستان ٹیلی ویژن پر اپریل ۸۱ تا جون ۸۲ الہدیٰ پروگرام ہر ہفتہ باقاعدگی سے نشر ہوتا رہا جس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحبؒ اور ان کی فکر قرآنی کا وسیع پیمانے پر تعارف ہوا۔ جون ۸۲ء میں شرعی پردے کے حوالے

سے ڈاکٹر صاحبؒ کے موقف پر مغرب زدہ خواتین کی طرف سے مظاہرے ہوئے اور الہدیٰ پروگرام بند کر دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے متبادل کے طور پر پاکستان کے کئی بڑے شہروں میں شامِ الہدیٰ کے عنوان سے دروسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا جن سے کثیر تعداد میں لوگوں نے استفادہ کیا۔

قبل ازیں ۱۹۸۱ء میں جنرل ضیاء الحق نے ڈاکٹر صاحبؒ کو شوریٰ میں شمولیت کی دعوت دی تھی۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے انکار کیا۔ البتہ تنظیم اسلامی کے بعض سینئر رفقاء نے ڈاکٹر صاحبؒ سے کہا کہ آپ مسجد کے منبر پر بیٹھ کر مشورے دیتے ہیں اب وہ باقاعدہ اس کے لیے فورم بنا رہے ہیں تو آپ کیوں انکار کر رہے ہیں؟ ڈاکٹر صاحبؒ نے ساتھیوں کی دلیل کو تسلیم کر لیا اور شوریٰ میں شامل ہو گئے۔ ڈھائی ماہ کے دوران ڈاکٹر صاحبؒ کو اندازہ ہو گیا کہ شوریٰ کا ادارہ صرف خانہ پوری کے لیے ہے تاکہ عالمی برادری کو تاثر دیا جائے کہ جنرل ضیاء الحق آمریت کے طور پر نہیں بلکہ مشاورت سے حکومت کا نظام چلا رہے ہیں۔ درحقیقت شوریٰ کا ادارہ صرف زبانی جمع خرچ کے لیے ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحبؒ نے ڈھائی ماہ بعد ہی شوریٰ سے استعفیٰ دے دیا۔

۱۹۸۴ء میں ڈاکٹر صاحبؒ نے رمضان المبارک کے دوران نمازِ تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز کیا۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ قرآن کی ہدایت سے آشنا ہوں۔ مزید یہ کہ رات کا طویل حصہ قرآن کے ساتھ بسر ہو، تاکہ روزِ قیامت قرآن حکیم شرکاء کے حق میں یہ سفارش کر سکے کہ یہ لوگ میری وجہ سے جاگتے رہے۔ اِس پروگرام کو اللہ نے خصوصی شرف قبولیت بخشا اور ہر سال اِس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے یہ پروگرام کرنے کی سعادت لاہور کے علاوہ کراچی، ملتان، ابوظہبی، اور امریکہ میں بھی حاصل کی۔ اب ڈاکٹر صاحبؒ کے کئی شاگرد ہیں جو ہر سال خدمتِ قرآنی کی اِس صورت کو پاکستان کے متعدد شہروں میں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

۱۹۸۴ء کے اواخر میں ڈاکٹر صاحبؒ نے مسجد دارالسلام باغِ جناح لاہو میں ''منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ'' کے موضوع پر خطابات کا آغاز کیا۔ مجموعی طور پر ڈاکٹر صاحبؒ نے اِس موضوع پر گیارہ خطابات ارشاد فرمائے جنہیں بعد میں کتابی صورت میں مرتب کر لیا گیا۔ بلامبالغہ سیرت النبی ﷺ کے عملی وانقلابی پہلو کے اعتبار سے یہ خطابات کا ایک معرکۃ الآراء مجموعہ ہے۔

۱۹۸۵ء میں ڈاکٹر صاحبؒ نے اہلِ پاکستان کو خبردار کیا کہ اُنہیں آزادی حاصل کیے ہوئے ۴۰ برس مکمل ہو رہے ہیں۔ اگر اب بھی اسلام کی طرف پیش قدمی نہ کی تو نہ صرف یہ کہ اسلام کے نام پر بننے والا یہ ملک مسلسل عدمِ استحکام کا شکار رہے گا بلکہ اس کی بقاء و سالمیت بھی شدید خطرات سے دوچار ہو جائے گی۔ اِس حوالے سے اُنہوں نے ایک کتاب ''استحکامِ پاکستان'' تحریر کی اور اس موضوع پر کئی شہروں میں خطابات کیے۔ قوم نے ڈاکٹر صاحبؒ کی دعوت پر لبیک نہ کہی اور اُس کے بعد سے وطن عزیز پاکستان مختلف قسم کے مسائل اور عذابوں سے دوچار

ہےاوراس کی سالمیت معرضِ خطر میں ہے۔

۱۹۸۷ء میں سینیٹر مولانا سمیع الحق اور قاضی عبداللطیف نے ملک میں نفاذِ شریعت کے لیے سینیٹ میں ایک شریعت بل پیش کیا۔ تمام دینی جماعتیں اِس بل کی منظوری کے لیے'' متحدہ شریعت محاذ'' کے نام سے متحد ہوگئیں۔ حکومت کو دھمکی دی گئی کہ اگر ۲۷ رمضان المبارک تک شریعت بل منظور نہ کیا گیا تو دینی جماعتوں کے اراکین اسمبلی وسینیٹ سے استعفیٰ دے دیں گے اور حکومت کے خلاف احتجاجی تحریک چلائیں گے۔ ڈاکٹر صاحبؒ اِس محاذ کی سرگرمیوں میں انتہائی فعال طور پر سرگرم ہوئے۔ کراچی کے ایک جلسہ میں کئی اکابر علماء کی موجودگی میں اُنہوں نے تجویز دی کہ ہمیں منظّم احتجاج کے لیے ایک امیر کی قیادت پر متفق ہونا ہوگا اور اُس سے بیعت سمع و طاعت کرنی ہوگی۔ اُنہوں نے امیر کے لیے مولانا سمیع الحق کے والد مولانا عبدالحقؒ کا نام پیش کیا۔ افسوس کہ دیگر علماء نے شریعت کے نفاذ کی اہمیت پر تو خوب زور دیا لیکن عملی جدوجہد کے لیے ڈاکٹر صاحبؒ کی تجویز کا ذکر تک نہیں کیا۔ لیکن جب ۲۷ رمضان المبارک کی تاریخ آئی تو دینی جماعتوں کے اراکین نے اسمبلی اور سینیٹ سے استعفیٰ دینے سے انکار کر دیا۔ بہر حال دینی جماعتوں کے اِس طرزِ عمل نے ڈاکٹر صاحبؒ کو شدید مایوس کیا اور ڈاکٹر صاحبؒ نے اس روش کو ایک بہت بڑا المیہ قرار دیا۔

مرکزی انجمن کے قیام کے فوراً بعد ۱۹۷۳ء سے انجمن کے تحت سالانہ قرآن کانفرنسوں کے انعقاد کا اہتمام کیا گیا۔ ۸۰ء کی دہائی میں کانفرنس کے لفظ کو بدل کر سالانہ بنیادوں پر محاضراتِ قرآنی کے انعقاد کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ محاضرات اہم دینی موضوعات پر منعقد ہوئے جن میں مختلف مکاتبِ فکر کے جید علماء اور دانشوروں نے گراں قدر خطابات دیے اور مقالے پیش کیے۔ اِن کانفرنسوں اور محاضرات کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مختلف مکاتبِ فکر کے علماء ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے' ایک دوسرے کے خیالات سے مستفید ہوئے اور باہم دوریوں میں کمی آئی۔

۱۹۹۱ء میں امریکہ نے عراق پر حملہ کیا تو ڈاکٹر صاحبؒ نے وطن عزیز کے طول وعرض میں امریکہ کے اصل عزائم یعنی عظیم تر ین اسرائیل کے قیام کو بے نقاب کیا۔ اِسی سال ڈاکٹر صاحبؒ نے تحریکِ خلافت کے قیام کا اعلان کیا۔ آپ نے کئی شہروں میں ''نظامِ خلافت کیا' کیوں اور کیسے؟'' کے موضوع پر خطابات ارشاد فرمائے۔

ستمبر ۱۹۹۲ء میں ڈاکٹر صاحبؒ نے رفقاءِ تنظیمِ اسلامی کو آگاہ کر دیا کہ وہ قمری اعتبار سے مسنون عمر یعنی ۶۳ برس کے ہو چکے ہیں لہٰذا اب دنیا میں مزید رہنے کی خواہش نہیں اور وہ رخصت ہونے کی تیاری شروع کر رہے ہیں۔ انہوں نے بعض املاک جو اُن کے ذاتی نام پر تھیں اقامتِ دین اور دینِ حق ٹرسٹ کے نام منتقل کر دیں تا کہ اُن کے بعد اِن املاک پر اُن کا کوئی وارث ملکیت کا دعویٰ نہ کر سکے اور اِن املاک کا استعمال دینی مقاصد کے لیے ہوتا رہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے یہ واضح کرنے کے لیے کہ اُنہوں نے دین کی خدمت کو مالی منفعت کے حصول کا ذریعہ

نہیں بنایا ایک کتاب ''حسابِ کم وبیش'' کے نام سے تحریر کی۔ اِس کتاب میں اُنہوں نے زندگی بھر ہونے والی آمدنی اور اخراجات کا حساب پیش کر دیا۔ اپنی خدماتِ قرآنی کا جائزہ پیش کرنے کے لیے ایک کتاب دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر تحریر کی۔ تنظیم اسلامی کے امیر کے طور پر اپنے جانشین کا فیصلہ کرنے کے حوالے سے وسیع تر مشاورت کا آغاز کیا۔ مسلسل چھ برس کی مشاورت کے بعد فروری ۱۹۹۸ء میں محترم حافظ عاکف سعید صاحب کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا اعلان کیا۔

ڈاکٹر صاحبؒ نے اگست ۱۹۹۴ء میں حزب التحریر کے تحت عالمی خلافت کانفرنس لندن میں ''منہجِ انقلاب نبوی ﷺ'' کے موضوع پر انگریزی میں خطاب کیا۔ پھر ۱۹۹۵ء اور ۱۹۹۶ء میں امریکہ جا کر انگریزی میں دورۂ ترجمۂ قرآن ریکارڈ کرایا۔

۱۹۹۷ء میں مسلم لیگ کو عام انتخابات میں شاندار کامیابی حاصل ہوئی اور اُسے قومی اسمبلی میں دو تہائی اکثریت حاصل ہوگئی۔ اب ڈاکٹر صاحبؒ نے نواز شریف سے کئی ملاقاتیں کیں اور اُسے دستورِ پاکستان میں شامل کرنے کے لیے ایسی ترامیم مرتب کر کے دیں جن سے وطنِ عزیز میں اسلامی قوانین کا نفاذ ممکن ہو سکے۔ رفقاءِ تنظیمِ اسلامی نے بھی اِس حوالے سے بھرپور مہم چلائی اور لاکھوں کی تعداد میں مجوزہ ترامیم کا خاکہ حکومت کو بذریعہ ڈاک بھیجا۔ بدقسمتی سے مسلم لیگ کی حکومت نے دستور پاکستان کو اسلامی بنانے اور اُس میں سے منافقانہ شقیں خارج کرنے کا بہترین موقع گنوا دیا۔

۱۹۹۸ء میں ڈاکٹر صاحبؒ نے کراچی میں دورۂ ترجمۂ قرآن کیا جس کی وڈیو ریکارڈنگ جدید Digital کیمروں کے ذریعہ کی گئی۔ یہ ریکارڈنگ QTV اور کئی دیگر ٹی وی چینلز پر نشر ہوئی اور ۱۲۶ ممالک میں لاکھوں مسلموں اور غیر مسلموں تک قرآن کا پیغام پہنچا۔

۱۹۹۸ء میں ڈاکٹر صاحبؒ کے دونوں گھٹنوں کا آپریشن ہوا۔ اِسی سال آپ نے دینی جماعتوں کو متحد کرنے کی ایک اور کوشش کی اور متحدہ اسلامی انقلابی محاذ قائم کیا جس کا مطالبہ یہ تھا کہ دستور پاکستان میں شریعت کی بالادستی کو تسلیم کیا جائے۔ کسی بڑی جماعت نے اِس محاذ میں شمولیت اختیار نہیں کی اور یہ کوشش بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہوئی۔ اِس محاذ کے تحت ڈاکٹر صاحبؒ نے کئی بڑے شہروں میں منہجِ انقلاب نبوی ﷺ کے عنوان سے پروگرام کیے اور جید علما کو اِس موضوع پر اظہار خیال کے لیے جمع کیا۔

۲۰۰۲ء میں ڈاکٹر صاحبؒ نے بڑھاپے کے باعث لاحق ہونے والے گوناگوں عوارض اور بعض دیگر عوامل کی وجہ سے تنظیم کی امارت سے سبک دوش ہونے کا فیصلہ کیا اور امارت کی ذمہ داری محترم حافظ عاکف سعید صاحب کو منتقل کر دی۔ مرکزی شوریٰ کے جس اجلاس میں ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے فیصلے کا اعلان کیا اُسی اجلاس میں

سب سے پہلے ڈاکٹر صاحبؒ نے خود حافظ عاکف سعید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔

چھٹا دور...... علمی‘فکری اور تبلیغی کاوشیں

۲۰۰۲ء تا ۲۰۱۰ء

تنظیمِ اسلامی کی امارت سے سبکدوش ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنی ساری توجہ کو علمی‘ فکری اور تبلیغی امور کی طرف مرکوز کر دیا۔ روز نامہ نوائے وقت اور جنگ میں کالم تحریر کرتے رہے‘اہم ملکی اداروں میں لیکچرز دیتے رہے اور ملک کے طول وعرض میں دروسِ قرآن اور مختلف موضوعات پر خطابات ارشاد فرماتے رہے۔ جب بھی کہیں سے بیان کی دعوت آئی ڈاکٹر صاحبؒ نے نہ فاصلوں کی صعوبتوں کو دیکھا‘ نہ راستوں کی دشوار گزاری کو رکاوٹ سمجھا‘ نہ اپنی بیماری اور معذوری کی پروا کی اور نہ ہی اپنی پیرانہ سالی کی کمزوریوں کو عذر بنایا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے ہر ایسی دعوت پر لبیک کہا اور جا کر اللہ کا پیغام پورے جذبہ کے ساتھ پہنچانے کی بھرپور کوشش کی۔

۲۰۰۴ء میں ڈاکٹر صاحبؒ نے مایہ ناز اسکالر ڈاکٹر ذاکر نائیک کی دعوت پر بھارت کا دورہ کیا۔ وہاں بڑے بڑے عوامی اجتماعات سے کئی کئی گھنٹے خطاب کیا اور اسٹوڈیو میں کئی لیکچرز ریکارڈ کرائے۔ Peace ٹی وی چینل پر یہ خطابات اور لیکچرز نشر ہو رہے ہیں۔ اِس کے علاوہ بھی بھارت کے کئی اور شہروں میں بھی خطابات و دروس کی سعادت حاصل کی۔ ۲۰۰۹ء میں جنوبی افریقہ کا دورہ کیا اور وہاں بھی کئی مقامات پر خطابات ارشاد فرمائے۔

مورخہ ۴ تا ۱۹ اپریل ۲۰۱۰ء تنظیمِ اسلامی کے ذمہ داران کا ایک تربیتی کورس قرآن اکیڈمی فیصل آباد میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے اِس کورس کے مجوزہ نصاب کو بہت پسند کیا اور خود بھی اس کورس میں ہمہ وقت شرکت کرنے اور چند اہم مضامین پڑھانے کا ارادہ کیا۔ اُنہوں نے ۴ اور ۵ اپریل کو دو دو گھنٹے کے دورانیے پر مشتمل پروگرام کیے۔ ۵ اپریل کی شام کو ایک پروگرام کے لیے بھی پوری تیاری سے تشریف لائے لیکن بجلی کے نظام کی خرابی کی وجہ سے یہ پروگرام نہ ہو سکا۔ البتہ ڈاکٹر صاحبؒ اِس انتظار میں کہ شاید بجلی بحال ہو جائے تشریف فرما رہے۔ کمر کی تکلیف کے ساتھ طویل وقت تک بیٹھنا ڈاکٹر صاحبؒ کے لیے انتہائی تکلیف دہ ثابت ہوا۔ رات کمر کے درد نے شدت اختیار کر لی اور تکلیف کا یہ عالم تھا کہ ڈاکٹر صاحبؒ نے پوری رات شدید کرب میں جاگ کر گزاری۔ ۶ اپریل کو دن ۱۱ بجے تشریف لائے اور اعلان کیا کہ اب میرے لیے مزید اِس کورس میں وقت دینا ممکن نہیں رہا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ شاید میری یہ آپ سے آخری ملاقات ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے شرکاء کے چند سوالات کے جوابات دیے اور اِس دوران بھی بار بار اُن پر رقت طاری ہوتی رہی۔ آخر میں ایک ساتھی کی درخواست پر دعا کرائی اور دعا کے دوران بلک بلک کر روتے رہے۔ اللہ اُن کی دعائیں قبول فرمائے اور اُن پر اپنے لطف وکرم کی بارش فرمائے۔ آمین!

۱۰/۱۱ اپریل کو فیصل آباد ہی میں تنظیم کی مرکزی شوریٰ کا اجلاس تھا۔ ڈاکٹر صاحبؒ باوجود بیماری اور نقاہت

کے اِس اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور سے تشریف لائے۔ فرمایا کہ شاید آخری بار آپ سے ملاقات کے لیے آیا ہوں۔ یہ پیغام دینے کے لیے آیا ہوں کہ اِس ظالمانہ نظام کے خلاف اپنے جذبات کو سرد نہ ہونے دینا اور دینِ حق کی سربلندی کے لیے اپنی جدوجہد کو تیز سے تیز تر کرنا یعنی ساتھیو! مشعلوں کو تیز کرو۔ حالات بڑی تیزی سے تباہی کی طرف جا رہے ہیں۔ دین' ملت اور ملک کے خیر خواہوں کو چاہیے کہ اپنے زیادہ وسائل' اوقات اور توانائیاں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے وقف کر دیں۔ اللہ ہمیں ڈاکٹر صاحبؒ کی اِس وصیت پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

مورخہ ۱۳ اپریل کو رات ساڑھے گیارہ بجے ڈاکٹر صاحبؒ کے فرزند ڈاکٹر عارف رشید صاحب نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحبؒ کی طبیعت مضمحل ہے اور کمر کی تکلیف شدت اختیار کر گئی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر صاحبؒ کے معالج ملک کے نامور سرجن ڈاکٹر عامر عزیز سے رابطہ کیا گیا، وہ تشریف لائے اور ضروری ادویات تجویز کیں۔ طبیعت مزید مضمحل ہوئی تو ہسپتال لے جانے کا سوچا گیا لیکن ڈاکٹر صاحبؒ نے منع کر دیا۔ رات ڈھائی بجے کے قریب محسوس ہوا کہ ڈاکٹر صاحبؒ کی سانس کی آواز نہیں آ رہی اور وہ بالکل ساکت وساکن ہیں۔ ڈاکٹر عارف رشید صاحب نے تشویش کے عالم میں اپنے والد محترم کا معائنہ کیا تو اُنہیں اندازہ ہوا کہ اللہ کے دین کا خادم اللہ کے پاس پہنچ گیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ اللہ نے اپنے بندے پر کرم کیا اور اُس پر موت کی سختیوں کو آسان فرما دیا۔ اللہ ہم سب کو دین کی خدمت والی زندگی اور راحت والی موت عطا فرمائے۔ آمین!

نمازِ جنازہ اور تدفین

ڈاکٹر صاحب کی وفات کی خبر دنیا بھر کے ٹی وی چینلز نے بریکنگ نیوز کے طور پر نشر کی۔ خبر کا سننا تھا کہ لوگوں کا جمِ غفیر ڈاکٹر صاحب کے آخری دیدار اور ان کے لواحقین کو دلاسا دینے کے لیے قرآن اکیڈمی لاہور کی طرف لپکا۔ ڈاکٹر صاحب کا چہرہ دیکھنے والے ہر شخص کا یہ تأثر تھا کہ ڈاکٹر صاحب تو گویا انتہائی پرسکون انداز میں سو رہے ہیں۔

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید صاحب نے دیگر لواحقین اور قریبی رفقاء کے ساتھ مشورہ کے بعد طے کیا کہ نمازِ جنازہ بعد نمازِ عصر سنٹرل پارک ماڈل ٹاؤن میں ادا کی جائے گی۔ لوگوں کا جمِ غفیر چار بجے شام ہی سے پارک کے ہر گیٹ سے آ رہا تھا اور شدید گرمی کے باوجود لوگ انتہائی اطمینان سے صفوں پر بیٹھے نماز عصر کے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ بعض اہم حکومتی شخصیات کی آمد کے پیش نظر سکیورٹی کے بہترین انتظامات کیے گئے تھے ماڈل ٹاؤن پارک کے ہر گیٹ پر واک تھرو گیٹ نصب اور پولیس کی بھاری نفری تعینات تھی اور جنازہ کے روٹ پر جگہ جگہ پولیس کا پہرہ تھا، تاکہ کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہ ہونے پائے۔ تاہم ہجوم کے سیل رواں

کے باعث پارک کی طرف آنے والی تمام سڑکوں پر ٹریفک جام تھا۔ لوگ اپنی گاڑیاں سڑک پر چھوڑ کر جنازے میں شرکت کی خاطر پارک کی طرف دوڑتے نظر آ رہے تھے۔ دوسری طرف الیکٹرانک میڈیا کے نمائندوں کی کثیر تعداد اپنی DSNG vans کے ہمراہ جنازے کے منظر کو لائیو ٹیلی کاسٹ کرنے کے لیے موجود تھی۔ اسی طرح پرنٹ میڈیا کے نمائندے بھی اپنے اپنے اخبار کی رپورٹنگ اور فوٹو گرافر کوریج کے لیے جمع تھے۔

ٹھیک پانچ بجے جونہی ایمبولینس ڈاکٹر صاحب کی میت کو لے کر پارک کے گیٹ سے داخل ہوئی تو نظم و ضبط کے تمام بند ٹوٹ گئے اور عوام کا جم غفیر زار و قطار روتا ہوا اس خادم قرآن کی میت کو کندھا دینے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے ایمبولینس کی طرف لپکا۔ رفقاء تنظیم اسلامی اور سکیورٹی پر مامور پولیس نے جان توڑ کوشش کے بعد میت کو نماز جنازہ کے لیے مقررہ جگہ پر پہنچایا۔ حافظ عاکف سعید صاحب نے نماز عصر کی امامت فرمائی اور اس کے بعد اپنے مختصر خطاب میں لوگوں کو صبر کی تلقین اور محترم ڈاکٹر صاحب کے مشن کو جاری رکھنے کا عزم دہرایا۔ تقریباً ساڑھے پانچ بجے حافظ صاحب نے محترم ڈاکٹر صاحبؒ کی نماز جنازہ پڑھائی۔

نمازِ جنازہ کے وقت ہر آنکھ اشکبار اور ہر دل بجھا ہوا تھا۔ اس موقع پر ماڈل ٹاؤن پارک اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود تنگی داماں کا منظر پیش کر رہا تھا۔ حاضرین کی تعداد کا شمار ممکن نہ تھا۔ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے حضرات کا جم غفیر موجود تھا۔ جنازہ میں شرکت کرنے والے نمایاں لوگوں میں مولانا سمیع الحق، حافظ حسین احمد، مولانا رفیع عثمانی، مولانا فضل الرحیم، مولانا زاہد الراشدی، حافظ عبد الرحمٰن مکی، سید منور حسن، قاضی حسین احمد، لیاقت بلوچ، حافظ ادریس احمد، فرید احمد پراچہ، حافظ محمد سعید، حنیف جالندھری، مولانا عبد الرؤف، مولانا طاہر اشرفی، مجیب الرحمٰن انقلابی، سہیل ضیاء بٹ، ذوالفقار کھوسہ، میاں عامر محمود، مجید نظامی، مجیب الرحمٰن شامی، انجینئر سلیم اللہ، اوریا مقبول جان، چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ خواجہ شریف، حافظ زبیر احمد ظہیر، سیف اللہ منصور، یحییٰ مجاہد مسلم لیگ (ن) کے ارکان اسمبلی نصیر احمد بھٹہ، حافظ نعمان، صوبائی وزراء چودھری عبد الغفور اور علی احمد اولکھ شامل تھے۔

طے یہ کیا گیا تھا کہ نماز جنازہ کے بعد میت آخری دیدار کے لیے رکھی جائے گی، لیکن عوامی جذبات ہمارے کارکنوں اور سکیورٹی حکام کے کنٹرول سے باہر ہو رہے تھے۔ کوئی چارپائی کو چوم رہا تھا تو کوئی چہرہ دیکھنے کو ترس رہا تھا۔ دھکم پیل کے سبب بزرگ حضرات گر رہے تھے۔ بے انتہا رش اور جذبات سے مغلوب بے قابو ہجوم کی وجہ سے میت کی بے حرمتی کے خدشے کے پیش نظر نہ چاہتے ہوئے بھی ہنگامی طور پر یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اس وقت یہاں آخری دیدار نہ کروایا جائے۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحب کے جسد خاکی کو بڑی مشکل سے ایمبولینس تک پہنچایا گیا، اور تدفین کے لیے سفر آخرت شروع ہوا۔ قبرستان چونکہ کچھ فاصلے پر تھا، لہٰذا یہ سفر بھی بہت بڑے جلوس کا منظر پیش کر رہا تھا۔ آذانِ مغرب سے ذرا پہلے قرآن اکیڈمی کے قریب قبرستان میں

آہوں اور سسکیوں کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو لحد میں اتارا گیا۔ قبر کو دیکھ کر کیفیت یہ ہو رہی تھی کہ ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟

اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ وحاسبہ حساباً یسیرًا

''ڈاکٹر اسرار احمدؒ ایک عہد ساز شخصیت''

مورخہ 14 اپریل 2010 کو عظیم مفکر قرآن اور بے لوث خادمِ دین ڈاکٹر اسرار احمد اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اِن سطور کے راقم کو تقریباً 25 برس محترم ڈاکٹر صاحب کی رفاقت کی سعادت ملی۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب کے دروس قرآن اور خطابات سے بھرپور استفادہ کا ہی نہیں بلکہ اُن کی عملی زندگی کے معمولات کو انتہائی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ بلاشبہ دورِ حاضر میں محترم ڈاکٹر صاحب ایک بے مثال شخصیت کے حامل تھے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کے جن اوصافِ حمیدہ نے راقم کو بہت متاثر کیا ان میں سے بعض کا تذکرہ قارئین کے پیش خدمت ہے:

ڈاکٹر صاحب کی سب سے بڑی خوبی اُن کے قول وفعل کی مطابقت تھی۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اُن کے جملہ متعلقین نے اُن کے ساتھ بیعت سمع وطاعت کا عہد و پیمان کیا۔ ان متعلقین میں اُن کی اہلیہ، چاروں بیٹے، پانچوں بیٹیاں، پانچوں داماد، چاروں بھائی اور دیگر کئی اقارب شامل ہیں۔ شرعی پردہ، رزقِ حلال، دنیا سے کم سے کم تعلق، سادگی، دین کے لیے مال وجان کی قربانی کا جو درس اُنہوں نے لوگوں کو دیا اس پر سب سے پہلے خود عمل پیرا ہونے کی مثال پیش کی۔

ڈاکٹر صاحب مزاجاً انتہائی بے باک انسان تھے اور دوٹوک بات کہنے سے ذرا نہیں جھجکتے تھے۔ حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کلمۂ حق کہا۔ سیکولر سوچ رکھنے والے دانشوروں کے سامنے بڑے اعتماد سے اسلام کو بحیثیتِ دین یعنی مکمل نظامِ زندگی کے طور پر پیش کیا، اپنے مسلک کو ہی کل اسلام سمجھنے والوں کی مضبوط دلائل سے اصلاح کی اور نیکی کا محدود تصور رکھنے والوں کی واشگاف الفاظ میں تردید کی۔

ڈاکٹر صاحب دنیا میں واقعتاً ((**کن فی الدنیا کانك غریب اوعابر سبیل**)) یعنی ''دنیا میں ایسے رہو جیسے اجنبی ہو یا راستہ عبور کرنے والے مسافر'' کے مصداق مسافر کی طرح رہے۔ کوئی اثاثہ جات، جائدادیں، بینک بیلنس نہیں بنایا۔ عقیدت مندوں نے جو عمارات ہدیہ کی تھیں سب کی سب دینِ حق ٹرسٹ کے نام منتقل

کر دیں۔عرب شیوخ سے مالی تعاون کی پیشکش کو قبول نہیں کیا، ملکی حکمرانوں کے عطیات لینے سے انکار کر دیا اور عوام سے مالی تعاون کی اپیل سے حتی المقدور اجتناب کیا۔ وزارت اور اہم ملکی مناصب قبول کرنے سے معذرت کی۔ یہی وجہ ہے کہ حکمرانوں اور عوام کے سامنے حق بات بیان کرنے میں کوئی رعایت یا لحاظ کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ جو اصول طے کیا اس پر سختی سے عمل درآمد کیا اور کسی مصلحت کی خاطر اصولوں پر سودے بازی نہ کی۔

محترم ڈاکٹر صاحب کی فکر کی ایک اہم خوبی توازن و اعتدال تھا۔شریعت اور طریقت کے درمیان حسین امتزاج پیدا کیا۔تصوف کی لذت و چاشنی ان کے خطبات میں اہل باطن نے محسوس کی لیکن دین کے ظاہری احکامات پر عمل کی دعوت بھی پوری شدت سے جاری وساری رکھی۔ عقائد واعمال کے اعتبار سے اسلاف سے مضبوط تعلق استوار رکھنے کو فتنوں سے بچنے کا محفوظ راستہ قرار دیا لیکن اندھی اور جامد تقلید پر بھی آواز اٹھاتے رہے۔تحریکی کاموں میں ہر دم بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی ترغیب دی لیکن ساتھ ہی ساتھ ذاتی اصلاح کی اہمیت کو بھی نمایاں کیا۔ خدمتِ دین کے لیے جدید ذرائع ابلاغ کو بھرپور طریقہ سے استعمال کیا لیکن دین کی روایتی اقدار کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھا۔ انتہائی ٹھوس علمی کام کا خزانہ تحریر وتقریر کی صورت میں پیش کیا لیکن عملی اعتبار سے بھی ذاتی و اجتماعی دونوں سطحوں پر سرگرم عمل نظر آئے۔تحریک علی گڑھ کے قومی احسانات کا اعتراف بھی کیا لیکن دین کے ماورائی تصورات کے حوالے سے اُس کی عقلی موشگافیوں کے بودے پن کو بھی بے نقاب کیا۔تحریک دیو بند کی حفاظت دین کے حوالے سے خدمات کی خوب تحسین کی لیکن جدید علوم سے کنارہ کشی کی نشاندہی بھی کی۔ انتخابی سیاست کے راستے کو اقامتِ دین کی منزل کے حصول کے حوالے سے غیر مفید قرار دیا لیکن ایسے غلو کا شکار نہیں ہوئے کہ اُسے حرامِ مطلق کے درجہ پر پہنچا دیں۔

ڈاکٹر صاحب کا سب سے نمایاں کارنامہ امت کو قرآن مجید کے فہم و تدبر کی طرف راغب کرنا ہے۔ قرآنِ کریم کی علمی اعتبار سے عظمت کو بھی خوب واضح کیا اور عوامی دروسِ قرآن کے ذریعہ عام لوگوں کے لیے بھی فہمِ قرآن کی راہیں کھولیں۔قرآن کریم اس انداز سے بیان کیا کہ لوگوں کو اس میں اپنے مسائل کا حل دکھائی دینے لگا۔ حالاتِ حاضرہ کا تجزیہ قرآن حکیم کی روشنی میں ایسے مدلل اسلوب میں کیا کہ آیاتِ قرآنی انہیں حالات حاضرہ کے حوالے سے اترتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ رمضان المبارک میں نمازِ تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کے مبارک سلسلے کو امت کے لیے پورے قرآن کریم کی سالانہ تذکیر کا ذریعہ بنایا۔ قرآن اکیڈمیوں کے ذریعہ ایسے مدرسین تیار کر دیے جو خدمتِ قرآن کے چراغ سے چراغ جلاتے رہیں گے۔کتب اور CDs کے ذریعہ علومِ قرآنی کی نشر واشاعت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب بلاشبہ دورِ حاضر میں شارح کلامِ اقبال بھی تھے۔ڈاکٹر صاحب نے اقبال کے کلام اور فکر کو سمجھا اور بڑے عام فہم لیکن تحریکی انداز میں لوگوں کو سمجھایا۔اقبال جو ولولۂ تازہ دلوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے، ڈاکٹر صاحب اِس کا ایک بہت مؤثر ذریعہ بن گئے۔خاص طور پر اقبال کی ترجمان القرآن ہونے کی حیثیت کو نمایاں کر کے ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف اقبال کی قدر و منزلت سے قوم کو آگاہ کیا بلکہ قرآنِ کریم کی اُس عظمت کو بھی آشکارا کیا جس تک اقبال کی رسائی ہوئی تھی۔

بلاشبہ حالاتِ حاضرہ کی نبض پر ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ تھا۔اُن کے سیاسی تجزیے نہ صرف فکر انگیز بلکہ بڑے صائب ہوتے تھے۔مسائل کا بھرپور تجزیہ کرنا اور اِن کا قابلِ عمل حل تجویز کرنا ڈاکٹر صاحب کی فہم و فراست کی دلیل تھا۔اربابِ اقتدار کی بدقسمتی ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے تجزیوں سے استفادہ نہ کیا اور وطنِ عزیز کو شدید خطرات سے دوچار کر دیا۔مثلاً 1971ء میں ڈاکٹر صاحب نے تجویز دی تھی کہ اپنے بنگالی بھائیوں کو زبردستی اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش سودمند نہ ہوگی۔بہتر ہے کہ ریفرنڈم کے ذریعہ ان کی رائے معلوم کر لی جائے۔اگر وہ ساتھ رہنا نہیں چاہتے تو خوبصورتی سے علیحدہ کر دیں۔اربابِ اختیار نے یہ مشورہ نہ مانا اور طاقت کا اندھادھند استعمال کیا۔نتیجتاً ملک دولخت ہوا اور شکست کی ذلت ہمارے لیے کلنک کا ٹیکہ بن گئی۔

ڈاکٹر صاحب نے اقامتِ دین کی جدوجہد کے مشن کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ اس میں جوش و جذبہ کی ایک نئی روح پھونک دی۔تجدید و احیاءِ دین کی مساعی کو نہ صرف بڑی خوبصورتی سے واضح کیا بلکہ اِس حوالے سے ہونے والے کام کو برصغیر میں گزشتہ چار سو سال سے ہونے والی تجدیدی محنتوں کا بارِ امانت قرار دیا اور امت کو اس امانت کا حق ادا کرنے کے لیے بڑے جوش و ولولہ سے متوجہ کیا۔

ڈاکٹر صاحب کے لیے ہرگز مشکل نہ تھا کہ وہ اپنی میڈیکل کی تعلیم، ذہانت اور بھرپور قوتِ کار کی صلاحیت کی بنیاد پر خوب مال و دولت جمع کر لیتے۔لیکن ڈاکٹر صاحب نے ﴿ھو خیر مما یجمعون﴾ کے مصداق خدمتِ قرآنی کی دولت جمع کی جو دنیوی ساز و سامان سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے۔ڈاکٹر صاحب کے دروس و خطابات کے ذریعہ لاکھوں افراد تک قرآن کا پیغام پہنچا، ہزاروں افراد کی زندگیوں کی اصلاح ہوئی اور سیکڑوں مبلغین قرآن تیار ہوئے۔صدقۂ جاریہ کی یہ کمائی بلاشبہ انتہائی قیمتی اثاثہ ہے جو ڈاکٹر صاحب اس دنیا میں کما کر چلے گئے۔اللہ ہمیں بھی اُن کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے قرآن کا سچا خادم اور دین اسلام کا سچا مجاہد بننے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

حرفِ آخر:

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحبؒ پر بے مثال عنایات کی بارش کر دی۔ ڈاکٹر صاحبؒ کی شخصیت قول و فعل میں مطابقت، اصولوں پر سختی سے عمل، کلمہ حق کہنے کی زبردست جراءت، خودداری، قناعت، سادگی، استقامت، بے پناہ قوتِ عمل اور نیک مقاصد کے ساتھ سچی لگن سے آراستہ تھی۔ اُن کی زندگی پاکیزگی کا ایک انمول نمونہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک قرآن و دین کی خدمت کی لائقِ تحسین داستان بنے رہے۔ زندگی کی آخری ساعتوں تک اللہ کی کتاب کی تبلیغ اور اللہ کے دین کے غلبہ کی جدوجہد ایک بہت بڑی سعادت ہے جو ڈاکٹر صاحبؒ کے حصہ میں آئی۔ ایسی زندگی بلاشبہ حافظ شیرازی کے اِس شعر کا مصداق نظر آتی ہے کہ:

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

''میں نے اپنی زندگی کا کل سرمایہ محبوب کی راہ میں نچھاور کر دیا۔ میں خوش ہوں اپنی بیتی ہوئی زندگی سے کہ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا''۔

اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اُس نے ہمیں ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے ذریعہ خدمتِ قرآن اور غلبہ دین کے عظیم مشن کا شعور دیا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا احسن طریقہ یہ ہے کہ اُن کے مشن کو نہ صرف زندہ و جاری رکھا جائے بلکہ تیز سے تیز تر کیا جائے اور اُن کے لئے صدقۂ جاریہ بننے کی سعادت حاصل کی جائے۔ اس کے برعکس اگر ہم نے ڈاکٹر صاحب کے مشن سے پہلوتہی کی تو یہ نہ صرف ایک درجہ میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بے وفائی ہوگی بلکہ اُن کے ذریعہ عطا ہونے والے اللہ کے احسان کی بھی ناقدری و ناشکری ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس محرومی سے محفوظ فرمائے۔ آمین!

حصّہ دوم

تنظیمِ اسلامی کا تعارف اور تاریخی پس منظر

بانیٔ تنظیم کی تحریروں کے آئینے میں

زیرِ نظر کتاب کا حصہ دوم چار ابواب پر مشتمل ہے:

بابِ اوّل — اُمّتِ مُسلِمہ کے عروج و زوال کے دور اور موجودہ احیائی مساعی کا اجمالی جائزہ

بابِ دوم — عزمِ تنظیم

بابِ سوم — قراردادِ تاسیس مع توضیحات و تقاریظ

بابِ چہارم — روداد منتقلیٔ امارت

باب اوّل

اُمّتِ مسلمہ کے عروج و زوال کے ادوار
اور
موجودہ احیائی مساعی کا اجمالی جائزہ

کتاب کے حصہ دوم کا یہ پہلا باب امت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کے ایک مختصر جائزے پر مشتمل ہے جو نہایت جامع بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ نیز چودھویں صدی ہجری کی احیائی مساعی کا ایک جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے جس کے ذریعے تنظیم کے قیام کے پس منظر کو سمجھنے کو بھی مدد ملتی ہے اور اس احیائی عمل کے ساتھ تنظیم اسلامی کا ربط اور تسلسل بھی واضح ہوتا ہے۔

بانی محترمؒ کی یہ گراں قدر تحریر ماضی میں ''تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر'' کے عنوان سے کتابچے کی صورت میں شائع ہوتی رہی۔ بانی محترمؒ نے ۱۹۷۴ء میں شائع شدہ اس تحریر کے لئے ۱۹۹۱ء میں ایک تقدیم بھی سپردِ قلم فرمائی تھی جو خود اپنی جگہ نہایت افادیت کی حامل ہے۔ اس تقدیم کے ساتھ ساتھ موضوع کی مناسبت سے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے ایک جامع مضمون پر مشتمل ضمیمہ بھی اسی باب کا حصہ بنا کر ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔ یہ بات نوٹ فرمالیں کہ اس تحریر سے متعلق حواشی خود بانی محترمؒ کے تحریر کردہ ہیں، سوائے اُن حواشی کے جن کے اختتام پر قوسین میں مرتب لکھا ہوا ہے۔ (مرتب)

تقدیم برائے باب اول

(از قلم: بانی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ)

پیش نظر فصل میری جس تحریر پر مشتمل ہے وہ ۱۹۷۴ء کے اواخر میں ماہ رمضانِ مبارک کے دوران بحالت اعتکاف سپرد قلم ہوئی تھی اور اولاً ماہنامہ 'میثاق' کی اکتوبر ونومبر ۷۴ء کی مشترک اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔

اس سے چند ماہ قبل ۲۱ رجولائی کو راقم ایک مفصل تقریر میں 'تنظیم اسلامی' کے قیام یا صحیح تر الفاظ میں احیاء کا اعلان کر چکا تھا۔ اس تقریر کا اکثر حصہ 'میثاق' بابت ستمبر ۷۴ء میں شائع ہو چکا تھا اور بقیہ مذکورہ بالا مشترک اشاعت میں شامل تھا۔

اس تحریر کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس امر کی وضاحت کی جائے کہ بیسویں صدی عیسوی کے وسط اور چودھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں امت مسلمہ کے طول وعرض میں جو 'ہمہ جہتی احیائی عمل' جاری ہوا اور از مشرقِ بعید تا مغربِ اقصیٰ مختلف تحریکوں اور تنظیموں کے ذریعے جو تجدیدی مساعی منظر عام پر آئیں، ذاتی طور پر راقم الحروف اور اجتماعی حیثیت میں تنظیم اسلامی کی جدوجہد ان کے کس گوشے سے تعلق رکھتی ہے۔ (چنانچہ اس تحریر کا بڑا حصہ اسی موضوع سے متعلق ہے۔) لیکن چونکہ بفحوائے الفاظِ قرآنی ﴿كُنتُمْ اَمْوَاتاً فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ﴾ (البقرہ ۲۸) 'احیاء' سے قبل کسی موت کا تصور لازمی ولابدی ہے، لہٰذا ذہن امت کے عروج وزوال کی تاریخ کی جانب منتقل ہوا۔ اور اسی اثناء میں کہ راقم امت کی تاریخ کے نشیب وفراز میں غلطاں و پیچاں تھا، اچانک ایک حدیثِ نبویؐ ذہن میں بجلی کے مانند کوند گئی جس نے بعینہٖ وہی کام کیا جو ایک بہت بڑے خزانے کو کھولنے کے لئے ایک چھوٹی سی کنجی کرتی ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کے قول مبارک "لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِى اِسْرَائِيْلَ حَذْ وَالنَّعْلِ بِالنَّعْلِ ....." کی عظیم کلید نے مجھ پر امتِ مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کے مختلف ادوار کے علم وفہم کا وہ خزانہ منکشف فرما دیا جو ؎ "خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں۔ گفتہ آید در حدیث دیگراں!" کے مصداق سابقہ امتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی دو ہزار سالہ تاریخ کے مختلف ادوار کے تذکرہ پر مشتمل سورۂ بنی اسرائیل کی چند ابتدائی آیات میں مضمر تھا! فَلَهُ الْحَمْدُ وَالْمِنَّه

محض تَحْدِيثاً لِّلنِّعْمَه عرض ہے کہ اس سے ذاتی طور پر راقم کے سرمایۂ ایمان ویقین میں تین

اعتبارات سے گراں قدر اضافہ ہوا، چنانچہ ایک جانب میرے قلب پر عظمتِ قرآن کا نقش مزید گہرا ہوا، خصوصاً اس پہلو سے جس کا ذکر نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظ مبارکہ میں فرمایا ہے کہ فِيهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ (ترمذیؒ ودارمیؒ عن علیؓ)۔ دوسری جانب حدیث نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی عظمت آشکارا ہوئی کہ علم وحکمت کے کیسے کیسے قیمتی ہیرے اور خوبصورت موتی اس میں موجود ہیں، اور تیسری جانب قرآن اور حدیث کے مابین ربط کی اہمیت کا اندازہ ہوا کہ دین کے عملی پہلوؤں یعنی احکام شریعت کے ضمن میں تو کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کا باہمی لزوم واضح اور مسلم ہے ہی، قرآن حکیم کے علم وحکمت اور ہدایت ومعرفت کے خزانوں کے لئے بھی نبی اکرم ﷺ کے چھوٹے چھوٹے فرمودات کلید کی حیثیت رکھتے ہیں!

بہرحال ان گہرے تاثرات کے ساتھ جب قلم حرکت میں آیا تو ایک سیلاب کی سی 'آمد' کے ساتھ یہ تحریر صادر ہوگئی جس پر دوسروں نے جو خراجِ تحسین ادا کیا اس سے قطع نظر، اب سولہ سال [1] بعد 'نظرِ ثانی' کی غرض سے جب خود میں نے اسے پڑھا تو حیران رہ گیا کہ ع ''ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی''۔ اس لئے کہ اس کے ذریعے امت مسلمہ کی چودہ صد سالہ تاریخ کے وہ جملہ اہم نقوش غایتِ اختصار کے ساتھ کل بارہ صفحات میں ثبت ہوگئے ہیں، جن کا علم تجدید واحیائے دین کی خواہش رکھنے والے ہر شخص کے لئے تو لازمی ولابدی ہے ہی، عام مسلمانوں کے لئے بھی بہت مفید ہے۔

راقم کی اپنی تحریر میں امت مسلمہ کی تاریخ کے مختلف ادوار کے سلسلے میں تاریخ بنی اسرائیل کے حوالے محض ضمناً آئے ہیں، لیکن اب اس کی افادیت میں اضافے کی غرض سے تاریخ بنی اسرائیل کا ایک خاکہ بھی بطور ضمیمہ شامل کر دیا گیا ہے۔ اس ضمیمے کے صرف عنوانات راقم نے قائم کئے ہیں، باقی سارا مواد سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ان تفسیری حواشی سے ماخوذ ہے جو ''تفہیم القرآن'' جلد دوم میں سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع کے ذیل میں درج ہیں۔ [2]

ان دونوں کے تقابلی مطالعے سے، ان شاء اللہ العزیز، علم وحکمت کے ہر طالب پر کسی مسلمان امت کی تشکیل وتأسیس کی اصل بنیاد اور اس کے عروج وزوال کے اسباب وعلل ایسے اہم مسائل کے ضمن میں فلسفۂ تاریخ وعمرانیات کے فہم اور تفقہ کا دروازہ کھل جائے گا۔ اس سلسلہ میں چند اضافی نکات کی جانب

---

(۱) دراصل یہ تقدیم بانی محترمؒ نے ۱۹۹۱ء میں ایک اشاعت کے موقع پر تحریر فرمائی تھی۔ (مرتب)

(۲) مختصر ترین الفاظ میں یہ مضمون راقم کی تالیف ''استحکامِ پاکستان'' کے باب نہم میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

اجمالی اشارہ سطورِ ذیل میں کیا جا رہا ہے، **فافھموا وتدبروا!**

۱۔ امت مسلمہ کی تشکیل کی اساس کتاب الٰہی ہے، یہی وجہ ہے کہ تاریخ بنی اسرائیل کا آغاز تورات کے حوالے سے کیا گیا، اور بحیثیت امت مسلمہ ان کے دور کے خاتمے اور نئی امت مسلمہ یعنی امت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دور کے آغاز کا اعلان قرآن کے حوالے سے کیا گیا۔

۲۔ امت محمدؐ دونوں قبلوں کی متولی بنا دی گئی۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل کا آغاز آنحضور ﷺ کے سفرِ معراج کے پہلے اور زمینی حصے یعنی مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک کے ذکر سے کیا گیا۔

۳۔ کتاب اللہ کی تعلیم کا لُبِّ لباب توحید ہے، اور توحید کا خلاصہ یہ ہے کہ توکل اللہ کے سوا اور کسی ہستی یا چیز پر نہ رہے! ﴿اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِیْلًا﴾

۴۔ امت محمد ﷺ کے عروج اول کا دور حیاتِ نبویؐ ہی میں شروع ہو گیا تھا اس لئے کہ اللہ نے آپؐ کے دستِ مبارک ہی سے انقلاب کی تکمیل کرادی تھی۔ جب کہ سابقہ امت کا عروجِ اول اپنے رسول یعنی حضرت موسیٰؑ اور ان کو کتاب دیئے جانے کے لگ بھگ تین سو سال بعد شروع ہوا، اس لئے کہ بنی اسرائیل کی بزدلی کے باعث حضرت موسیٰؑ کی حیاتِ دنیوی کے دوران انقلاب کی تکمیل نہیں ہو پائی تھی۔ سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں تاریخ بنی اسرائیل کے اس دور کا ذکر موجود نہیں ہے۔

۵۔ زوالِ اول کے ضمن میں عذابِ الٰہی کے کوڑے دونوں امتوں پر دو مرحلوں میں پڑے: بنی اسرائیل پر پہلے اشوریوں کے ہاتھوں جو شمال سے حملہ آور ہوئے، اور بعد ازاں کلدانیوں کے ہاتھوں جو مشرق سے حملہ آور ہوئے۔ اور مسلمانوں پر پہلے صلیبیوں کے ہاتھوں جو شمال مغرب سے آئے، اور پھر تاتاریوں کے ہاتھوں جن کا سیلاب مشرق کی جانب سے آیا۔

۶۔ سابقہ امت مسلمہ چونکہ صرف ایک 'قوم' یعنی بنی اسرائیل پر مشتمل تھی لہٰذا اس میں تجدید و احیاء کا کام بھی لامحالہ ان ہی کے ذریعے ہوا۔ امتِ محمد ﷺ چونکہ واضح طور پر دو حصوں پر مشتمل ہے یعنی اُمیّین اور آخَرِین پر، لہٰذا اس کے ضمن میں ﴿یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ﴾ (محمدؐ ۳۸) پر عمل ہوا، اور عروج ثانی عربوں کی قیادت میں نہیں بلکہ ترکوں کی قیادت میں ہوا۔

۷۔ دونوں امتوں پر زوال کا دوسرا اور طویل تر دور یورپی اقوام کے ہاتھوں آیا۔ بنی اسرائیل پر رومیوں کے ہاتھوں، اور مسلمانوں پر فرانسیسیوں، انگریزوں، ولندیزیوں اور اطالویوں وغیرہ کے ذریعے!

۸۔ بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے موقع پر سابقہ امت کے لئے رحمتِ خداوندی کے سایہ تلے آنے کا آخری

موقع پیدا ہوا تھا جسے اس نے اپنی شامتِ اعمال سے کھو دیا، لہٰذا ان کا دوسرا دورِ زوال تا حال جاری ہے۔ چنانچہ ان پر ﴿وَاِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا﴾ کی وعید کا ظہور تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔ جس کی نمایاں ترین مثال نصف صدی پیشتر کا وہ عذاب ہے جو ان پر جرمنوں کے ہاتھوں آیا۔ اور جسے یہ ہالوکاسٹ (Holocaust) سے تعبیر کرتے ہیں۔ تاہم اس کا اصل نقطۂ عروج خروجِ دجال اور نزولِ مسیحؑ کے موقع پر ہوگا۔ جس کا وقت اب زیادہ دور محسوس نہیں ہوتا۔

۹۔ بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بعد سے رحمتِ خداوندی میں داخلے کا واحد 'شاہ درہ' قرآن حکیم ہے، جس کی جانب اب سے چودہ سو سال قبل بنی اسرائیل کی رہنمائی کی گئی تھی، اور اب امت مسلمہ کے لئے بھی زوالِ ثانی سے نکل کر عروج سوم کی جانب پیشقدمی کا واحد راستہ ''رجوع الی القرآن'' ہے! یہی وجہ ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع کے آخر میں بھی فرمایا گیا ﴿اِنَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ يَهۡدِىۡ لِلَّتِىۡ هِىَ اَقۡوَمُ﴾ پھر پوری سورۂ مبارکہ کا عمود ہی عظمتِ قرآن کا بیان ہے، بالخصوص یہ آیاتِ مبارکہ نہایت قابلِ توجہ ہیں ﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ اور ﴿وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا لِلنَّاسِ فِىۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ مِنۡ كُلِّ مَثَلٍ﴾ اور اختتام سورہ پر تو نہایت پُر شکوہ اور پُر جلال انداز اختیار فرمایا گیا۔ یعنی ﴿وَبِالۡحَـقِّ اَنۡزَلۡنٰهُ وَبِالۡحَـقِّ نَزَلَ﴾ جس کی کامل ترجمانی ہے نبی اکرم ﷺ کے اس قول مبارک میں کہ اِنَّ اللّٰہَ یَرۡفَعُ بِھٰذَا الۡکِتٰبِ اَقۡوَاماً وَّیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیۡنَ (مسلمؒ عن عمرؓ) چنانچہ اس امر پر اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ تنظیمِ اسلامی کا 'منبٰی' ہی نہیں 'محور' بھی ''رجوع الی القرآن'' ہے۔

۱۰۔ امتِ مسلمہ کا تیسرا اور آخری عروج، جس کی جانب پیش قدمی شروع ہو چکی ہے تقدیر مبرم کی طرح لازمی اور اٹل ہے۔[۱] تاہم بفحوائے الفاظ قرآنی ﴿وَاِنۡ اَدۡرِىۡۤ اَقَرِيۡبٌ اَمۡ بَعِيۡدٌ مَّا تُوۡعَدُوۡنَ﴾ (الانبیاء۱۰۹) نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مرحلہ ابھی کتنا دور ہے، نہ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس سے قبل ابھی امت کو اور کون کون سے صدمے جھیلنے اور مصائب برداشت کرنے ہوں گے، مزید برآں یہ بھی بعید نہیں کہ اس عروج ثالث کے سلسلے میں تاریخ اپنے آپ کو دہرائے اور قدرتِ خداوندی موجود الوقت جملہ نام نہاد مسلمان اقوام کو رد کر کے کسی بالکل نئی قوم کے ہاتھوں میں اپنے دین کا جھنڈا تھما دے۔ **وما ذلك على الله بعزيز!!**

---

(۱) ملاحظہ ہو میری تالیف ''استحکام پاکستان'' کا باب نہم!

موجودہ تجدیدی مساعی اور ''ہمہ جہتی احیائی عمل'' کے جائزے کے بارے میں بھی راقم کو اطمینان ہے کہ بحمد للہ اب سے سولہ سال [1] قبل ضبطِ تحریر میں آنے والا یہ جائزہ بھی نہ صرف یہ کہ نہایت جامع ہے، بلکہ بہت فکر انگیز بھی ہے۔ اور اس کے ذریعے امید واثق ہے کہ ایک جانب تمام خادمانِ دین اور مخلصینِ ملت کے فکر ونظر کو وسعت حاصل ہوگی اور وہ ''انا و لا غیری'' کی تنگ گھاٹی سے نکل آئیں گے اور وسیع تر تناظر میں جملہ احیائی مساعی کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے، اور دوسری جانب تنظیمِ اسلامی کے کارکنان تاریخ کے دھارے میں اپنے مقام، محل، اور موقف کا واضح شعور اور اپنے پیشِ نظر کام کے حدودِ اربعہ اور اصول و قواعد کا واضح فہم حاصل کر کے ذہن و قلب کی پوری یکسوئی کے ساتھ جدوجہد میں منہمک ہو سکیں گے، اور وقتی سیاسی ہنگاموں اور زَبَدًا رَّابِیًا (الرعد ۱۷) کی مانند عارضی اور سطحی جوش و خروش کے ساتھ اٹھنے والی تحریکوں سے متاثر ہو کر اپنا وقت ضائع اور منزل کھوٹی نہیں کریں گے۔ اللھم امین!

خاکسار

اسرار احمد عفی عنہ

۱۹ر فروری ۱۹۹۱ء

---

(۱) بانی محترمؒ نے یہ تقدیم ۱۹۹۱ء میں تحریر فرمائی تھی، چنانچہ آج اس جائزہ کو ۳۶ سال گزر چکے ہیں [۲۰۱۱ء] (مرتب)

امت مسلمہ کے عروج وزوال کے دو دَور

(تاریخ بنی اسرائیل کے پس منظر میں)

اور موجودہ احیائی مساعی

کا اجمالی جائزہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا
الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ (۱)وَاٰتَیۡنَا مُوۡسَی
الۡکِتٰبَ وَجَعَلۡنٰہُ ہُدًی لِّبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اَلَّا تَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِیۡ وَکِیۡلًا (۲)
ذُرِّیَّۃَ مَنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوۡحٍ ؕ اِنَّہٗ کَانَ عَبۡدًا شَکُوۡرًا (۳) وَقَضَیۡنَاۤ اِلٰی بَنِیۡۤ
اِسۡرَآءِیۡلَ فِی الۡکِتٰبِ لَتُفۡسِدُنَّ فِی الۡاَرۡضِ مَرَّتَیۡنِ وَلَتَعۡلُنَّ عُلُوًّا کَبِیۡرًا
(۴)فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ اُوۡلٰىہُمَا بَعَثۡنَاعَلَیۡکُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِیۡ بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ
فَجَاسُوۡا خِلٰلَ الدِّیَارِ ؕ وَکَانَ وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا (۵) ثُمَّ رَدَدۡنَا لَکُمُ الۡکَرَّۃَ
عَلَیۡہِمۡ وَاَمۡدَدۡنٰکُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِیۡنَ وَجَعَلۡنٰکُمۡ اَکۡثَرَ نَفِیۡرًا (۶) اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ
اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِکُمۡ ۟ وَاِنۡ اَسَاۡتُمۡ فَلَہَا فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَۃِ لِیَسُوۡٓءٗا
وُجُوۡہَکُمۡ وَلِیَدۡخُلُوا الۡمَسۡجِدَ کَمَا دَخَلُوۡہُ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّلِیُتَبِّرُوۡا مَا عَلَوۡا
تَتۡبِیۡرًا (۷) عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یَّرۡحَمَکُمۡ ۚ وَاِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا وَجَعَلۡنَا جَہَنَّمَ
لِلۡکٰفِرِیۡنَ حَصِیۡرًا (۸) اِنَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ یَہۡدِیۡ لِلَّتِیۡ ہِیَ اَقۡوَمُ وَیُبَشِّرُ
الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ اَجۡرًا کَبِیۡرًا (۹) وَّاَنَّ الَّذِیۡنَ لَا
یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ اَعۡتَدۡنَا لَہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا (۱۰) (سورہ بنی اسرائیل)

ترجمہ آیات سورہ بنی اسرائیل اتا ۱۰

(ترجمہ شیخ الہندؒ)

پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کو گھیر رکھا ہے ہماری برکت نے تاکہ دکھلائیں اس کو کچھ اپنی قدرت کے نمونے وہی ہے سننے والا دیکھنے والا (۱) اور دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور کیا اس کو ہدایت بنی اسرائیل کے واسطے کہ نہ ٹھہراؤ میرے سوا کسی کو کارساز (۲) تم جو اولاد ہو اُن لوگوں کی جن کو چڑھایا ہم نے نوحؑ کے ساتھ بے شک تھا وہ بندہ حق ماننے والا (۳) اور صاف کہہ سنایا ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں کہ تم خرابی کرو گے ملک میں دو بار اور سرکشی کرو گے بڑی سرکشی (۴) پھر جب آیا پہلا وعدہ بھیجے ہم نے تم پر اپنے بندے سخت لڑائی والے پھر پھیل پڑے شہروں کے بیچ اور وہ وعدہ ہونا ہی تھا (۵) پھر ہم نے پھیر دی تمہاری باری اُن پر اور قوت دی تم کو مال سے اور بیٹوں سے اور اس سے زیادہ کر دیا تمہارا لشکر (۶) اگر بھلائی کی تم نے بھلا کیا اپنا اور اگر برائی کی تو اپنے لئے پھر جب پہنچا وعدہ دوسرا بھیجے اور بندے کہ اداس کر دیں تمہارے منہ اور گھس جائیں مسجد میں جیسے گھس گئے تھے پہلی بار اور خراب کر دیں جس جگہ غالب ہوں پوری خرابی (۷) بعید نہیں تمہارے رب سے کہ رحم کرے تم پر اور اگر پھر وہی کرو گے تو ہم پھر وہی کریں گے اور کیا ہے ہم نے دوزخ کو کافروں کا قید خانہ (۸) یہ قرآن بتلاتا ہے وہ راہ جو سب سے سیدھی ہے۔ اور خوشخبری سناتا ہے ایمان والوں کو جو عمل کرتے ہیں اچھے کہ ان کے لئے ہے ثواب بڑا (۹) اور یہ کہ جو نہیں مانتے آخرت کو ان کے لئے تیار کیا ہے ہم نے عذاب دردناک (۱۰)

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ

”لَیَأْتِیَنَّ عَلٰی اُمَّتِیْ مَا اَتٰی عَلٰی بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ...“

○

حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ”میری امت پر بھی وہ تمام احوال وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے، بالکل ایسے جیسے ایک جُوتا دوسرے جوتے سے مشابہ ہوتا ہے“

(۱) رَواہُ التِّرمِذِیُّ عَنْ عَبْدِاللّٰہِ ابْنِ عَمرٍوؓ

امت مسلمہ کے عروج وزوال کے دو دَور

ہمارے نزدیک بیسویں صدی عیسوی کو امتِ مسلمہ کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ (Turning point) کی حیثیت حاصل ہے، چنانچہ اس کے رُبعِ اول کے خاتمے کے لگ بھگ جب کہ امت کے ایک حساس اور دردمند فرد کے دل کی گہرائیوں سے یہ دردانگیز صدا بلند ہوئی ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے! (حالؔی)

تاریخ ایک کروٹ لے چکی تھی اور ملتِ اسلامی کے تنِ مردہ میں حیاتِ تازہ کے کچھ آثار ظاہر ہونے شروع ہو چکے تھے۔

اور اگر ذرا بنظرِ غائر مشاہدہ کیا جائے تو اس صدی کا درمیانی نصف تو ایک نہایت ہی عجیب نقشہ پیش کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ ایک طرف تنزل اور انحطاط کا عمل بھی جاری رہا اور نکبت وادبار کے سائے مزید گہرے ہوتے چلے گئے جس کا نقطۂ عروج (Climax) ۶۷ء اور ۷۱ء کی ذلت ورسوائی ہے[۱] اور دوسری طرف ایک گھمبیر اور ہمہ جہتی احیائی عمل کا آغاز بھی ہو گیا جس کا نقطۂ آغاز ۲۰-۲۵ء کا زمانہ ہے۔ گویا مسلسل پچاس برس تک یہ دونوں ﴿مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ ٥ بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ ٥﴾[۲] کی سی شان کے ساتھ پہلو بہ پہلو جاری رہے۔

اس اجمال کی تفصیل کے ضمن میں ہم پہلے امت مسلمہ کے عروج وزوال کا ایک اجمالی خاکہ تاریخی ترتیب (Chronological Order) کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کریں گے، تاکہ ایک طرف 'عروج' کے ضمن میں ملتِ اسلامی کی عظمت وسطوتِ گزشتہ کی ایک جھلک سامنے آئے اور علامہ اقبال کے

(۱) اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی خوش فہمی ہی تھی۔ امت مسلمہ کے دوسرے دورِ زوال کی انتہا شاید اب آیا چاہتی ہے۔ (جنوری ۱۹۹۱ء)

(۲) سورۃ الرحمٰن، آیات ۱۹، ۲۰: ''چلائے دو دریا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ، (لیکن) دونوں کے مابین ایک پردہ (حائل) ہے کہ باہم ایک دوسرے پر غالب نہ آسکیں!''

اس شعر کے مطابق کہ ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تُو نے؟
وہ کیا گردوں تھا تُو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا!

مسلمان نوجوان کو معلوم ہو کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب عرب افواج جبرالٹر (جبل الطارق) سے شمال مشرق کی جانب بڑھتی ہوئی فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھیں اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب ترک افواج پورے مشرقی یورپ کو روندتی ہوئی ''وی آنا'' کے دروازوں تک جا پہنچی تھیں۔ شاید کہ اسی طرح کچھ نوجوانوں کے دل میں ملتِ اسلامی کی تجدید اور اس کی عظمت وسطوتِ گزشتہ کی بازیافت کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اور دوسری طرف 'زوال' کے ضمن میں یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ خدا کا عدل بے لاگ ہے اور اس کا قانون اٹل اور غیر مبدل۔ اس نے جو معاملہ سابق امتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کے ساتھ کیا بعینہٖ وہی ہمارے ساتھ کیا، حتیٰ کہ ہماری اور ان کی تاریخ میں ایک حد درجہ حیرت انگیز مشابہت موجود ہے اس پہلو سے کہ یہود پر بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کے دو دور آئے اور ہم پر بھی دو ہی دور آئے۔ اگرچہ امتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی وسعت کی نسبت سے ہمارے نکبت وادبار کے یہ دور بھی یہود کے مقابلے میں بہت طویل رہے اور جس طرح بنی اسرائیل کی تولیت کے زمانے میں بیت المقدس کے ناموس کا پردہ ؎

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک!

کے مصداق دو بار چاک ہوا، اسی طرح ہمارے عہدِ تولیت میں بھی مسجدِ اقصیٰ کی حرمت دو ہی مرتبہ پامال ہوئی۔

اس کے بعد ہم اس گھمبیر اور ہمہ جہتی ''احیائی عمل'' کا اجمالاً جائزہ لیں گے تا کہ ایک طرف لوگوں کا افق ذہنی وسیع ہو اور وہ مختلف احیائی کوششوں کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھ سکیں اور دوسری طرف یہ بھی واضح ہو جائے کہ ہم خود اس ہمہ جہتی احیائی عمل کے کس گوشے میں ایک حقیر سی خدمت سرانجام دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تا کہ ﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ﴾[1] کے مصداق جو ہمارا ساتھ دینا چاہے وہ بھی پورے انشراحِ صدر کے ساتھ دے اور جو تنقید کی 'خدمت' سرانجام دینا چاہے وہ بھی ہمارے موقف کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد ہی اس اہم مگر نازک فرض کی ادائیگی پر کمربستہ ہو!

---

(۱) سورۃ الانفال آیت ۴۲: ''تا کہ ہلاک ہو جسے ہلاک ہونا ہے حجت قائم ہو چکنے کے بعد اور جئے جسے جینا ہو واضح دلیل کے ساتھ!''

امتِ مسلمہ کے عروج وزوال کے تاریخی خاکے کے ضمن میں دو باتیں پیشگی سمجھ لینی چاہئیں:

ایک یہ کہ اپنی ہیئت تشکیلی کے اعتبار سے امتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دو حصے ہیں۔ پہلا اُمیّیّن یعنی بنی اسمٰعیل پر مشتمل ہے اور اسے اس امت کے قلب یا مرکز (Nucleus) کی حیثیت حاصل ہے اور دوسرا آخرین یعنی دیگر اقوام پر مشتمل ہے خواہ وہ کُرد ہوں یا ترک، اہلِ فارس ہوں یا اہلِ ہند، افغان ہوں یا مغل، اہلِ حبش ہوں یا بربر، مشرقِ بعید یعنی ملایا اور انڈونیشیا سے تعلق رکھتے ہوں یا مغربِ بعید یعنی مراکو اور موریطانیہ سے۔

دوسرے یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے بھی عالمِ اسلام کو تین حصوں میں منقسم سمجھنا چاہئے۔ یعنی ایک قلب، دوسرے میمنہ اور تیسرے میسرہ۔ اگر دنیا کے نقشے کو سامنے رکھ کر عالمِ اسلام پر نگاہ جمائی جائے تو وہ ایک ایسے عقاب کے مانند نظر آئے گا جو اپنے دونوں بازوؤں کو پوری طرح پھیلائے محوِ پرواز ہو۔ جزیرہ نمائے عرب، عراق، فلسطین، شام اور ایشیائے کوچک جو عالمِ اسلام کے قلب کی حیثیت رکھتے ہیں اس عقاب کے جسم کے مانند نظر آئیں گے، جن میں سے ایشیائے کوچک کو اس کے سر اور چونچ سے مشابہت ہے اور جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصے کو اس کے دُم کے پھیلے ہوئے پروں سے۔ اس عقاب کا دایاں بازو (میمنہ) ایران، ترکستان، افغانستان اور برصغیر ہندو پاک سے ہوتا ہوا ملایا اور انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے اور بایاں بازو (میسرہ) پورے شمالی افریقہ کو لپیٹ میں لیتا ہوا اسپین تک چلا گیا ہے۔

اب آئیے تاریخی خاکے کی طرف:

سنِ عیسوی [۱] کے حساب سے امتِ مسلمہ کی تاریخ کا آغاز ساتویں صدی سے ہوتا ہے، اس لئے کہ آنحضور ﷺ کی ولادت باسعادت اغلباً ۵۷۱ء میں ہوئی۔ ۶۱۰ء میں آپؐ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا اور محتاط ترین حساب کے مطابق اپریل ۶۳۲ء میں آپ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک 'اسلامی انقلاب' کی تکمیل فرما کر ''رفیقِ اعلیٰ'' سے جا ملے، فصلی اللہ علیہ وبارك وسلم تسلیما کثیرا۔ اصحابِ ثلٰثہ یعنی حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عہدِ خلافت کے دوران اُمیّیّن ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار لے کر ایک سیلاب کے مانند جزیرہ نمائے عرب سے نکلے اور انہوں نے ایک ربع صدی سے بھی کم میں ایران وعراق، شام و فلسطین اور مصر کے علاوہ شمالی افریقہ کے بڑے رقبے پر اسلام کا پرچم لہرا دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں تو یہ عمل رکا رہا، لیکن بنو امیہ کے دور کے آغاز کے

(۱) چونکہ اکثر لوگوں کے اذہان سنِ عیسوی ہی کے ساتھ زیادہ مانوس ہیں لہٰذا یہاں اسی کو پیشِ نظر رکھا جا رہا ہے۔

ساتھ ہی اس سیلاب نے دوبارہ آگے بڑھنا شروع کر دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ایک طرف مشرق میں ترکستان، افغانستان اور سندھ تک اور دوسری طرف مغرب میں پورے شمالی افریقہ کے علاوہ سپین سمیت مغربی یورپ کا وسیع علاقہ اُمیِّیّن کے زیرِ نگیں آگیا اور عالم اسلام کی سرحدیں تین براعظموں تک وسیع ہو گئیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب عرب افواج اندلس سے پیش قدمی کرتے ہوئے فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھیں۔

آٹھویں، نویں اور دسویں صدی عیسوی کا زمانہ عربوں کے عروج کا دور ہے جس کے دوران اسلام کی علمبرداری اور عالم اسلام کی سیادت دونوں اُمیِّیّن کی دو اہم شاخوں یعنی بنوامیہ اور بنوعباس کے پاس رہیں (۱) اور روئے ارض کے ایک بڑے حصے پر ان کے دین و مذہب، ان کے تہذیب و تمدن، ان کے علوم وفنون اور ان کی شان و شوکت کا سکہ رواں رہا۔ لیکن جیسے جیسے دنیوی جاہ وجلال میں اضافہ ہوا، جذباتِ دینی اور حرارتِ ایمانی میں کمی آتی چلی گئی اور اس طرح یہ تناور درخت اندر سے کھوکھلا ہوتا چلا گیا۔ اس اندرونی اضمحلال کے اثرات کے ظاہر ہونے میں کچھ مدت ضرور صرف ہوئی لیکن دسویں صدی عیسوی ہی کے دوران واضح ہو گیا تھا کہ عرب اپنے عالم پیری میں قدم رکھ چکے ہیں۔

گیارہویں صدی عیسوی کے دوران اُمیِّیّن کا انحطاط اور زوال اپنی آخری حدوں کو پہنچ گیا اور اس طرح عالمِ اسلام کے قلب میں قوت کا ایک خلا (Power Vacuum) پیدا ہو گیا۔

خوش قسمتی سے قوت کے دباؤ میں اس کمی (Depression) کے نتیجے میں عالمِ اسلام کی شمال مشرقی سرحدوں سے جو قبائل قلبِ اسلام کی طرف کھنچ کر آئے وہ پہلے ہی سے مسلمان ہو چکے تھے۔ یعنی کُرد اور ترکانِ سلجوقی جنہوں نے گیارہویں صدی عیسوی کے دوران شام، فلسطین اور مصر میں مضبوطی کے ساتھ قدم جمائے اور اس طرح عالمِ اسلام کے قلب کی حفاظت اور مدافعت کے لئے کسی قدر تازہ دم قوت فراہم ہو گئی۔ (۲)

---

(۱) ان میں سے بھی صرف بنوامیہ کے دورِ حکومت کو خالص عرب غلبہ واقتدار کا دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ بنوعباس کے دورِ حکومت میں ابتدا ہی سے اہلِ عجم کو حکومت وسلطنت کے معاملات میں فیصلہ کن دخل حاصل ہو گیا تھا اور دراصل اسی نے عرب اقتدار کے تناور درخت کو اندر ہی اندر گھن کی طرح چٹ کر لیا، ورنہ خالص عرب خون میں جو حرارت تھی اور قوتِ مقاومت موجود تھی اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ بنوامیہ کی ایک شاخ جس نے اندلس میں قدم جمائے وہ عالم اسلام کے قلب سے عرب قوت کے کلی خاتمے کے بھی تین صدی بعد تک پھلتی پھولتی رہی اور اس کا خاتمہ کہیں پندرہویں صدی عیسوی میں جا کر ہوا۔

(۲) یہ اسی دور کی بات ہے کہ افغان قبائل نے جنوب مشرق کا رخ کیا اور ہندوستان پر حملے شروع کئے جس سے ہند میں مسلمانوں کی عظیم الشان مملکت کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔

بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے دوران میں امت مسلمہ پر گویا عذابِ خداوندی کے ''وعدہ اولیٰ'' کا ظہور ہوا اور ہو بہو ﴿بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ﴾ (۱) کا نقشہ کھنچ گیا۔ چنانچہ پہلے شمال سے صلیبی طوفان کے ریلے آنے شروع ہوئے۔ (۲) اور ۱۰۹۹ء میں نہ صرف یہ کہ مسجدِ اقصیٰ کی ناموس کا پردہ چاک ہوا بلکہ بیت المقدس میں وہ قتلِ عام ہوا جس کا تذکرہ کرتے ہوئے مغربی مؤرخین بھی کانپ جاتے ہیں۔ پورے اٹھاسی برس تک بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ رہا۔ اس لئے کہ دولت عباسی تو ''مرنے والی امتوں کے عالمِ پیری'' کا نقشہ پیش کر رہی تھی، گویا اُمیّیِن میں تو سرے سے دم خم باقی ہی نہ رہا تھا۔ بالآخر اٰخرِین کے تازہ و گرم خون نے مجاہدِ کبیر صلاح الدین ایوبیؒ کی سرکردگی میں ۱۱۸۷ء میں بیت المقدس کو صلیبیوں کے قبضے سے نجات دلائی اور اس طوفان کا رخ موڑا۔ اور پھر مشرق کی جانب سے آیا فتنۂ تاتار کا وہ طوفانِ عظیم کہ جس نے پہلے افغانستان اور ایران کو پامال کیا اور ہر جگہ کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور بالآخر ۱۲۵۸ء میں بغداد میں وہ تباہی مچائی کہ رہے نام اللہ کا۔ لاکھوں مسلمان تہِ تیغ ہوئے، بغداد کی گلیاں خون کی ندیاں بن گئیں اور الف لیلہ کے اس رومانوی شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور بعینہٖ وہ کیفیت پیدا ہوگئی جو کم و بیش دو ہزار سال قبل بخت نصر کے حملے سے بیت المقدس کی ہوئی تھی۔ نتیجۃً زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنین کے ساتھ ہی خلافتِ عباسی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بالکل گُل ہو گیا اور نہ صرف یہ کہ امتِ مسلمہ پر عذابِ خداوندی کا یہ پہلا دور تکمیل کو پہنچا بلکہ کم از کم اُمیّیِن کی حد تک تو ﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ (۳) کی وعید بھی پوری ہوگئی اور وہ عالم اسلام کی سیادت و قیادت کے منصب سے معزول کر دیئے گئے۔ دو سال بعد یعنی ۱۲۶۰ء میں اس طوفان کا رخ بھی اٰخرِین ہی نے پھیرا جس سے کم از کم عالم اسلام کا مغربی بازو اس کی تاخت و تاراج سے محفوظ رہ گیا۔

بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے دوران عالمِ اسلام کا قلب بعینہٖ وہی نقشہ پیش کر رہا تھا جسے دیکھ کر کبھی حضرت عزیر علیہ السلام کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ ﴿اَنّٰى يُحْىٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (۴) لیکن پھر امتِ مسلمہ کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی وہی شان ظاہر ہوئی جس کا ظہور بنی

---

(۱) سورۂ بنی اسرائیل آیت ۵: ''بھیجے ہم نے تم پر اپنے بندے سخت جنگجو، جو گھس گئے اور پھیل گئے شہروں کے مابین''

(۲) جیسے بنی اسرائیل پر بھی پہلی تباہی شمال سے حملہ آور ہونے والے آشوریوں کے ہاتھوں آئی تھی۔

(۳) سورۂ محمدؐ آیت ۳۸: ''اگر تم پیٹھ موڑ لو گے تو (اللہ) تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو کھڑا کر دے گا''

(۴) سورۃ البقرہ آیت ۲۵۹: ''کیسے زندہ کرے گا اللہ اسے، اس کی موت کے بعد''

اسرائیل کے حق میں ہوا تھا یعنی ﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا﴾ [1] صرف اس فرق کے ساتھ کہ چونکہ سابقہ امت مسلمہ ایک ہی نسل پر مشتمل تھی لہٰذا اس کی 'نشاۃ ثانیہ' کا یہ عمل بھی لامحالہ اسی نسل کے اندر واقع ہوا۔ لیکن امتِ محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معاملے میں یہ مجبوری نہ تھی، لہٰذا یہاں 'تجدیدِ ملت' کا یہ کام 'اٰخَرِین کی مختلف اقوام سے لے لیا گیا۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ خود انہی ترکانِ چنگیزی کا بڑا حصہ اسلام لے آیا [۲] جن کے ہاتھوں عالمِ اسلام پر ہولناک تباہی آئی تھی بلکہ انہی کے قبیل کے وحشی قبائل میں سے دو قبیلوں کو یہ توفیق ارزانی ہوئی کہ وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے اور ان میں سے ایک یعنی ترکانِ تیموری نے ہندوستان میں ایک عظیم الشان مسلم سلطنت کی بنیاد رکھ کر عالمِ اسلام کے دائیں بازو کی توسیع کی اور دوسرے یعنی ترکانِ عثمانی نے ابتداءً ایشیائے کوچک میں قدم جمائے اور پھر رفتہ رفتہ اس عظیم الشان مسلمان مملکت کی بنیاد رکھی جس نے ایک طرف پورے مشرقی یورپ پر اپنی بالادستی کا سکہ جمایا، یہاں تک کہ ایک موقع پر اٹلی کے دروازوں تک دستک دی اور دوسری طرف شمالی افریقہ سمیت پورے عالمِ اسلام کے قلب کی حفاظت وسیادت کی ذمہ داری سنبھالی تا آنکہ خلافت کا بھی احیاء کیا۔ اور اس طرح گویا عالمِ اسلام کے قلب کی عظمت وسطوتِ گزشتہ پھر پوری طرح لوٹ آئی۔ اگرچہ عربوں کے ذریعے نہیں بلکہ ترکوں کے واسطے سے۔

قدرت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ ادھر تو خلافتِ عثمانی کے استحکام کے ذریعے عالم اسلام کے قلب میں گویا ملت کی نشاۃِ ثانیہ ہوئی اور ادھر یورپی استعمار کے سیلاب کی صورت میں امتِ مسلمہ پر عذابِ الٰہی کے دوسرے اور نہایت طویل دور کا آغاز ہوگیا جس کا اصل زور عالمِ اسلام کے میسرہ اور میمنہ کی جانب رہا۔

یہ ایک ناقابلِ تردید تاریخی حقیقت ہے کہ یورپ میں احیاء (Renaissance) کا پورا عمل اسلام ہی کے زیرِ اثر شروع ہوا اور یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے یورپ کو مشرق ومغرب کے علوم وفنون سے روشناس کرایا لیکن جیسے ہی یورپ میں بیداری پیدا ہوئی اور وہاں قوت کا دباؤ (Power Potential) بڑھا، گویا عالمِ اسلام کی شامت آگئی۔

یورپ مشرق ومغرب دونوں اطراف سے مسلمانوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا (Locked) تھا۔ لیکن

---

(۱) سورۃ بنی اسرائیل آیت ۶: ''پھر ہم نے تمہیں ان پر دوبارہ غلبہ عطا فرمایا اور تمہاری مدد کی مال واسباب اور بیٹوں سے اور کر دی تمہاری نفری سب سے زیادہ''

(۲) ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے (اقبالؔ)

مشرق میں عذاب کے وعدۂ اولیٰ کے بعد نشأۃِ ثانیہ کا عمل ظاہر ہو چکا تھا اور عظیم سلطنتِ عثمانیہ عالمِ اسلام کے قلب کے محافظ سنتری کی حیثیت سے کھڑی تھی البتہ مغرب میں اب دولتِ ہسپانیہ ''مرنے والی امتوں کے عالمِ پیری'' کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ لہٰذا ''ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات'' کے مصداق یورپی استعمار کا اولین شکار وہی بنی اور پندرہویں صدی عیسوی کے دوران اس عظیم سلطنت کا قلع قمع ہو گیا۔ یہاں تک ۱۴۹۲ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد تو بعینہٖ وہ صورت پیدا ہو گئی جس کا نقشہ قرآن مجید میں عذابِ استیصال کا نوالہ بننے والی قوموں کے بیان میں کھینچا جاتا ہے یعنی ﴿كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا﴾ اور ﴿لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ﴾ ''جیسے کہ وہ کبھی وہاں آباد ہی نہ تھے'' اور ''اب ان کے ویران مسکنوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا''

۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما نے نیا بحری راستہ تلاش کیا اور اس کے فوراً بعد یورپی استعمار کا سیلاب عالمِ اسلام کے میمنہ پر ٹوٹ پڑا اور انڈونیشیا، ملایا اور ہندوستان مختلف یورپی اقوام کے استبدادی پنجوں میں جکڑے گئے اور یہ عمل جس کا آغاز سولہویں صدی عیسوی سے ہوا، اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں عالمِ اسلام کے دائیں بازو کی حد تک اپنے عروج (Zenith) کو پہنچ گیا۔

اس اثناء میں دولتِ عثمانی بھی اپنے شباب کے دور سے گزر آئی تھی اور اب اس نے بھی 'مردِ بیمار' کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ گویا عالمِ اسلام کے قلب میں آٹھ صدیوں کے بعد پھر وہی قوت کا خلا پیدا ہو گیا جو گیارہویں صدی عیسوی میں دولتِ عباسیہ کے اضمحلال کے باعث پیدا ہوا تھا۔ اور قوت کے دباؤ کی اس کمی کے باعث مغربی استعمار کا رخ عالمِ اسلام کے قلب کی جانب مڑ گیا اور گویا اس کے اعتبار سے بھی ''وعدالآخرۃ'' کا وقت آ پہنچا۔

عالمِ اسلام کے قلب پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کے اس دوسرے دور کا آغاز بیسویں صدی کے شروع میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ پہلی عالمگیر جنگ کے خاتمے پر جب دنیا کا نیا نقشہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ عظیم دولتِ عثمانیہ سمٹ سمٹا کر ایشیائے کوچک میں محدود ہو گئی اور شمالی افریقہ سمیت پورا عالمِ عرب چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو کر مختلف یورپی اقوام کے براہِ راست زیرِ نگیں ہو گیا یا بالواسطہ محکومی میں آ گیا اور ہو بہو وہی کیفیت پیدا ہو گئی جس کی خبر مخبرِ صادق ﷺ نے ان الفاظ میں دی تھی کہ ''ایک زمانہ آئے گا کہ اقوامِ عالم ایک دوسرے کو تم پر ٹوٹ پڑنے کی اس طرح دعوت دیں گی جیسے کسی دعوتِ طعام کا اہتمام کرنے والا دسترخوان چُنے جانے پر مہمانوں کو بلایا کرتا ہے''۔

اس طرح بحیثیت مجموعی امتِ مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کے دورِ ثانی کی تکمیل اس صدی کے ربعِ

اول میں ہوگئی تھی جب کہ پورا عالمِ اسلام مغربی استعمار کے ناپاک شکنجے میں جکڑا گیا۔ اگرچہ خاص اُمیّین کے حق میں وعد الآخرۃ کی وہ مکمل صورت جو ﴿لِيَسُوٓءُا وُجُوهَكُمۡ وَلِيَدۡخُلُوا الۡمَسۡجِدَ كَمَا دَخَلُوۡهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوۡا مَا عَلَوۡا تَتۡبِيۡرًا﴾ [1] کے الفاظ میں بیان ہوئی تھی تقریباً نصف صدی بعد ۱۹۶۷ء میں ظاہر ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ایک مغضوب وملعون قوم کے ہاتھوں ایک شرمناک اور ذلت آمیز شکست دلوائی اور عربوں کے عہدِ تولیت کے دوران ایک بار پھر مسجدِ اقصیٰ [2] کی حرمت پامال ہوئی اور بیت المقدس ان کے ہاتھوں سے نکل کر یہود کے قبضے میں چلا گیا اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس بار یہ قبضہ کتنا طویل ہوگا۔

اس داستان کا الم ناک ترین باب یہ ہے کہ مغربی استعمار نے امت مسلمہ کی وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کر دیا اور اس صدی کے آغاز ہی میں نسلی اور علاقائی عصبیتوں کے وہ بیج مسلمان اقوام کے دلوں میں بو دیئے جو ابھی تک برگ وبار لا رہے ہیں۔ چنانچہ پہلے انہوں نے عربوں کو ترکوں کے خلاف ابھارا۔ نتیجۃً عالمِ اسلام کا قلب دولخت ہو گیا۔ اور وحدتِ ملی کے علامتی ادارے (Symbol) یعنی خلافت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ پھر عالمِ عرب کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اس طرح تقسیم کیا کہ نسلی اور لسانی اشتراک کے باوجود عالمِ عرب کے کامل اتحاد کا امکان تاحال دور دور تک نظر نہیں آتا۔

اسی نسلی تعصب کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے اس عذاب کا مزہ بھی امتِ مسلمہ کو چکھنا پڑا جو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ ﴿اَوۡ يَلۡبِسَكُمۡ شِيَعًا وَّيُذِيۡقَ بَعۡضَكُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ﴾ (سورۃ الانعام

---

(۱) سورۃ بنی اسرائیل آیت ۷: ''تو پھر جب آیا وقت دوسرے وعدے کا (تو مسلط کئے تم پر وہ لوگ) تا کہ حلیہ بگاڑ دیں تمہارا اور گھس جائیں مسجد (اقصیٰ) میں جیسے کہ گھسے تھے پہلی بار اور تباہ وبرباد کر دیں جس پر بھی قابو پائیں۔''

(۲) یہ ایک عجیب تاریخی حقیقت ہے کہ روئے ارض کے دو قبلوں میں سے بے حرمتی اور پامالی کا معاملہ چاروں مرتبہ مسجد اقصیٰ ہی کے ساتھ ہوا جسے غلطی سے قبلۂ اول کہہ دیا جاتا ہے۔ واضح رہنا چاہئے کہ قبلۂ اول بیت اللہ اور مسجد حرام ہے بفحوائے الفاظ قرآنی ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَكَّةَ﴾ اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو خاص معاملہ رہا ہے وہ واقعۂ فیل سے ظاہر ہے۔ اور راقم کو تو یہی حکمت نظر آتی ہے اس میں کہ مسلمانوں کے سیاسی مرکز کو رفتہ رفتہ اس قبلۂ اول سے دور سے دور تر کیا جاتا رہا تا کہ اس امت کو بھی جب عذابِ الٰہی سے واسطہ پڑے تو اس کے ساتھ خانہ کعبہ کی حرمت بھی مجروح نہ ہو۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ ہی کے اواخر میں مرکزِ عالمِ اسلام مدینہ منورہ سے کوفہ منتقل ہو گیا۔ پھر وہاں سے بھی دمشق اور بغداد کی جانب نقلِ مکانی ہوئی اور بالآخر انتہائی شمال یعنی قسطنطنیہ کو عالمِ اسلام کے 'دارالخلافہ' کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس طرح بیت اللہ کم از کم اغیار واعداء کی دست بُرد سے ہمیشہ محفوظ رہا۔ (یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کے تقدس پر دو ایک مرتبہ خود ان لوگوں کے ہاتھوں کسی قدر آنچ آئی جو اپنے آپ کو مسلمان کہلواتے تھے!)

۶۵) یعنی تمہیں گروہوں میں تقسیم کردے اور پھر چکھائے ایک کو دوسرے کی جنگی قوت کا مزہ! چنانچہ اس صدی کے آغاز میں عربوں کے ہاتھوں ترکوں کا خون بہا اور پھر ۱۷ء میں بنگالی مسلمان کے ہاتھوں غیر بنگالی مسلمان کے خون کی ہولی اور جان و مال اور عزت و آبرو کی دھجیاں بکھرنے کا منظر چشمِ فلک نے دیکھا۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار۔**

بہرحال ہمارے نزدیک اُمیّیّن کے لئے ۶۷ء کی ذلت اور اٰخَرِین کے ایک اہم حصے کے لئے ۷۱ء کی رسوائی کو امتِ مُسلمہ کے زوال وانحطاط کی آخری حد کی حیثیت حاصل ہے اور اگرچہ ﴿وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا﴾ [1] کی مستقل وعید اب بھی موجود ہے۔ تاہم کیا عجب کہ اب ﴿عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ﴾ ہی کی شان کا ظہور ہو اور کلنک کا کوئی اور ٹیکہ امتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی پیشانی پر نہ لگے، اگرچہ اس کا تمام تر دار و مدار امت کی اپنی اصلاح پر ہے [2]

بقول جگر مرادآبادی مرحوم

چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

---

(۱) سورۃ بنی اسرائیل آیت ۸: ''بعید نہیں کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے لیکن اگر تم نے پھر وہی کچھ کیا تو ہم بھی دوبارہ وہی کچھ کریں گے''

(۲) افسوس کہ یہ امید صحیح ثابت نہیں ہوئی (۱۹۹۱ء)

موجودہ احیائی مساعی کا اجمالی جائزہ
اور
تنظیمِ اسلامی کا محل ومقام

جہاں تک تجدیدی مساعی کا تعلق ہے واقعہ یہ ہے کہ تاریخِ اسلام کا کوئی دور بھی ان سے بالکل خالی نہیں رہا اور ہر زمانے اور ہر ملک میں ایسے اولوالعزم لوگ پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اپنے حالات کے تقاضوں کے مطابق اصلاحی اور تجدیدی کارنامے سرانجام دیئے۔ لیکن بیسویں صدی عیسوی سے قبل کی ایسی تمام کوششوں کے بارے میں ایک اصولی بات پیش نظر رہنی چاہئے اور وہ یہ کہ ان کی اصل نوعیت 'احیاءِ دین' کی نہیں بلکہ حفاظت ومدافعتِ دین کی تھی۔ اس لئے کہ ابھی اسلام کا قصرِ عظیم بالکل زمین بوس نہیں ہوا تھا اور خواہ دین کی حقیقی روح کتنی ہی مضمحل اور پژمردہ ہو چکی ہو بہر حال اسلام نے جو تہذیبی اور عمرانی نظام دنیا میں قائم کیا تھا اس کا ڈھانچہ برقرار (Intact) تھا حتیٰ کہ شریعتِ اسلامی تمام مسلمان ممالک میں بالفعل نافذ تھی۔ چنانچہ تمام تجدیدی مساعی کا اصل ہدف یہ رہا کہ دین کا نظامِ عقائد واعمال محفوظ اور اپنی اصل صورت میں قائم رہے اور خارجی وبیرونی اثرات دین کو مسخ نہ کر دیں۔

یہی وجہ ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے دور تک کے تمام مجدّدینِ امت علیہم الرحمۃ کی مساعی اکثر وبیشتر علم وفکر کے میدان ہی تک محدود رہیں اور عقائد ونظریات کی تصحیح واصلاح ہی کو ان کے اصل ہدف کی حیثیت حاصل رہی۔ اور اس سے آگے اگر قدم بڑھا بھی تو زیادہ سے زیادہ اصلاحِ اخلاق واعمال، تزکیہ نفس اور تربیتِ روحانی تک۔ اس سے آگے بڑھ کر گزشتہ صدی سے قبل کسی بھی مجددِ دین کی مساعی نے سیاسی یا عسکری تحریک کی صورت اختیار نہیں کی۔ (۱)

(۱) اس کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ نبی اکرم ﷺ نے مسلمان حکمرانوں کے خلاف ''خروج''، یعنی مسلح بغاوت پر نہایت سخت بندشیں عائد فرمادی تھیں اور جب تک ان کے ہاتھوں شریعتِ اسلامی کا نفاذ ہو رہا تھا اور کسی ''کفرِ بواح''، یعنی کھلے اور صریح کفر کی ترویج وتنفیذ نہیں ہوتی تھی ان کے ذاتی فسق وفجور اور ظلم وجور کے باوجود ان کے خلاف مسلح بغاوت ممکن نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی یہ صورتحال تبدیل ہوئی اور حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر غیر مسلم اقوام کے ہاتھوں میں آئی دفعتہً ان مساعی میں عسکریت بھی پیدا ہوگئی جس کی نہایت شاندار اور تابناک مثال خانوادۂ ولی اللّٰہی ہی کے زیر اثر برپا ہونے والی تحریک شہیدینؒ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کو سابق مجددین کا تجدیدی کام ''جزوی'' نظر آتا ہے اور انہیں حیرت ہوتی ہے کہ امتِ مسلمہ کی چودہ سوسالہ تاریخ میں کوئی ایک بھی ''مجددِ کامل'' پیدا نہیں ہوا۔

حالانکہ بات بالکل واضح اور سیدھی ہے کہ ابھی عمارت بالکل منہدم ہوئی ہی نہ تھی کہ بالکل نئی تعمیر کی حاجت ہوتی بلکہ صرف شکستہ اور بوسیدہ ہوئی تھی اور ضرورت ہی صرف جزوی اصلاح واستحکام کی تھی۔

یہ تو، جیسا کہ ہم مفصل عرض کر چکے ہیں اس بیسویں صدی کے آغاز میں ہوا کہ ملتِ اسلامی کا بوسیدہ قصر گویا دفعتہً زمین پر آ رہا اور اسلام اور مسلمان دونوں اپنے زوال وانحطاط کی آخری حدوں کو پہنچ گئے اور ایک طرف کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود مسلمانوں کی حالت حدیثِ نبوی ﷺ کے الفاظ کے مطابق غثاءالسیل یعنی سیلاب کے جھاگ سے زیادہ نہ رہی اور دوسری طرف اسلام اور قرآن دونوں بھی آنحضور ﷺ کے الفاظ کے مطابق اس حال کو پہنچ گئے کہ لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُہٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْآنِ اِلَّا رَسْمُہٗ [1] لہٰذا قانونِ فطرت کے عین مطابق احیاء کا ہمہ جہتی عمل شروع ہو گیا۔

اس احیائی عمل کے بارے میں بھی بعض بنیادی حقائق ذہن نشین رہنے چاہئیں مثلاً ایک یہ کہ یہ کوئی سادہ اور بسیط عمل نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد گوشے ہیں، جن میں سے ہر ایک میں اولوالعزم افراد اور جماعتیں برسرِ کار ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے جدا اور مختلف بلکہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے متضاد ہونے کے باوجود اس وسیع تر احیائی عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے لئے باعثِ تقویت ہیں۔ دوسرے یہ کہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور ملتِ اسلامی کی تجدید کا یہ کام دس بیس برس میں مکمل ہونے والا نہیں ہے بلکہ ﴿لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾ [2] کے مصداق درجہ بدرجہ بہت سے مراتب ومراحل سے گزر کر ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے گا، لہٰذا اس ارتقائی عمل کا ہر درجہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے اور چاہے بعد کے مراحل سے گزر کر پہلوں کا کام بہت حقیر بلکہ کسی قدر غلط بھی نظر آئے، اپنے اپنے دور کے اعتبار سے اس کی اہمیت ووقعت سے بالکلیہ انکار ممکن نہیں۔ تیسرے یہ کہ اس ہمہ گیر تجدیدی جدوجہد میں اگرچہ افراد کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے [3] تاہم جماعتوں اور تنظیموں کے مقابلے میں کم تر ہے۔ پھر جماعتیں بھی تحریکوں کی وسعت میں گم ہو جاتی ہیں اور بالآخر تمام تحریکیں بھی اس

---

(۱) ''ایک زمانہ وہ آئے گا کہ اسلام میں سے سوائے اس کے نام کے کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے بھی سوائے اس کے رسم الخط کے اور کچھ نہ بچے گا۔'' (مشکوٰۃ شریف، کتاب العلم)

(۲) سورۃ الانشقاق آیت ۱۹: ''تم لازماً چڑھو گے سیڑھی بہ سیڑھی''

(۳) افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا (اقبالؔ)

وسیع احیائی عمل کی پہنائیوں میں گم ہو جاتی ہیں جوان سب کو محیط ہے۔

ماضی میں ان حقائق کے پیش نظر نہ رہنے کے باعث بہت سے لوگوں کے دلوں میں ''مہدیٔ موعود'' یا ''مجدد کامل'' بننے کا شوق پیدا ہوتا رہا ہے جس کے نتیجے میں طرح طرح کے فتنے اٹھتے رہے ہیں اور اچھی بھلی تعمیری کوششوں کا رخ تخریب کی جانب مڑ جاتا رہا ہے!

اس احیائی عمل کا اولین مرحلہ مسلمان اقوام کا مغربی استعمار کے براہ راست تسلط سے نجات کا حصول تھا جو بحمد للہ گزشتہ تیس چالیس سال کے دوران تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ اور اگرچہ اب بھی ہم مغرب کی علمی وفکری اور تہذیبی وثقافتی غلامی میں مبتلا ہیں اور اقوام مغرب کی سائنسی وتکنیکی بالادستی کے باعث بہت سے پہلوؤں سے ان کے دست نگر بھی ہیں، تاہم خدا کا شکر ہے کہ ایک قضیۂ فلسطین سے قطع نظر اور صرف کشمیر اور اریٹیریا کے علاوہ پورے کرۂ ارضی پر مسلم اکثریت کا کوئی علاقہ براہِ راست غلامی ومحکومی کی لعنت میں گرفتار نہیں رہا۔

خالص اصولی ونظریاتی اور تصوریت پسندانہ (Idealistic) نقطۂ نظر سے تو ''مسلمان اقوام'' کی اصطلاح ہی قطعاً غلط ہے۔ اس لئے کہ از روئے قرآن وحدیث مسلمانوں کی حیثیت ایک جماعت یا امت یا حزب کی ہے نہ کہ قوم کی۔ اور وہ ایک ناقابلِ تقسیم 'وحدتِ ملی' میں منسلک ہیں جس میں تعدد وتکثر کا امکان ہی موجود نہیں کہ اقوام کا لفظ صحیح قرار دیا جا سکے۔ لیکن واقعیت پسندانہ (Realistic) نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک جماعت یا امت یا حزب کا کردار (Role) تو بہت پہلے ترک کر دیا تھا اور بالفعل ایک قوم ہی کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ البتہ وحدتِ ملی کا تصور اس صدی کے آغاز تک برقرار تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، اس صدی کے رُبع اول کے دوران مغربی استعمار کے ہتھکنڈوں نے اسے بھی ختم کر کے رکھ دیا تھا اور اس وقت فی الواقع روئے ارضی پر کوئی ایک 'امتِ مسلمہ' آباد نہیں ہے بلکہ بہت سی مسلمان اقوام آباد ہیں۔

اسی طرح خالص تصوریت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بقول ''نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے'' کے مصداق مسلمانوں کی آزادی اور خود مختاری کا احیائے اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن واقعیت پسندانہ نگاہ سے دیکھئے تو مستقبل کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی علمبرداری کی سعادت کسی بالکل ہی نئی قوم کے حوالے فرما دے اور ﴿يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ کی شان دوبارہ ظاہر ہو۔ لیکن بحالاتِ موجود بقول ''کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے'' کے مصداق اسلام کا

مستقبل موجودہ مسلمان اقوام ہی کے ساتھ وابستہ ہے۔اور دونوں باہم لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اندریں حالات، مسلمان اقوام کا آزادی وخوداختیاری کی نعمت سے ہمکنار ہونا یقیناً احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ مشکل مرحلہ سر ہوا ہے ان کی سعی بھی اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہی کی جدوجہد کا جزو قرار پائے گی۔ رہا یہ شبہ کہ ان میں سے اکثر کے قائدین اور زعماء کا دین و مذہب کے ساتھ کوئی واقعی اور عملی تعلق نہ تھا تو اسی کا جواب ہے نبی اکرم ﷺ کے ان الفاظ مبارکہ میں کہ اِنَّ اللّٰہَ یُؤَیِّدُ الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ (بخاری: کتاب الجہاد) (اللہ اس دین کی تائید فاجر شخص کے ذریعہ بھی فرما دیتا ہے) واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے کام بہت نرالے ہیں اور اس کی تدبیریں بہت لطیف اور مخفی اور اس کے منصوبے بہت طویل الذیل اور وسیع الاطراف ہوتے ہیں اور وہ بسا اوقات فساق وفجار سے اپنے دین کی خدمت لے لیتا ہے۔﴿وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾

اس ضمن میں ایک اور حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ اگرچہ مختلف مسلمان ممالک میں حصولِ آزادی کی تحریکوں کی تقویت کے لئے جن علاقائی یا نسلی عصبیتوں کو استعمال (Invoke) کیا گیا، انہیں بھی خاص اصولی اور نظری اعتبار سے اسلام کے نظامِ فکر کے ساتھ سوائے تبایُن وتضاد کے اور کوئی نسبت حاصل نہیں ہے، لیکن عالمِ واقع میں اس کے سوائے کوئی چارہ کار موجود نہ تھا۔ اس لئے کہ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا ذہنی وقلبی رشتہ اتنا قوی نہ رہا تھا کہ اسے کسی جاندار اور فعال تحریک کی اساس بنایا جا سکتا اور حصولِ استقلال کے لئے جس مؤثر مزاحمت (Effective Resistance) کی ضرورت ہوتی ہے اس کی بنیاد خیالی یا جذباتی نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی اساسات (Concrete Grounds) ہی پر رکھی جا سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ترک نیشنلزم کا جذبہ فوری طور پر بیدار نہ ہو گیا ہوتا تو شاید آج ترکی کا نام ونشان بھی صفحۂ ہستی پر موجود نہ ہوتا۔ اسی طرح اسلام سے جتنا کچھ حقیقی اور واقعی تعلق اس وقت مسلمانانِ عرب کو ہے وہ کسے معلوم نہیں، اندریں حالات عرب نیشنلزم ہی یورپی سامراج کے چنگل سے نکلنے کی جدوجہد کے لئے واحد موجود (The Only Available) بنیاد بن سکتا تھا اور ایک وقتی ضرورت اور دفاعی تدبیر کی حد تک اس کے استعمال میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے، بشرطیکہ اسے نظامِ فکر کی مستقل اساس کے طور پر قبول نہ کر لیا جائے اور حصولِ آزادی کے عبوری مقصد کی تکمیل کے بعد صحیح اسلامی فکر اور وحدتِ ملی کے شعور واحساس کو اجاگر کیا جائے۔

اس پس منظر میں دیکھئے تو تحریکِ پاکستان کا معاملہ بالکل منفرد نظر آتا ہے۔ برصغیر کے مسلمان بھی اگر

برطانوی استعمار سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہندی قومیت کی اساس پر غیر مسلموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرتے تو اس کے لئے بھی وجہ جواز موجود تھی۔ (۱) لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم ہے کہ یہاں کے مخصوص حالات کے باعث مسلمانانِ ہند نے اپنی سیاسی جدوجہد کا آغاز ہی ''مسلم قومیت'' کی اساس پر کیا جس کے نتیجے میں وہ ملک وجود میں آیا جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی طرح جو اپنا نام ''سلمان ابن اسلام'' بتایا کرتے تھے، صرف اور صرف 'فرزندِ اسلام' قرار دیا جاسکتا ہے اور جس کے قیام اور بقا کے لئے کوئی وجہ جواز سوائے اسلام کے موجود نہیں ہے۔ گویا پاکستان ع ''خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ؐ'' کے مصداق اپنی پیدائش (Genesis) اور ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے تمام مسلمان ممالک سے ایک قدم آگے ہے اور دوسروں کو ع ''قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم'' کا جو کٹھن مرحلہ ابھی طے کرنا ہے وہ کم ازکم اصولی اور نظری اعتبار سے یہاں پہلے ہی سے طے شدہ ہے۔

مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدوجہد کو اس رخ پر ڈالنے والے اسباب وعوامل میں سلبی ومنفی طور پر سب سے زیادہ دخل ہندوؤں کی روایتی تنگ نظری اور تنگ دلی اور اس سے بھی بڑھ کر مسلمانوں سے اپنی ''ہزار سالہ شکست کا انتقام'' لینے کے اس جذبے کو حاصل ہے جو ان کے سینوں میں کھولتے ہوئے لاوے کی طرح پک رہا تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو گویا ان کا یہ طرزِ عمل بھی اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے ممد ومعاون بن گیا اور ہم اپنے سابق ابنائے وطن کی خدمت میں بجا طور پر عرض کرسکتے ہیں کہ

تو نے اچھا ہی کیا دوست سہارا نہ دیا
مجھ کو لغزش کی ضرورت تھی سنبھلنے کے لئے

مثبت اسباب کے ضمن میں ایک تو یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ مسلمانانِ ہند کے دلوں میں پہلے بھی جذبہ ملی باقی تمام دنیا کے مسلمانوں سے زیادہ تھا۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تنسیخِ خلافت (Abolition of Caliphate) پر جس قدر شدید ردعمل یہاں ظاہر ہوا اس کا عُشرِ عشیر بھی کہیں اور نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ ایک وقت تھا کہ برصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں سب کی مشترک سیاسی جدوجہد کا عنوان ہی 'تحریک خلافت' بن گئی تھی۔ اور دوسرے یہ کہ اس خطے میں علامہ اقبال مرحوم ایسی عظیم شخصیت پیدا ہوئی

---

(۱) چنانچہ جمعیت علمائے ہند کی سیاسی جدوجہد اسی اصول پر مبنی تھی، بلکہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خودنوشت سوانح 'نقشِ حیات' میں تو ثابت کیا ہے کہ خود مجاہدِ کبیر حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ مسلمانانِ پنجاب کو 'سکھا شاہی' سے نجات دلانے کے بعد اسی اساس پر انگریزوں کے خلاف تحریک چلانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

جس کی انتہائی پُر درد و پُر تاثیر حُدی خوانی نے قافلۂ ملی کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا اور مسلمانانِ ہند کو جذبۂ ملی سے سرشار کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ پوری امتِ مسلمہ پر علامہ مرحوم کا ایک بہت بڑا احسان ہے اور بلاشبہ ان کی ملی شاعری کو اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور تجدید و احیائے دین کی وسیع الاطراف جدوجہد میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

اور اس پس منظر (Context) میں دیکھا جائے تو عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس کا پاکستان اور خاص طور پر اس شہر لاہور میں انعقاد بہت معنی[1] خیز ہے، جہاں قریباً ثلث صدی قبل قرارداد پاکستان بھی منظور ہوئی تھی اور جہاں دورِ حاضر میں قافلۂ ملتِ اسلامیہ کا وہ سب سے بڑا حدی خواں بھی مدفون ہے جو آخری دم تک یہ صدا لگاتا رہا کہ ؎

بیا تا کارِ ایں امت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر
دِلے در سینۂ ملا گدازیم

اس ہمہ جہتی احیائی عمل کا دوسرا اہم گوشہ وہ ہے جس میں علمائے کرام کی مختلف جماعتیں اور تنظیمیں سرگرم کار اور اپنے اپنے مخصوص انداز میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں مصروف و مشغول ہیں۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی برصغیر ہند و پاک کو پورے عالمِ اسلام میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے چنانچہ علماء دین کو جس قدر اثر (Hold) یہاں کے مسلمان عوام پر حاصل ہے وہ دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آتا اور راسخ العقیدہ اسلام (Orthodox Islam) جتنی مضبوط جڑیں یہاں رکھتا ہے کہیں اور نہیں رکھتا۔[2] حتیٰ کہ جزیرہ نمائے عرب بھی، جہاں اس صدی کے وسط تک محمد ابن عبدالوہابؒ کی تجدیدی مساعی کے گہرے اثرات قائم رہے ہیں اب اس معاملے میں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔

اس کی وجہ بھی بادنیٰ تامل سمجھ میں آجاتی ہے اور وہ یہ کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ایسی جامع

(۱) خیال رہے کہ یہ مضمون اکتوبر ۷۴ء میں لکھا گیا تھا۔

(۲) ۶۰ء میں جو ایجی ٹیشن ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی کتاب "Islam" کے خلاف ہوا تھا اور اب جو تازہ 'معجزہ' قادیانی مسئلے کے حل کی صورت میں صادر ہوا ہے وہ اس کے منہ بولتے ثبوت ہیں۔

شخصیت گزشتہ تین سوسالوں کے دوران میں پورے عالمِ اسلام میں پیدا نہیں ہوئی اورانہوں نے مسلمانوں کی توجہ علمِ دین کے اصل سرچشموں یعنی قرآن اور حدیث کی جانب منعطف کرانے کے ساتھ ساتھ فکرِ اسلامی کی تدوینِ نو کا جو عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں دین اور رجال دین کی ساکھ ازسرنو مضبوط ہوگئی۔

اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ علماء دین کی مساعی میں اصل زور (Emphasis) دورحاضر میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور تجدید واحیائے دین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے دین کے نظامِ عقائد واعمال کی حفاظت ومدافعت ہی پر ہے۔اس طرح گویا ظاہری اعتبار سے ان کی خدمات کو سابق مجددینِ اسلام کی مساعی کیساتھ ایک نوع کے تسلسل کی نسبت حاصل ہے۔اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے بعض اہم فرق بھی ہیں۔مثلاً ایک یہ کہ جب سے اجتہاد کا دروازہ بند ہوا اور تقلیدِ جامد کا دور دورہ ہوا اور تشتت وانتشار اور فرقہ پرستی وگروہ بندی نے پاؤں جمالئے، ہر فرقے کے علماءِ کرام دین کے نظامِ عقائد واعمال کی خاص اسی صورت کی حفاظت ومدافعت پر ساراز ورصرف کررہے ہیں جوان کے مخصوص فرقے یا گروہ کے نزدیک معتبر ومستند ہے،جس سے فرقہ بندی کی جڑیں مضبوط تر ہوتی چلی جارہی ہیں۔دوسرے چونکہ انہوں نے علومِ جدیدہ اور دورِحاضر کے افکار ونظریات کا مطالعہ اس طرح براہِ راست اور بالاستیعاب نہیں کیا جس طرح اپنے اپنے دور میں امام غزالی اور امام ابن تیمیہ رحمہما اللہ نے کیا تھا لہٰذا وہ دورِحاضر میں حفاظت ومدافعتِ دین کے اصل تقاضوں کو بھی صحیح طور پر پورا کرنے سے قاصر ہیں۔

لہٰذا دورحاضر میں علماءِ دین کی حیثیت دین کے جہاز کو آگے بڑھانے والی قوت فراہم کرنے والے انجن کی تو نہیں ہے البتہ کم ازکم برصغیر پاک وہند کی حد تک ایک ایسے بھاری لنگر کی ضرور ہے جو اس کشتی کو غلط رخ پر بڑھنے سے روکنے کی خدمت بہرحال سرانجام دے سکتا ہے۔اور فی زمانہ یہ بھی ایک اہم خدمت ہے۔

برصغیر میں اس سلسلے میں ایک اہم مقام اور مرتبہ دیوبندی مکتب فکر کو حاصل ہے جو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے 'فکر' کا نہ سہی 'علم' کا وارث ضرور ہے۔اور جس کی کوکھ سے دینی مدرسوں اور دارالعلوموں کے ایک عظیم سلسلے کے علاوہ ایک عظیم تحریک بھی برآمد ہوئی ہے جس نے راسخ العقیدہ اسلام کی جڑوں کی آبیاری کے ساتھ ساتھ توجہات کو حقائقِ ایمانی پر مرتکز (Focus) کر دیا اور جس کے زیر اثر کم ازکم ایسے لوگ ضرور دین سے قریب ہورہے ہیں جن کے اذہان فکری ونظری اشکالات سے خالی ہوتے ہیں اور جن کے قلوب میں نیکی کا ایک جذبہ خواہ نیم خوابیدہ حالت ہی میں سہی بہرحال موجود ضرور ہوتا ہے۔ہماری مراد

جماعتِ تبلیغی سے ہے جس نے اس دور میں دین و مذہب کے نام پر ایک عظیم حرکت عالمِ اسلام ہی نہیں دیارِ غیر میں بھی برپا کر دی ہے اور جس کے زیر اثر عوامی سطح ہی پر سہی بہر حال 'تجدیدِ ایمان' کی ایک تحریک بالفعل برپا ہوگئی ہے اور جسے بلاشبہ زیر بحث 'ہمہ جہتی احیائی عمل' میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

اس 'ہمہ جہتی احیائی عمل' کا تیسرا اور اہم ترین گوشہ وہ ہے جس میں وہ جماعتیں اور تنظیمیں برسر کار ہیں جو قائم ہی خالص احیائی مقاصد کے تحت ہوئیں اور جنہیں اب اس احیائی عمل کے اعتبار سے گویا مقدمۃ الجیش کی حیثیت حاصل ہے۔ مختلف مسلمان ممالک میں ایسی جماعتیں اور تنظیمیں مختلف ناموں کے تحت کام کرتی رہی ہیں لیکن ؎ ''ہے ایک ہی جذبہ کہیں واضح کہیں مبہم'' اور ''ہے ایک ہی نغمہ کہیں اونچا کہیں مدھم'' کے مصداق ان کی حیثیت ایک ہی تحریک کے تحت کام کرنے والی مختلف تنظیمی ہیئتوں کی ہے۔

ان جماعتوں میں سے اگرچہ ایک دور میں جوش اور جذبے کی شدت اور اثر و نفوذ کی وسعت کے اعتبار سے مصر کی 'الاخوان المسلمون' توجہات اور امیدوں کا مرکز بن گئی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ احیائی عمل کے اس گوشے میں بھی اصل اہمیت برصغیر ہند و پاک ہی کو حاصل ہے۔

برصغیر میں اس تحریکِ احیائے دین کے مؤسس اولین اور داعیٔ اول کی حیثیت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو حاصل ہے جنہوں نے اس صدی کے بالکل اوائل میں 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے ''حکومت الٰہیہ'' کے قیام اور اس کے لئے ایک ''حزب اللہ'' کی تاسیس کی پُر زور دعوت پیش کی۔ مولانا کے مخصوص طرزِ نگارش اور اندازِ خطابت نے خصوصاً تحریکِ خلافت کے دوران میں ان کی شہرت کو برصغیر کے طول و عرض میں پھیلایا اور ان کی دعوت نے لاکھوں مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ لیکن اس کے بعد خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس سبب سے انہوں نے اس عظیم مشن کو خیر باد کہہ کر انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی اور باقی پوری زندگی پوری یکسوئی اور کمال مستقل مزاجی کے ساتھ ہندوستان کی نیشنلسٹ سیاست کی نذر کر دی۔

مولانا کی زندگی کے اس عظیم انقلاب کے ممکن اسباب میں ان کی حد سے بڑھی ہوئی ذہانت کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے کہ ع ''اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی!'' مولانا بلاشبہ عبقری تھے اور عبقری انسان زیادہ عملی نہیں ہوا کرتے۔ اس کا کچھ سراغ ان کے اس جملے میں بھی ملتا ہے کہ ''ہم بیک وقت گلیمِ زہد اور ردائے رندی اوڑھنے کے جرم کے مرتکب ہیں۔'' اور ایک خیال جو زیادہ قرینِ قیاس ہے یہ بھی ہے کہ مولانا کی حیثیت ایک سکہ بند اور مسلّم عالم دین کی نہ تھی اور اس وقت تک مسلمانانِ ہند پر علماء کی گرفت بہت مضبوط تھی لہٰذا مولانا کو گویا راستہ بند نظر آیا۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو پروفیسر یوسف سلیم چشتی

صاحب کے ذریعے ہم تک پہنچی اور جس کا حاصل یہ ہے کہ آٹھ سال کے عرصے میں (۱) اپنے پیش نظر مقصد کے لئے تمہیدی مراحل کی تکمیل کے بعد اپریل ۱۹۲۰ء میں مولانا نے دہلی میں منعقدہ جمعیت علمائے ہند کی کانفرس میں مفتی کفایت اللہؒ مرحوم اور مولانا احمد سعیدؒ مرحوم کے تعاون سے اگلا قدم اٹھانے کی سکیم بنائی۔ چنانچہ پہلے خود انہوں نے تقریر کی اور اپنے جوشِ خطابت سے حاضرین کے جذبہ عمل کو ابھارا ہی نہیں للکارا بھی اور پھر مولانا احمد سعیدؒ صاحب نے تقریر کی کہ حضرت شیخ الہندؒ کی رحلت کے بعد سے مسلمانانِ ہند کی قیادت کی مسند خالی ہے۔ اور اب جو مرحلہ درپیش ہے اس میں 'شیخ الہند' سے بھی بڑھ کر 'امام الہند' کی ضرورت ہے۔ اب غور کرو اور اس کے لئے کسی موزوں شخص کو تلاش کر کے اس کے ہاتھ پر بیعت کرو اور جدوجہد کا آغاز کر دو۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی مطلوب تھا۔ چنانچہ علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیریؒ اٹھے اور انہوں نے براہِ راست مولانا آزادؒ کو خطاب کر کے ان الفاظ سے اپنی تقریر کا آغاز کیا کہ ''ایاز قدرِ خود بشناس!'' جس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پوری تقریر میں کیا کچھ ہوگا۔ بہرحال اس سے دل شکستہ اور دلبرداشتہ ہو کر مولانا اس کام ہی سے دست کش ہو گئے اور اس کے فوراً بعد ہی انہوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی۔ (۲)

اس طرح مولانا ابوالکلام آزادؒ مرحوم تو میدان چھوڑ گئے لیکن ان کی زوردار دعوت کی گھن گرج سے مسلم انڈیا کی فضائیں دیر تک گونجتی رہیں۔ اور پھر کم وبیش دس ہی سال بعد ایک باہمت نوجوان (۳) نے مولانا کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کے ترک کردہ مشن کو اختیار کرنے کے عزمِ مصمم کے ساتھ ان کی تفسیر 'ترجمان القرآن' ہی کے ہم نام ماہنامے کی ادارت سنبھالی اور اس کے ذریعے اسی 'حکومت الٰہیہ' کے قیام کا نصب العین اور ''تجدید واحیائے دین'' کی سعی کا ایک نقشہ مسلمانانِ ہند کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔

اس نوجوان میں مولاناؒ مرحوم کی بہ نسبت جوش کم تھا، ہوش زیادہ، ذہانت وفطانت قدرے کم تھی لیکن اسی نسبت سے محنت ومشقت کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ لہٰذا اس نے پہلے چھ سات برس تک پورے صبر واستقلال کے ساتھ خالص انفرادی طور پر کام جاری رکھا۔ کچھ عرصہ 'دارالاسلام' کے نام سے ایک ادارے کے تحت کام کیا اور بالآخر ۴۱ء میں 'جماعت اسلامی' کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھ دی اور

(۱) 'الہلال' کا اجراء ۱۹۱۲ء میں ہوا تھا۔

(۲) اس موضوع پر تفصیلی بحث ہماری تالیف ''جماعتِ شیخ الہندؒ اور تنظیمِ اسلامی'' میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، مؤسس جماعتِ اسلامی

ایک منظّم جدوجہد کا آغاز کر دیا۔

جماعت کے قیام سے قبل اس نوجوان نے پہلے انڈین نیشنل کانگریس میں شامل یا اس کے حلیف علماء کے موقف پر شدید تنقید کی اور اپنے زورِ استدلال سے ان کے طریقِ کار کا انجامِ کار کے اعتبار سے اسلام اور مسلمان دونوں کے حق میں سخت مضر ہونا ثابت کر دیا۔ پھر مسلمانوں کی قومی سیاست پر مدلل تنقید کی اور اسلام کے بلند ترین تصوریت پسندانہ موقف کے تقابل سے اس کا 'خلافِ اسلام' ہونا ثابت کیا اور خود اسی بلند ترین تصوریت پسندانہ سطح (Highest Idealistic Level) پر اپنی جماعت کی اساس رکھ دی۔

چنانچہ جماعت اسلامی کے اساسی موقف کا خلاصہ یہ قرار پایا کہ:

١۔ اسلام مذہب نہیں دین ہے اور اس کی اصل حیثیت ایک کامل نظریۂ حیات اور مکمل نظامِ زندگی کی ہے جو اپنی عین فطرت کے تقاضے کے طور پر اپنا کُلّی نفاذ اور کامل غلبہ چاہتا ہے۔

٢۔ عبادت صرف مراسمِ عبودیت کا نام نہیں، بلکہ اس نظام کی کُلّی اطاعت کا نام ہے۔

٣۔ مسلمان قوم نہیں، امت مسلمہ اور حزب اللہ ہیں اور ان کی اصل حیثیت ایک نظریاتی جماعت (Idealistic Party) کی ہے جس کا اولین مقصد اپنے نظریات کے مطابق انقلاب برپا کرنا اور اپنے نظامِ زندگی کو بالفعل قائم کرنا ہے۔

٤۔ دنیا کے موجودہ غیر مسلموں کی ایک عظیم اکثریت قانوناً تو کافر ہے لیکن حقیقتاً کافر نہیں۔ اس لئے کہ ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش ہی نہیں کی گئی کہ ان کے انکار یا رد کر دینے کا سوال پیدا ہو۔

٥۔ اسی طرح دنیا کے موجودہ مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت بھی صرف 'قانونی اور نسلی' مسلمانوں پر مشتمل ہے، نہ کہ حقیقی مسلمانوں پر۔ اس لئے کہ نہ ان کے قلوب واذہان میں اسلام کی نظریاتی واعتقادی اساسات راسخ ہیں، نہ ان کے عمل میں اسلامی قانون کی پابندی اور شریعت کا التزام ہی پایا جاتا ہے۔

٦۔ مسلمانوں کے قومی مفادات کے تحفظ اور ان کے سیاسی حقوق کی حفاظت یا ان کی آزادی اور خود اختیاری کے حصول کی جدوجہد کا اسلام کی نشاۃِ ثانیہ یا احیائے دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

٧۔ 'کرنے کا اصل کام' یہ ہے کہ اولاً...... بلا لحاظ مذہب وملت پوری نوعِ انسانی کو بندگیٔ رب کی طرف پکارا جائے اور اسلام کی نظریاتی اساسات کو شعوری طور پر قبول کرنے کی دعوت دی جائے اور...... پھر سابق غیر مسلموں یا نسلی مسلمانوں میں سے جنہیں بھی اللہ تعالیٰ اسلام کو شعوری طور پر قبول کرنے کی توفیق عطا فرمادے۔ ان کی قوتوں کو ایک ہیئت تنظیمی کے تحت مجتمع کر کے غلبۂ دینِ حق یا 'حکومتِ

الٰہیہ'[(۱)] کے قیام کی منظّم جدوجہد کی جائے۔

۸۔ اس جدوجہد میں اولین اہمیت علمی وفکری انقلاب کو حاصل ہے، پھر عملی واخلاقی تبدیلی اور معاشرتی اصلاح کو۔ نظامِ حکومت کی تبدیلی کا مرحلہ ان سب کے بعد آتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس موقف میں انتہا پسندی کی شدت تو موجود ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کا ٹھیٹھ نظریاتی اور اصولی موقف یہی ہے۔ اور دوسری احیائی مساعی کے ساتھ ساتھ اس خالص اصولی اساس پر کسی تحریک کا اٹھنا وقت کی اہم ضرورت تھی جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ہاتھوں پوری ہوئی اور ہم داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے اس پر کہ مولانا موصوف اور ان کے رفقائے کار حالات کی سخت نامساعدت کے علی الرغم اور ہر طرح کے طعن وطنز اور تمسخر واستہزاء کے باوجود مسلسل چھ سال اس موقف پر ڈٹے رہے۔ نتیجۃً عزیمت کی نہایت اعلیٰ مثالیں چشمِ فلک نے دیکھیں اور ع ''تاریخ دعوت وعزیمت'' میں ایک نہایت درخشاں باب کا اضافہ ہوگیا۔ اس طرح گویا وہ کام جسے احیائے اسلام کے 'راست اقدام' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور جس کا ابتدائی خاکہ (Blue Print) مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے تیار کیا تھا، عملاً مولانا مودودیؒ کے ہاتھوں شروع ہوا۔

لیکن افسوس کہ ع ''خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود!'' کے مصداق مولانا مودودیؒ اور جماعتِ اسلامی اس بلند وبالا موقف پر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے اور ۴۷ء میں جیسے ہی مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور پاکستان کے نام سے ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہوئی اور متعدد اسباب سے ایک توقع سی نظر آئی کہ یہاں اسلام کے نام پر ایک سیاسی تحریک چلائی جاسکتی ہے، انہوں نے اپنے اصولی موقف کو ترک کر کے بغیر اس کے کہ کوئی علمی وفکری انقلاب آیا ہو یا اخلاقی وعملی تبدیلی معاشرے میں برپا ہوئی ہو، نظامِ حکومت کی 'اصلاح' کے لئے عملی سیاسیات کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا وہ توقع تو موہوم سے موہوم تر ہوتی چلی گئی البتہ سیاست کی سنگلاخ وادی میں یہ تحریک ﴿وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ﴾ [(۲)] کے مصداق پست تر موقف اختیار کرنے پر مجبور ہوتی چلی گئی۔

پہلے خیال تھا کہ خالص اسلام کے نام اور محض اپنے زورِ بازو کے بل پر یہ مرحلہ سر ہوجائے گا لہٰذا اکمال

(۱) واضح رہے کہ جب جماعت اسلامی کے قیام کے کچھ عرصہ بعد مولانا اصلاحی کا قرآنی فکر بھی اس تحریک کے ساتھ آشامل ہوا تو 'حکومتِ الٰہیہ' کی اصطلاح سرے سے متروک ہوگئی اور اس کی جگہ 'شہادتِ حق' اور 'اقامتِ دین' کی خالص قرآنی اصطلاحوں نے لے لی۔

(۲) سورۃ الاعراف آیت ۱۷۶: ''لیکن وہ تو زمین ہی میں دھنس کر رہ گیا''

شانِ استغناء کے ساتھ دوسری سیاسی جماعتوں کی اشتراکِ عمل کی پیش کشوں کو ٹھکرا دیا گیا۔ جب پنجاب کے ۵۱ء کے الیکشن کے بعد یہ مغالطہ دور ہوا تو خیال ہوا کہ مذہب کے نام پر دوسری مذہبی جماعتوں کے تعاون سے یہ مہم سر کی جائے۔ پھر جب معلوم ہوا کہ یہ بھی ممکن نہیں اور چڑھائی اتنی سخت ہے کہ گاڑی اس سیکنڈ گیئر میں بھی آگے نہیں بڑھ سکتی تو گویا پہلا گیئر آزمایا گیا اور ایک درجہ اور نیچے اتر کر محض جمہوریت کے نام پر مذہبی ولادینی تمام عناصر کے ساتھ مل کر آگے بڑھنے کی کوشش کی گئی۔

سابق صدر ایوب مرحوم کا پورا گیارہ سالہ دورِ حکومت اسی ''بحالیٔ جمہوریت'' کی مہم کی نذر ہو گیا۔ لیکن جب ان کے اقتدار کی عمارت گری تو اس کے ملبے سے کچھ 'اور' ہی برآمد ہو گیا۔

ہمارے پیشِ نظر اس وقت نہ تو تاریخ نگاری ہے نہ ہی جماعتِ اسلامی کے مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی یا قیاس آرائی، نہ ہم اس وقت اس بحث ہی میں الجھنا چاہتے ہیں کہ مولانا مودودیؒ کے اس 'انقلابِ حال' کے اسباب کیا تھے (اس پر ہم اپنی تالیف ''تحریک جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' میں مفصل بحث بھی کر چکے ہیں) ہمیں اس معاملے کے جس پہلو سے اصل دلچسپی ہے وہ یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کے اس 'انتقالِ موقف' سے احیائے اسلام کے ہمہ جہتی عمل میں ٹھیٹھ اصولی اسلامی تحریک کی جگہ پھر خالی ہو گئی اور اس مہیب خلا کو پُر کرنے کی کوئی صورت تاحال پیدا نہیں ہوئی جو اپنے پیش رو مولانا آزاد اور ان کی جماعت حزب اللہ کی طرح مولانا مودودیؒ اور ان کی قائم کردہ جماعت اسلامی نے جیتے جی مرحوم ہو کر پیدا کیا ہے۔ چنانچہ اب اگرچہ سیاسی و قومی سطح پر بھی احیائی عمل جاری ہے اور علماء کرام کی سرگرمیاں بھی اپنے اپنے رنگ میں تیز سے تیز تر ہو گئی ہیں، احیائی عمل کا یہ تیسرا اور اہم ترین گوشہ ویران و سنسان پڑا ہے!

جماعتِ اسلامی کے موقف میں یہ تبدیلی اصولاً ۴۷ء ہی میں پیدا ہو گئی تھی لیکن کم و بیش دس سال یہ اپنی قوت کے زور میں بڑھتی چلی گئی اور اس تبدیلی کا احساس بھی لوگوں کو نہیں ہوا۔ لیکن ۵۶-۵۷ء میں جماعت میں اس احساس نے زور پکڑا اور طریق کار کے بارے میں ایک اختلافِ رائے ظاہر ہوا جس نے ایک ہنگامے کی صورت اختیار کر لی۔ نتیجۃً جماعت کے 'اکابر' کی اکثریت چند 'اصاغر' سمیت جماعت سے کٹ گئی۔ اُن 'اصاغر' میں سے ایک ان سطور کا راقم بھی ہے۔ بعد ازاں 'بڑے' تو اپنے اپنے 'بڑے' کاموں میں مشغول و مصروف ہو گئے لیکن یہ 'چھوٹا' ؎

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

کے مصداق اپنے دل ودماغ کو اس جنتِ گم گشتہ کے خیال سے فارغ نہ کرسکا، بلکہ جیسے جیسے دن بیتے اس کا حال یہ ہوتا چلا گیا کہ

ع تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے یہ الفت اور محکم ہو گئی

وہ جب جماعت سے علیحدہ ہوا اس کی عمر کُل پچیس برس تھی۔ بالکل نوعمری کا عالم، نہ علم نہ تجربہ، لٰہذا پورے دس برس اس نے اس انتظار میں بسر کئے کہ 'بڑوں' میں سے کوئی ہمت کرے اور ازسرِ نو سفر کا آغاز کر دے۔ لیکن اللہ کو یہ بھی منظور نہ ہوا تا آنکہ ۶۶-۶۷ء میں اس نے خود کمرِ ہمت کسی اور بفحوائے الفاظ قرآنی ﴿ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ ﴾ [1] درسِ قرآن کی صورت میں ٹھیٹھ اسلامی دعوت کے لئے ذہنی وفکری سطح پر میدان ہموار کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اس کے کام کو اللہ تعالیٰ نے شرفِ قبولیت عطا فرمایا اور چند ہی سالوں میں اس کے قائم کردہ 'حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن' کی کوکھ سے 'مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' برآمد ہوگئی اور اب اس کے بھی دو ہی سال بعد وہ اسی ٹھیٹھ اصولی اسلامی تحریک کے احیاء کے لئے ''تنظیمِ اسلامی'' کے قیام کا ارادہ کر رہا ہے۔

اسے خوب معلوم ہے کہ اس کے پاس نہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی سی عبقریت اور ذہانت وفطانت ہے، نہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی سی صلاحیتِ کار اور محنت ومشقت کا مادہ۔ پھر نہ وہ شعلہ بیان خطیب ہے نہ صاحب طرز ادیب، بااین ہمہ ایک احساسِ فرض ہے جو چین نہیں لینے دیتا اور ایک عظیم تحریک کی امانت کے بار کا احساسِ گراں ہے جس نے اسے ع 'ہر چہ بادا باد، ما کشتی درآب انداختیم'' کے مصداق اس پُرخطر وادی میں کود پڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔

---

(۱) ''یقیناً یہی قرآن ہے جو رہنمائی فرماتا ہے اس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی اور سب سے درست ہے۔'' عجب حسنِ اتفاق ہے کہ یہ الفاظ مبارکہ سورۃ بنی اسرائیل میں ان آیات کے فوراً بعد وارد ہوئے ہیں جو بنی اسرائیل اور امتِ مسلمہ کی تاریخ میں مماثلت ومشابہت کے بیان میں اس تحریر میں تفصیل کے ساتھ زیر بحث آچکی ہیں۔ مزید غور طلب نکتہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ کا ذکر شروع ہوا تورات کے ذکر سے ﴿وَاٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًی لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾ اور اس کا اختتام ہوا قرآن کے ذکر پر۔ گویا سابق امت کی تاسیس بھی کتاب ہی کی بنیاد پر ہوئی تھی اور اس کے معزول کئے جانے کے بعد نئی امتِ مسلمہ کی تاسیس بھی ''الکتٰب'' ہی کی بنیاد پر ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی 'تجدید' کے لئے بھی مبنیٰ و اساس قرآن کے سوا کوئی چیز نہیں بن سکتی

ع گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن (اقبالؔ)

اب جو لوگ شخصیتوں اور جماعتوں کی سطح سے بلند ہو کر سوچنے اور غور وفکر کرنے کی ہمت اور صلاحیت ہی سے عاری ہوں ان کا معاملہ تو دوسرا ہے، البتہ وہ لوگ جو کسی تحریک کے بنیادی نظریات ومقاصد پر نظر رکھتے ہوئے اپنے موقف پر نظرِ ثانی کی ہمت کر سکیں، ان کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ انہیں چاہئے کہ ٹھنڈے دل کے ساتھ ہمارے موقف پر غور کریں اور اگر انہیں اس میں صحت وصداقت نظر آئے تو ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہوں اور کمر ہمت کسیں! بہر حال اپنی حد تک ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ؎

دریں دریائے بے پایاں، دریں طوفانِ موج افزا
سر افگندیم، بسم اللہ مجرٖھا ومرسٰھا

❖❖❖

ضمیمہ (باب اول)

نزولِ قرآن سے قبل

تاریخ بنی اسرائیل کے چار دَور

(ماخوذ از تفہیم القرآن، تالیف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ)

بنی اسرائیل جب فلسطین میں داخل ہوئے تو ......انہوں نے اپنی کوئی متحدہ سلطنت قائم نہ کی۔ وہ قبائلی عصبیت میں مبتلا تھے۔ ان کے ہر قبیلے نے اس بات کو پسند کیا کہ مفتوح علاقے کا ایک حصہ لے کر الگ ہو جائے۔

۱۔ عروجِ اول: عہدِ زریں

آخر کار بنی اسرائیل کو ایک فرمانروا کے تحت اپنی ایک متحدہ سلطنت قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ان کی درخواست پر حضرت سموئیلؑ نبی نے ۱۰۲۰ قبل مسیح میں طالوت کو ان کا بادشاہ بنایا۔

اس متحدہ سلطنت کے تین فرمانروا ہوئے۔ طالوت (۱۰۲۰ تا ۱۰۰۴ ق م)، حضرت داؤد علیہ السلام (۱۰۰۴ تا ۹۶۵ ق م) اور حضرت سلیمان علیہ السلام (۹۶۵ تا ۹۲۶ ق م)۔ ان فرمانرواؤں نے اس کام کو مکمل کیا جسے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کے بعد نامکمل چھوڑ دیا تھا۔

۲۔ زوال اور عذاب کا پہلا دور

حضرت سلیمانؑ کے بعد بنی اسرائیل پر دنیا پرستی کا پھر شدید غلبہ ہوا اور انہوں نے آپس میں لڑ کر اپنی دو الگ سلطنتیں قائم کر لیں۔ شمالی فلسطین اور شرق اردن میں سلطنت اسرائیل، جس کا پایۂ تخت آخر کار سامریہ قرار پایا۔ اور جنوبی فلسطین اور ادوم کے علاقے میں سلطنت یہودیہ جس کا پایۂ تخت یروشلم رہا۔ ان دونوں سلطنتوں میں سخت رقابت اور کشمکش اول روز سے شروع ہوگئی اور آخر تک رہی۔

ان میں سے اسرائیلی ریاست کے فرمانروا اور باشندے ہمسایہ قوموں کے مشرکانہ عقائد اور اخلاقی فساد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور یہ حالت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ حضرت الیاس اور حضرت الیسع علیہما السلام نے اس سیلاب کو روکنے کی انتہائی کوشش کی مگر یہ قوم جس تنزل کی طرف جا رہی تھی

اس سے باز نہ آئی۔ آخر کار اللہ کا غضب اشوریوں کی شکل میں دولت اسرائیل کی طرف متوجہ ہوا اور نویں صدی قبل مسیح سے فلسطین پر اشوری فاتحین کے مسلسل حملے شروع ہوگئے۔ اس دور میں عاموس نبی (۷۸۷تا ۷۴۷ قبل مسیح) اور پھر ہوسیع نبی (۷۴۷ تا ۷۳۵ قبل مسیح) نے اٹھ کر اسرائیلیوں کو پے در پے تنبیہات کیں، مگر جس غفلت کے نشے میں وہ سرشار تھے وہ تنبیہہ کی ترشی سے اور زیادہ تیز ہوگیا۔ اس کے بعد کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ خدا کا عذاب اسرائیلی سلطنت اور اس کے باشندوں پر ٹوٹ پڑا۔ ۷۲۱ قبل مسیح میں اشور کے سخت گیر فرمانروا سارگون نے سامریہ کو فتح کر کے دولت اسرائیل کا خاتمہ کر دیا، ہزار ہا اسرائیلی تہ تیغ کئے گئے، ۲۷ ہزار سے زیادہ بااثر اسرائیلیوں کو ملک سے نکال کر اشوری سلطنت کے مشرقی اضلاع میں تتر بتر کر دیا گیا اور دوسرے علاقوں سے لا کر غیر قوموں کو اسرائیل کے علاقے میں بسایا گیا جن کے درمیان رہ بس کر بچا کھچا اسرائیلی عنصر بھی اپنی قومی تہذیب سے روز بروز زیادہ بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

بنی اسرائیل کی دوسری ریاست جو یہودیہ کے نام سے جنوبی فلسطین میں قائم ہوئی، وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بہت جلد ہی شرک اور بداخلاقی میں مبتلا ہوگئی مگر نسبتاً اس کا اعتقادی اور اخلاقی زوال دولتِ اسرائیلی کی بہ نسبت سست رفتار تھا، اس لئے اس کو مہلت بھی کچھ زیادہ دی گئی۔ پھر جب حضرت یسعیاہ اور حضرت یرمیاہ کی مسلسل کوششوں کے باوجود یہودیہ کے لوگ بت پرستی اور بداخلاقیوں سے باز نہ آئے تو ۵۹۸ قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے یروشلم سمیت پوری دولت یہودیہ کو مسخر کر لیا اور یہودیہ کا بادشاہ اس کے پاس قیدی بن کر رہا۔ یہودیوں کی بداعمالیوں کا سلسلہ اس پر بھی ختم نہ ہوا اور حضرت یرمیاہ کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے اعمال درست کرنے کے بجائے بابل کے خلاف بغاوت کر کے اپنی قسمت بدلنے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر ۵۸۷ قبل مسیح میں بخت نصر نے ایک سخت حملہ کر کے یہودیہ کے تمام بڑے چھوٹے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو اس طرح پیوند خاک کیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ کھڑی نہ رہی، یہودیوں کی بہت بڑی تعداد کو ان کے علاقے سے نکال کر ملک ملک میں تتر بتر کر دیا اور جو یہودی اپنے علاقے میں رہ گئے وہ بھی ہمسایہ قوموں کے ہاتھوں بری طرح ذلیل اور پامال ہو کر رہے۔ یہ تھا وہ پہلا فساد جس سے بنی اسرائیل کو متنبہ کیا گیا تھا اور یہ تھی وہ پہلی سزا جو اس کی پاداش میں ان کو دی گئی۔

جہاں تک سامریہ اور اسرئیل کے لوگوں کا تعلق ہے، وہ تو اخلاقی و اعتقادی زوال کی پستیوں میں گرنے کے بعد پھر نہ اٹھے، مگر یہودیہ کے باشندوں میں ایک طبقہ ایسا موجود تھا جو خیر پر قائم اور خیر کی دعوت

دینے والا تھا۔اس نے ان لوگوں میں بھی اصلاح کا کام جاری رکھا جو یہودیہ میں بچے کھچے رہ گئے تھے اور ان لوگوں کو بھی توبہ وانابت کی ترغیب دی جو بابل اور دوسرے علاقوں میں جلاوطن کردیئے گئے تھے۔آخر کار رحمت الٰہی ان کی مددگار ہوئی۔بابل کی سلطنت کو زوال ہوا۔۵۳۹ قبل مسیح میں ایرانی فاتح سائرس (خورس یا خسرو) نے بابل کو فتح کیا اور اس کے دوسرے ہی سال اس نے فرمان جاری کردیا کہ بنی اسرائیل کو اپنے وطن واپس جانے اور وہاں دوبارہ آباد ہونے کی عام اجازت ہے چنانچہ اس کے بعد یہودیوں کے قافلے پر قافلے یہودیہ کی طرف جانے شروع ہو گئے جن کا سلسلہ مدتوں جاری رہا۔آخر داریوس (دارا) اول نے ۵۲۲ ق م میں یہودیہ کے آخری بادشاہ کے پوتے زروبابل کو یہودیہ کا گورنر مقرر کیا اور اس نے حجی نبی، زکریا نبی اور سردار کاہن یشوع کی نگرانی میں ہیکل مقدس نئے سرے سے تعمیر کیا۔پھر ۴۵۸ ق م میں ایک جلاوطن گروہ کے ساتھ حضرت عزیر (عزرا) یہودیہ پہنچے۔

۳۔ عروجِ ثانی: دولتِ مکابی

حضرت عزیر نے دین موسوی کی تجدید کا بہت بڑا کام انجام دیا۔انہوں نے یہودی قوم کے تمام اہل خیر وصلاح کو ہر طرف سے جمع کر کے ایک مضبوط نظام قائم کیا۔بائبل کی کتب خمسہ کو جن میں تورات تھی، مرتب کر کے شائع کیا۔یہودیوں کی دینی تعلیم کا انتظام کیا، قوانین شریعت کو نافذ کر کے ان اعتقادی اور اخلاقی برائیوں کو دور کرنا شروع کیا جو بنی اسرائیل کے اندر غیر قوموں کے اثر سے گھس آئی تھیں، ان تمام مشرک عورتوں کو طلاق دلوائی جن سے یہودیوں نے بیاہ کر رکھے تھے اور بنی اسرائیل سے از سر نو خدا کی بندگی اور اس کے آئین کی پیروی کا میثاق لیا۔

ایرانی سلطنت کے زوال اور سکندر اعظم کی فتوحات اور پھر یونانیوں کے عروج سے یہودیوں کو کچھ مدت کے لئے ایک سخت دھکا لگا۔سکندر کی وفات کے بعد اس کی سلطنت جن تین سلطنتوں میں تقسیم ہوئی تھی، ان میں سے شام کا علاقہ اُس سلوقی سلطنت کے حصے میں آیا جس کا پایہ تخت انطاکیہ تھا اور اس کے فرمانروا انٹیوکس ثالث نے ۱۹۸ ق م میں فلسطین پر قبضہ کرلیا۔یہ یونانی فاتح، جو مذہباً مشرک اور اخلاقاً اباحیت پسند تھے، یہودی مذہب وتہذیب کو سخت ناگوار محسوس کرتے تھے۔انہوں نے اس کے مقابلے میں سیاسی اور معاشی دباؤ سے یونانی تہذیب کو فروغ دینا شروع کیا۔

۱۷۵ ق م میں انٹیوکس چہارم جب تخت نشین ہوا تو اس نے پوری جابرانہ طاقت سے کام لے کر یہودی مذہب وتہذیب کی بیخ کنی کرنی چاہی۔لیکن یہودی اس جبر سے مغلوب نہ ہوئے اور ان کے اندر

ایک زبردست تحریک اٹھی جو تاریخ میں مکابی بغاوت کے نام سے مشہور ہے۔ عام یہودیوں میں حضرت عزیر کی پھونکی ہوئی روحِ دینداری کا اتنا زبردست اثر تھا کہ وہ سب مکابیوں کے ساتھ ہوگئے اور آخر کار انہوں نے یونانیوں کو نکال کر اپنی ایک آزاد دینی ریاست قائم کر لی جو ۶۷ ق م تک قائم رہی۔ اس ریاست کے حدود پھیل کر رفتہ رفتہ اس پورے رقبے پر حاوی ہوگئے جو کبھی یہودیہ اور اسرئیل کی ریاستوں کے زیرنگیں تھے، بلکہ فلستیہ کا بھی ایک بڑا حصہ اس کے قبضے میں آ گیا جو حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں بھی مسخر نہ ہوا تھا۔

مکابیوں کی تحریک جس اخلاقی و دینی روح کے ساتھ اٹھی تھی وہ بتدریج فنا ہوتی چلی گئی اور اس کی جگہ خالص دنیا پرستی اور بے روح ظاہرداری نے لے لی۔ آخر کار ان کے درمیان پھوٹ پڑ گئی اور انہوں نے خود رومی فاتح پومپی کو فلسطین آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ پومپی ۶۳ ق م میں اس ملک کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے یہودیوں کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ انہوں نے فلسطین میں اپنے زیر سایہ ایک دیسی ریاست قائم کر دی جو بالآخر ۴۰ ق م میں ایک ہوشیار یہودی ہیرود نامی کے قبضے میں آئی۔ یہ شخص ہیرود اعظم کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی فرمانروائی پورے فلسطین اور شرق اردن پر ۴۰ سے ۴ قبل مسیح تک رہی۔ اس نے ایک طرف مذہبی پیشواؤں کی سرپرستی کر کے یہودیوں کو خوش رکھا اور دوسری طرف رومی تہذیب کو فروغ دے کر اور رومی سلطنت کی وفاداری کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کر کے قیصر کی بھی خوشنودی حاصل کی۔ اس زمانے میں یہودیوں کی دینی واخلاقی حالت گرتے گرتے زوال کی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔

ہیرود کے بعد اس کی ریاست تین حصوں میں تقسیم ہوگئی۔

اس کا ایک بیٹا ارخلاؤس سامریہ، یہودیہ اور شمالی ادومیہ کا فرمانروا ہوا مگر ۶ء میں قیصر آگسٹس نے اس کو معزول کر کے اس کی پوری ریاست اپنے گورنر کے ماتحت کر دی اور ۴۱ء تک یہی انتظام قائم رہا۔ یہی زمانہ تھا جب حضرت مسیح علیہ السلام بنی اسرائیل کی اصلاح کے لئے اٹھے اور یہودیوں کے تمام مذہبی پیشواؤں نے مل کر ان کی مخالفت کی اور رومی گورنر پونٹس پیلاطس سے ان کو سزائے موت دلوانے کی کوشش کی۔ (اور اپنے خیال کے مطابق تو ان کو سولی پر چڑھا ہی دیا!)

ہیرود کا دوسرا بیٹا ہیرود اینٹی پاس شمالی فلسطین کے علاقہ گلیل اور شرق اردن کا مالک ہوا اور یہی وہ شخص ہے جس نے ایک رقاصہ کی فرمائش پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر قلم کر کے اس کی نذر کیا۔

اس کا تیسرا بیٹا فلپ، کوہ حرمون سے دریائے یرموک تک کے علاقے کا مالک ہوا اور یہ اپنے باپ اور

بھائیوں سے بھی بڑھ کر رومی و یونانی تہذیب میں غرق تھا۔

۴۱ء میں ہیرود اعظم کے پوتے ہیرود اگرپا کو رومیوں نے ان تمام علاقوں کا فرمانروا بنا دیا جن پر ہیرود اعظم اپنے زمانے میں حکمراں تھا۔ اس شخص نے برسر اقتدار آنے کے بعد مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر مظالم کی انتہا کر دی اور اپنا پورا زور خدا ترسی و اصلاحِ اخلاق کی اس تحریک کو کچلنے میں صرف کر ڈالا جو حواریوں کی رہنمائی میں چل رہی تھی۔

۴۔ زوال و عذاب کا دوسرا دور

اس پر تھوڑا زمانہ ہی گزرا تھا کہ یہودیوں اور رومیوں کے درمیان سخت کشمکش شروع ہو گئی اور ۶۴ء اور ۶۶ء کے درمیان یہودیوں نے کھلی بغاوت کر دی۔ ہیرود اگرپا ثانی اور رومی پروکیوریٹر فلورس، دونوں اس بغاوت کو فرو کرنے میں ناکام ہوئے۔ آخر کار رومی سلطنت نے ایک سخت فوجی کارروائی سے اس بغاوت کو کچل ڈالا اور ۷۰ء میں ٹیٹس نے بزور شمشیر یروشلم کو فتح کر لیا۔ اس موقع پر قتل عام میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار آدمی مارے گئے، ۶۷ ہزار آدمی گرفتار کر کے غلام بنائے گئے، ہزار ہا آدمی پکڑ پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے کے لئے بھیج دیئے گئے، ہزاروں آدمیوں کو پکڑ کر مختلف شہروں میں بھیجا گیا تاکہ ایمفی تھیٹروں اور کلوسیموں میں ان کو جنگلی جانوروں سے پھڑوانے یا شمشیر زنوں کے کھیل کا تختۂ مشق بننے کے لئے استعمال کیا جائے۔ تمام دراز قامت اور حسین لڑکیاں فاتحین کے لئے چن لی گئیں اور یروشلم کے شہر اور ہیکل کو مسمار کر کے پیوندِ خاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد فلسطین سے یہودی اثر و اقتدار ایسا مٹا کہ دو ہزار برس تک اس کو پھر سر اٹھانے کا موقع نہ ملا اور یروشلم کا ہیکل مقدس پھر کبھی تعمیر نہ ہو سکا۔ بعد میں قیصر ہیڈریان نے اس شہر کو دوبارہ آباد کیا مگر اب اس کا نام ایلیا تھا اور اس میں مدت ہائے دراز تک یہودیوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

یہ تھی وہ سزا جو بنی اسرائیل کو دوسرے فسادِ عظیم کی پاداش میں ملی۔

❖❖❖

بابِ دوم

عزمِ تنظیم

یعنی تنظیمِ اسلامی کے قیام کے فیصلے کا اعلان

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی یہ خطاب جو ۲۱ جولائی ۱۹۷۴ء کو بعد نماز مغرب مسلم ماڈل ہائی سکول لاہور میں منعقدہ اکیس روزہ قرآنی تربیت گاہ کے اختتام پر ہوا' اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے دین کے ایک اہم تقاضے یعنی فریضۂ اقامت دین کی ادائیگی کے حوالے سے تنظیم اسلامی کے قیام کے فیصلے کا اعلان کیا تھا۔ بنابریں یہ خطاب تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے حالات زندگی اور اس تحریکی سفر کی تفصیل پر مشتمل ہے جس کا آغاز اُن کے زمانۂ طالب علمی ہی میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس خطاب میں بالخصوص اُن اجتماعی دینی ذمہ داریوں کے شعور اور ادارک کو اجاگر کیا گیا ہے جو بالآخر تنظیم کے قیام کا موجب بنیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد اوائل ۱۹۶۷ء ہی سے محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے درس وتدریس کے اس سلسلے اور تعلیم وتعلّم قرآن کی اس جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ ایسے رفقاء کار میسر آ گئے جنہیں قرآن مجید کے ذریعے اپنے دینی فرائض کا ایک واضح شعور حاصل ہو گیا تھا۔ نتیجتاً جولائی ۱۹۷۴ء میں مسلم ماڈل ہائی اسکول لاہور کے ہال میں منعقدہ ایک اکیس روزہ قرآنی تربیت گاہ کے اختتام پر محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے ایک مفصل تقریر کی، جس میں انہوں نے تنظیم اسلامی کے قیام کے فیصلے کا اعلان کر دیا۔

بعد ازاں یہ خطاب اولاً ماہنامہ 'میثاق' لاہور کی ستمبر اور اکتوبر و نومبر ۱۹۷۴ء کی اشاعتوں میں شائع ہوا۔ پھر ۱۹۷۹ء میں اسے کتابی صورت میں ''سرافگندیم'' کے نام سے شائع کیا گیا، اب ایک عرصے کے بعد ''عزم تنظیم'' کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ واضح رہے کہ بانی محترمؒ کا یہ خطاب چونکہ ایک تاریخی اہمیت بھی رکھتا ہے اس لئے اس میں شامل بعض ایسے جملے جو ایک خاص زمانی تناظر رکھتے ہیں، اُنہیں بغیر کسی تبدیلی کے شائع کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

سرافگندیم (۱)

بِسمِ اللّٰہِ

مَجُرِھَا

وَمُرُسٰھَا

---

(۱) مکمل شعر اس طرح ہے: دریں دریائے بے پایاں دریں طوفان موج افزا
سرافگندیم! بسم اللہ مجرِھا ومُرسٰھا

ترجمہ: چاہے دریا کتنا ہی گہرا ہو اور طوفان کیسی ہی موج اُٹھاتا ہو ہم نے تو اپنی کشتی پانی میں ڈال دی ہے!......اللہ ہی کے نام سے اس کا چلنا ہے اور اللہ ہی کے نام سے اس کا رکنا ہے (مرتب)

عزمِ تنظیم

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِo

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہمارا قرآنی تربیت گاہ کا پروگرام بخیر وخوبی اختتام کو پہنچا۔ اگرچہ اس بار ابتدا میں کچھ بددلی کا سامنا رہا تھا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اچانک کچھ انتظامی دشواریاں پیش آ گئیں اور دوسرے موسم کی سختی اور خصوصاً برقی رو کی آنکھ مچولی کے باعث' تاہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کچھ تو رفتہ رفتہ انتظامات درست ہو گئے' کچھ آپ حضرات نے ع ''زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز!'' کے مصداق موسم کے ساتھ سازگاری اختیار کر لی اور کچھ ہم نے پروگرام میں تخفیف کرتے ہوئے ایک ماہ کے بجائے تین ہفتوں پر اکتفا کر لیا۔ بہر حال بفضل اللہ تعالیٰ وعونہٖ پروگرام پورا ہو گیا۔ گویا ع ''شکر' صد شکر کہ جمازہ بمنزل رسید!''

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اس تربیت گاہ کے پروگراموں میں مرکزی حیثیت مطالعۂ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کے درس کو حاصل تھی جس کا آغاز یکم جولائی کو سورۃ العصر سے ہوا تھا اور اختتام آج سورۃ الحدید پر ہوا ہے' اور جس کے بارے میں مَیں نے آغاز میں بھی عرض کر دیا تھا اور بعد میں بھی متعدد بار واضح کیا کہ اس کی ترتیب میں اصل مقصد یہ پیش نظر رہا ہے کہ ہمارے سامنے اللہ کے دین کا ایک صحیح' ہمہ گیر اور جامع تصور بھی آ جائے اور ہم پر اپنی ذمہ داریاں اور فرائض بھی منکشف ہو جائیں۔

گویا ہم پر یہ بھی واضح ہو جائے کہ ہمارا دین ہے کیا؟ اور یہ بھی منکشف ہو جائے کہ وہ ہم سے چاہتا کیا ہے!!

اور آج اس نصاب کی تکمیل کے بعد مجھے یقین ہے کہ آپ میرے ساتھ اتفاق فرمائیں گے کہ تربیتی پروگرام کے دوسرے حصوں میں چاہے کوئی کمی رہ گئی ہو' جہاں تک اس بنیادی مقصد کا تعلق ہے وہ بتمام و کمال نہ سہی ضروری حد تک بہر حال پورا ہو گیا ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو یہ واضح ہو گیا کہ

''ہمارا دین عام مذہبی تصورات کے مطابق صرف چند عقائد اور رسوم کا مجموعہ نہیں ہے' بلکہ پوری زندگی پر حکمرانی چاہتا ہے اور زندگی کے ہر ہر گوشے پر عمل داری کا طالب ہے' اور اپنے ماننے والوں سے اس کا مطالبہ یہ ہے کہ اولاً وہ اسے خود اپنی زندگیوں میں بتمام وکمال رائج کریں اور پھر اسے ہیئتِ اجتماعیہ حتیٰ کہ

پورے کرۂ ارضی پر نافذ و غالب کرنے کی کوشش کریں اور اس میں تن من دھن سب کچھ کھپا دیں۔ اور دوسری طرف اس نہ صرف محدود بلکہ مسخ شدہ (perverted) تصورِ دین کی غلطی بھی پوری طرح واضح ہو گئی ہے جس نے اُمتِ مسلمہ کی عظیم اکثریت کے قویٰ شل کر دیے ہیں اور اسے بحیثیتِ مجموعی جمود اور تعطل کا شکار بنا کر رکھ دیا ہے!''

اب ظاہر ہے کہ اصل مسئلہ نیت اور ارادے کا ہے۔ مشہور کہاوت ہے کہ ''سوتے کو جگایا جا سکتا ہے' جاگتے کو جگانا ممکن نہیں!'' اگر کوئی سمجھنے کا ارادہ ہی نہ رکھتا ہو تو بات دوسری ہے' لیکن اگر کوئی واقعتہً جاننا چاہے کہ ازروئے قرآن انسان کی نجات کے ناگزیر لوازم کیا ہیں اور اللہ تعالیٰ کے یہاں فوز و فلاح سے ہمکنار ہونے اور عفو و درگزر کے مستحق قرار پانے کی کم از کم شرائط کیا ہیں تو اس کے لیے اجمالاً سورۃ العصر بھی کفایت کرتی ہے اور تفصیلاً یہ پورا نصاب تو حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے بعد اب اصل مسئلہ 'عمل' کا ہے' اور ظاہر ہے کہ یہی مرحلہ سب سے کٹھن ہے اور اصل دشواری یہیں پیش آتی ہے۔ اور یہی وہ معاملہ ہے جس سے متعلق اپنی زندگی کے ایک اہم فیصلے کے اظہار و اعلان اور اس کے پس منظر کی وضاحت کے لیے میں اِس وقت آپ حضرات کے سامنے حاضر ہوا ہوں۔

اس سے پیشتر کہ میں وہ فیصلہ آپ حضرات کے سامنے رکھوں' اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ میرے اب تک کے کام کی نوعیت صرف درس و تدریس کی رہی ہے نہ کہ کسی ہمہ گیر دعوت کی! اور میں یہ بات مسلسل واضح کرتا رہا ہوں کہ میری حیثیت اصلاً صرف ایک طالبعلم کی اور زیادہ سے زیادہ ایک مدرّس یا معلّم کی ہے نہ کہ داعی یا مبلغ کی!

حضور نبی کریم ﷺ کے خطباتِ مبارکہ میں ایک جملہ آتا ہے۔ حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''اُوْصِیْکُمْ وَنَفْسِیْ بِتَقْوَی اللّٰہِ''، یعنی میں تمہیں بھی تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں اور اپنے نفس کو بھی! میں اپنے لیے تو وصیت یا نصیحت کا لفظ بھی استعمال نہیں کر سکتا۔ میرے اب تک کے درس و تدریس اور تعلیم و تعلّمِ قرآن کی نوعیت محض یہ رہی ہے کہ میرے نزدیک ازروئے قرآن ہر مسلمان پر اس کے دین کی جانب سے جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ یہ ہیں جو میں آپ حضرات کو بھی بتا رہا ہوں اور خود اپنے آپ کو بھی! ہم سب حسبِ صلاحیت و استعداد ان پر مکلّف بھی ہیں اور عنداللہ مسئول اور جوابدہ بھی! اور ہمیں ان سے عہدہ برآ ہونے کی فکر کرنی چاہیے!

مجھے خوب معلوم تھا کہ یہ راہ یوں تو ویسے بھی بڑی کٹھن اور پرصعوبت ہے اور اس پر چلنے کے لیے

’’چیتے کا جگر چاہیے شاہیں کا تجسس!‘‘ اس لیے کہ بفحوائے آیۂ قرآنی ﴿اِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ۝۱۷﴾ (لقمٰن) ’’بے شک یہ بہت ہمت کے کاموں میں سے ہے!‘‘ لیکن اس میں پہل کرنے والا تو گویا ایک بہت ہی بھاری بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھالیتا ہے‘ اور ﴿اَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ۝۱۶۳﴾ (الانعام) اور ﴿اَنَا اَوَّلُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۝۱۴۳﴾ (الاعراف) کہتے ہوئے اس پر خطر وادی میں اتر جانا اور پھر پکارنا کہ ﴿مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ﴾ (الصّف:۱۴) ’’کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں؟‘‘ ہرگز کوئی آسان کام نہیں!

یہی وجہ ہے کہ تا حال میں ’درس و تدریس‘ کے گوشۂ عافیت ہی میں پناہ گزیں رہا اور میں نے یہی موقف اختیار کیے رکھا کہ دین کی یہ حقیقت ہے جو مطالعۂ قرآن سے مجھ پر واضح ہوئی اور دین کے یہ فرائض ہیں جو کلامِ الٰہی سے مجھ پر منکشف ہوئے۔ میں اس کا مدّعی نہیں کہ میں خود ان کو بجالا رہا ہوں اور آپ کو دعوت دے رہا ہوں کہ ان کی ادائیگی میں میرے ساتھ شریک ہو جائیں۔ بلکہ مقصود محض اظہارِ حقیقت ہے‘ اس خیال سے کہ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ میں سے کسی کو اس خدمت کے لیے قبول فرمالے اور سامعین میں سے کوئی باصلاحیت اور باہمت شخص ایسا نکل آئے جو اُٹھ کھڑا ہو اور خلقِ خدا کو دعوت دے کہ ’’اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ!‘‘ ’’اللہ کے بندو میری طرف آؤ!‘‘ اور اس طرح راہ حق پر چلنے کے لیے ایک قافلہ تیار ہو جائے۔

لیکن اب بہت غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد محض اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق پر توکل و اعتماد اور صرف اُسی کی امداد و اعانت کے سہارے اور بھروسے پر میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ میری زندگی میں یہ کام صرف درس و تدریس تک محدود نہیں رہے گا‘ بلکہ ان شاء اللہ العزیز احیائے اسلام اور غلبۂ دینِ حق ہی عملاً میری زندگی کا اصل مقصد ہوں گے اور میری بہتر اور بیشتر مساعی بالفعل دعوتِ دین اور خلقِ خدا پر دینِ حق کی جانب سے اتمامِ حجت میں صرف ہوں گی۔ گویا ﴿اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُكِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝۱۶۲﴾ (الانعام) اور اسی کی دعوت میں اپنے تمام عزیزوں‘ دوستوں اور تمام جاننے والوں حتیٰ کہ بزرگوں تک کو دوں گا‘

اور پھر جو لوگ اس راستے پر ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائیں انہیں ایک نظم میں منسلک کر کے ایک ہیئتِ اجتماعیہ تشکیل دوں گا جو ان مقاصدِ عالیہ کے لیے منظّم جدوجہد کر سکے! وَمَا تَوفِیْقِی اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم

میں نے یہ فیصلہ دفعتہً نہیں کر لیا ہے بلکہ اس کا ایک طویل پس منظر ہے۔ اور چونکہ میں آپ حضرات کے سامنے اپنے آپ کو اس حیثیت سے پیش کرنے کا خواہش مند نہیں ہوں کہ جیسے یہ حقیقت بس مجھ ہی پر منکشف ہوئی ہے یا یہ کوئی 'وحی' ہے جو براہِ راست مجھ ہی پر 'نازل' ہوئی ہے' لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اجمالاً وہ پورا پس منظر آپ کے سامنے رکھ دوں تاکہ میرے فکر کا پورا 'شجرۂ نسب' آپ کے علم میں آجائے۔

اس سلسلے میں یہ معذرت پیشگی حاضر ہے کہ اس وقت میرے ذہن میں کوئی مرتب مواد موجود نہیں ہے۔ آپ کو خوب معلوم ہے کہ یہ اکیس دن مجھ پر کس قدر سخت مشقت کے گزرے ہیں۔ میری صحت پہلے ہفتے کے بعد ہی جواب دے گئی تھی اور بعد میں پندرہ دنوں کے دوران میں مَیں نہایت ثقیل بلکہ مضر ادویات کے سہارے اس فرض کو ادا کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں جو میں نے اپنے ذمے لے لیا تھا' یعنی پورے منتخب نصاب کا درس' اور خصوصاً آج کا دن تو بہت ہی سخت مشقت میں گزرا ہے۔ صبح کے اڑھائی گھنٹے اور عصر اور مغرب کے مابین ڈیڑھ گھنٹے کے درس کے بعد اب آپ مجھ سے کسی مرتب تقریر کی توقع بہرحال نہ رکھیں۔ اس وقت میرا اصل مقصد تو صرف اس فیصلے کا اظہار و اعلان تھا جو ہو گیا۔ جہاں تک اس کے پس منظر کا تعلق ہے تو اس میں سے جو چیزیں اس وقت ذہن میں بلاتکلف آجائیں' اور جن کی جانب اللہ تعالیٰ ذہن کو منتقل فرما دیں انہیں بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے میری ''بے ربطیٔ تقریر'' میں بھی ''ربطِ محکم'' پیدا فرما دے!

میں ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو مشرقی پنجاب کے ایک قصبے حصار میں پیدا ہوا اور گورنمنٹ ہائی سکول حصار ہی سے میں نے ۱۹۴۷ء میں پنجاب یونیورسٹی کا میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت میں پاس کیا۔ (میں نے کُل ساڑھے آٹھ سو میں سے سات سو اٹھارہ نمبر لیے تھے اور یونیورسٹی میں چوتھی پوزیشن حاصل کی تھی!)

انسان کی عمر کے اِس دور کا اکثر حصہ تو ظاہر ہے کہ خالص بے شعوری کی حالت میں گزرتا ہے۔

اس کے آخری حصے کو بھی زیادہ سے زیادہ نیم شعوری کا زمانہ کہا جا سکتا ہے‘ تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں جو نقش لوحِ ذہن پر ثبت ہو جائیں وہ بہت گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔

میں نے اپنی زندگی کے بالکل ناسمجھی کے دور میں بھی چونکہ اس فضا میں سانس لیا جس میں ہندو مسلم کشمکش کے سائے گہرے ہونے شروع ہو چکے تھے اور مسلمانانِ ہند اپنے قومی تشخص کے تحفظ کے لیے جان توڑ کوشش پر مجبور ہو گئے تھے‘ لہٰذا میرے تحت الشعور کی سب سے نچلی سطح (substratum) میں مسلم قوم پرستی کا جذبہ رچ بس گیا۔ یہاں تک کہ مجھے خوب یاد ہے کہ ۱۹۳۸ء میں جبکہ میری عمر کل چھ سال کی تھی میں نے علامہ اقبال مرحوم اور مصطفیٰ کمال پاشا کے انتقال کو نہ صرف ایک قومی نقصان بلکہ ذاتی صدمے کی حیثیت سے محسوس کیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ’نیم شعوری‘ کے دور کے آغاز پر میرے ذہن نے اولین اثرات علامہ اقبال مرحوم کی ملّی شاعری سے قبول کیے۔ میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا جب میرے بڑے بھائی صاحب نے مجھے ’’بانگِ درا‘‘ لا کر دی جسے میں گھنٹوں کچھ سمجھے اور کچھ بغیر سمجھے ترنّم کے ساتھ پڑھتا رہتا تھا۔

بانگِ درا کی نظموں میں سے مجھے سب سے زیادہ پسند وہ تھیں جن میں ملتِ اسلامی کے مستقبل کے بارے میں ایک امید افزا نقشہ کھینچا گیا تھا اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور اُمتِ مرحومہ کی تجدید کی خوشخبری دی گئی تھی‘ اور فی الجملہ یہ رنگ موجود تھا کہ: ؎

اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

خصوصاً ’طلوعِ اسلام‘ کے یہ اشعار تو مجھے بے حد پسند تھے:

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیلؑ اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے؟
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!!

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
سبق پھر پڑھ صداقت کا' عدالت کا' شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا!

اوران اشعار کوبھی میں بہت کیف اور سرور کے عالم میں پڑھا کرتا تھا: ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا!
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا!

مولانا حالؔی سے اس دور میں َمیں قطعاً متعارف نہ ہوا تھا' لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ تاریخی اعتبار سے حالؔی کی 'مسدس' مسلمانانِ عالم کی پستی کی انتہا اور ملتِ اسلامی کے زوال وانحطاط اور نکبت و ادبار کے نقطۂ عروج سے مطابقت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار پر مایوسی اور دل شکستگی کی گہری چھاپ ہے اور ان کی شاعری تمام تر مرثیہ خوانی پر مشتمل ہے' جیسے:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

اور:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دُعا ہے — اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے — پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

حالؔی اور اقبالؔ ہم عصر بھی قرار دیے جا سکتے ہیں اور تاریخ ہائے وفات کے اعتبار سے ان کے مابین ایک نسل کا فاصلہ بھی ہے' اور اسی 'وصل مع الفصل' اور 'جمع مع الفرق' کی کیفیت ان کے اشعار میں نظر آتی ہے۔ یعنی جہاں مولانا حالؔی کے اشعار صرف مرثیہ خوانی پر مشتمل ہیں وہاں اقبالؔ کے یہاں ماضی پر حد درجہ زوردار مرثیہ خوانی بھی ہے (ملاحظہ ہوں 'بانگِ درا' کی نظمیں 'صقلیہ' اور 'بلادِ اسلامیہ')

اور مستقبل کے لیے نہایت جذبات انگیز اور جذبہ پرور حُدی خوانی بھی!

بہر حال اپنی عمر کے نیم شعوری دور میں میرے ذہن پر اوّلین چھاپ علامہ اقبال[1] کی ملی شاعری کی پڑی اور اس سے احیائے دین اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور ملت اسلامی کی تجدید اور تشکیلِ نو کا ایک جذبہ میرے قلب کی گہرائیوں میں رچ بس گیا۔

یہاں یہ اعتراف کرنا بھی مناسب ہے کہ اس جذبۂ ملّی کی آبیاری ایک زمانے میں حفیظؔ جالندھری صاحب کے 'شاہنامۂ اسلام' سے بھی ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ جن دنوں میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا میری ایک پوری رات 'شاہنامہ' کی دوسری جلد کو اس کے مخصوص طرزِ ترنم میں پڑھ کر والدہ صاحبہ کو سنانے میں بسر ہوئی' اس طرح کہ ادھر جلد ختم ہوئی اور اُدھر صبح نمودار ہوگئی!

۴۷۔۱۹۴۶ء کے دوران مسلمانانِ ہند کی قومی جدوجہد اپنے نقطۂ عروج پر تھی اور پورے برصغیر کے مسلمانوں کے اعصاب پر تحریکِ مسلم لیگ کا کامل تسلط تھا۔ چنانچہ میں بھی اپنی اسی نیم شعوری کیفیت میں پوری تندہی کے ساتھ اس سے وابستہ تھا۔ اس زمانے میں میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا ایک فعّال ورکر تھا' اور اس دور میں ہمارے جذبۂ ملی کے جوش وخروش کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہم فیڈریشن کے کارکن روزنامہ 'نوائے وقت' کے استقبال کے لیے بالعموم ریلوے سٹیشن پہنچ جایا

(۱) یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پانچویں جماعت کے دوران 'بانگ درا' کو کچھ سمجھے اور کچھ بغیر سمجھے 'پی' جانے کے بعد میں نے چھٹی جماعت کے دوران 'بالِ جبریل' اور 'ضربِ کلیم' کو ایک صاحب سے عاریۃً لے کر پڑھ ڈالا اور ساتویں جماعت کے زمانے میں ایک لطیف سا بہانہ بنا کر بڑے بھائی صاحب سے 'بالِ جبریل' 'ضربِ کلیم' اور 'ارمغانِ حجاز' تینوں کتابیں حاصل کر لیں اور گویا علامہ مرحوم کا پورا اردو کلام نظر سے گزار لیا! 'ضربِ کلیم' اور 'بالِ جبریل' کو عاریۃً حاصل کرنے کا واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ علامہ کی کتابوں کا مکمل سیٹ خان عزیز الدین حمزئی کے یہاں موجود ہے جو حصار کے معروف وکلاء میں سے تھے۔ ان کا انتقال چند سال قبل ملتان میں ہوا۔ میں اپنے والد صاحب مرحوم ومغفور کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت وہ ایک عجیب سے شش وپنج میں مبتلا ہو گئے تھے کہ نہ انکار کیے بنتی تھی نہ طبیعت کتابیں دینے پر آمادہ ہوتی تھی۔ بالآخر انہوں نے ایک تدبیر سوچی اور علامہ کے ان اشعار کا مطلب مجھ سے دریافت کیا کہ ؎

کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور ۔۔۔ پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور! ۔۔۔ الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن

اور کہا کہ اگر ان اشعار کا مفہوم بیان کر دو تو کتابیں لے جا سکتے ہو۔ پھر جب میں نے ان کا مفہوم بیان کر دیا تو وہ کچھ حیران سے تو ہوئے' تاہم انہوں نے کتابیں میرے حوالے کر دیں!

کرتے تھے۔ کچھ عرصہ مَیں حصار ڈسٹرکٹ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکرٹری بھی رہا' اور ۱۹۴۶ء میں ایک بار میں نے لاہور میں منعقدہ فیڈریشن کے ایک مرکزی اجلاس میں ضلع حصار کے نمائندے کی حیثیت سے بھی شرکت کی!

تحریک مسلم لیگ کے ساتھ اس عملی تعلق بلکہ انہماک کے ساتھ ساتھ اُسی زمانے میں میں ایک نئی دعوت سے روشناس ہوا۔ یہ دعوت تھی مؤسسِ جماعتِ اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی! جس نے میرے جذبۂ ملی کو ایک نئی وسعت (dimension) عطا کی اور دل میں تجدید و احیائے ملت کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی مقدم اور پیشتر ''تجدید و احیائے دین'' کا جذبہ پیدا کیا۔ یا یوں کہہ لیں کہ علامہ اقبال مرحوم کے عطا کردہ جذبۂ ملی کے خاکے میں ایک دینی فکر کا رنگ بھر دیا!

اپنے میٹرک کے زمانۂ تعلیم کے دوران اگرچہ میں عملاً تحریک مسلم لیگ ہی سے وابستہ رہا اور یہ نیا دینی فکر مجھ پر اس درجہ غالب نہ آ سکا کہ میں عملاً بھی اسی کا ہو رہتا تاہم اس کا اثر مجھ پر اس حد تک ضرور ہوا کہ مسلم لیگ یا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے حلقوں میں جب بھی مولانا مودودیؒ یا جماعت اسلامی پر کوئی تنقید ہوتی یا طنز و طعن کا معاملہ ہوتا تو میں ان کی جانب سے مدافعت میں پورا زور صرف کر دیتا۔

اس نئی دینی تحریک کے لٹریچر کے پڑھنے یا سمجھنے میں مجھے زیادہ دِقت اس لیے نہ ہوئی کہ میں نے سکول میں اختیاری مضمون کی حیثیت سے عربی لی ہوئی تھی۔ اور ایک تو ویسے بھی میرا شمار سکول کے ذہین اور ہوشیار طلبہ میں تھا اور دوسرے عربی سے مجھے اللہ تعالیٰ نے خصوصی شغف عطا فرما دیا تھا' چنانچہ جماعت کی بنیادی دعوت پر مشتمل چھوٹے کتابچے میں نے تمام کے تمام جناب مسرت مرزا صاحب اور چودھری نذیر احمد صاحب (یہ دونوں حضرات اب ملتان میں مقیم ہیں!)[1] سے حاصل کر کے پڑھ ڈالے اور ایک حد تک سمجھ بھی لیے۔ میرے بھائی اظہار احمد صاحب ان دنوں جماعت کا لٹریچر گہرے انہماک کے ساتھ پڑھ رہے تھے' یہاں تک کہ انہوں نے بہت سی کتابوں کے مفصل نوٹس (notes) بھی تیار کر لیے تھے۔

۱۲ جولائی ۱۹۴۷ء کو میرا میٹرک کا نتیجہ نکلا۔ ۲۰/۲۱ اگست کو عید الفطر تھی اور اس کے دوسرے ہی روز سے حصار میں مسلمانوں کے محلوں پر ہندوؤں کے منظم حملے شروع ہو گئے اور ستمبر کا پورا مہینہ ہم لوگوں نے محصوری کے عالم میں بسر کیا۔

---

(۱) افسوس کہ اس دوران میں دونوں حضرات انتقال فرما گئے!

اسی محصوری کی حالت میں میں ''تفہیم القرآن'' سے پہلی بار متعارف ہوا۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ اُس زمانے میں' میں اور میرے بڑے بھائی' ہم دونوں محلے کی ایک مسجد میں ماہنامہ 'ترجمان القرآن' کے تازہ پرچوں سے تفسیر سورۂ یوسف پڑھا کرتے تھے۔ عام فہم تو ظاہر ہے کہ ان کا زیادہ تھا' لیکن عربی میری بہتر تھی۔ اس طرح ہمارا اجتماعی مطالعہ بہت مفید بھی رہتا تھا اور دلچسپ بھی۔

اور مجھے اس اعتراف میں ہرگز کوئی باک نہیں کہ میرے دل میں قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کی رغبت اوّلاً اسی کے ذریعے پیدا ہوئی' بلکہ قرآن حکیم سے میرا اوّلین تعارف اسی کی وساطت سے ہوا......!

اپنے میٹرک کے ان دو سالوں کے دوران میرا تعارف ابوالکلام آزاد مرحوم کی تحریروں سے بھی ہوا۔ 'الہلال' کے بعض پرانے پرچے بھی دیکھنے میں آئے اور کتابی صورت میں مطبوعہ 'مضامینِ الہلال' بھی میں نے پڑھے۔ (۱) اس سے یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی کہ جس تحریک کا علم اس وقت جماعت اسلامی کے ہاتھ میں ہے اور جو دعوت اس وقت مولانا مودودیؒ پیش کر رہے ہیں' اس دور میں اُس کے داعیٔ اوّل کی حیثیت دراصل مولانا آزادؒ کو حاصل ہے۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کی کشمکش اور اس میں تلخی کی شدّت کے باعث جو نفرت مولانا آزاد سے تھی وہ ختم ہوگئی اور اس کی جگہ ایک حسرت آمیز تاسف نے لے لی کہ اتنا عظیم کام چھوڑ کر وہ اب کن وادیوں میں سرگرداں ہیں' اور دوسرا اور اہم تر نتیجہ یہ نکلا کہ میرے ذہن میں یہ بات راسخ ہوگئی کہ اصل اہمیت اشخاص کی نہیں بلکہ مقاصد کی ہے اور نگاہیں شخصیتوں پر نہیں بلکہ کام پر مرتکز رہنی چاہئیں۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء کے اوائل میں انڈین ملٹری نے حصار میں ہماری قلعہ بندیاں زبردستی توڑ ڈالیں اور

(۱) مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تصانیف کے حصول کا واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ حصار کے صنعتی اسکول کے ایک انسٹرکٹر غلام محمد بھٹی صاحب کو کتابیں جمع کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ وہ خود ایک بہت ماہر جلد ساز تھے اور ان کے پاس نہایت اعلیٰ مجلد کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ میں نے جب مولانا مرحوم کی تصانیف ان سے عاریۃً برائے مطالعہ مانگیں تو وہ بھی خان عزیز الدین حمزئی ہی کی طرح شش و پنج میں مبتلا ہوگئے اور انہوں نے بھی جان چھڑانے کی وہی تدبیر اختیار کی' یعنی 'مجموعۂ مضامینِ الہلال' کھول کر ایک فارسی شعر جو سامنے آ گیا اس کے معنی مجھ سے پوچھ لیے۔ میں نے فارسی بالکل نہ پڑھی تھی' اس لیے پہلے تو ذرا جھجکا' لیکن جب ذرا غور کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ تو اردو ہی کے الفاظ ہیں جو بس ذرا آگے پیچھے کر دیے گئے ہیں' چنانچہ میں نے معنی بیان کر دیے اور کتاب حاصل کر لی!

پوری مسلمان آبادی کو ایک نوتعمیر شدہ جیل کے احاطوں میں قائم شدہ کیمپ میں محبوس کر دیا۔ کچھ عرصہ وہاں قیام کے بعد ہم لوگ ایک پیدل قافلے کے ساتھ بیس روز میں ایک سو ستر میل کا فاصلہ طے کر کے‘ اگر حافظہ غلطی نہیں کر رہا تو غالباً ۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو براستہ سلیمانکی ہیڈ ورکس پاکستان میں داخل ہوئے‘ اور اس طرح زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا!

پاکستان میں والد صاحب مرحوم و مغفور اوّل تو لاہور ہی میں تعینات ہوئے‘ لیکن جلد ہی ان کا تبادلہ قصور ہو گیا اور میں ایف ایس سی (میڈیکل) کی تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل اور محلّہ کرشن نگر میں اپنے ایک عزیز کے مکان پر مقیم ہو گیا۔

ایف ایس سی کی تعلیم کے دو سالوں کے دوران میں نے حلقہ ہمدردانِ جماعت اسلامی سے باقاعدہ منسلک ہو کر بہت مستعدی اور جانفشانی کے ساتھ کام کیا۔ اُس وقت کے خصوصی جوش و خروش میں بہت سے عوامل کو دخل حاصل تھا۔ ایک تو پاکستان کا قیام ہی کچھ کم جذبات انگیز واقعہ نہ تھا۔ پھر جس قسم کے حالات میں سے گزر کر پاکستان پہنچنا نصیب ہوا تھا اس نے فوری طور پر ملی اور دینی جذبات کو بہت بھڑکا دیا تھا اور کچھ صورت حال بھی بظاہر ایسی نظر آتی تھی کہ جیسے احیائے اسلام کی منزل بہت قریب ہے۔ قیامِ پاکستان سے گویا اصل مرحلہ تو طے ہو ہی گیا ہے‘ اب کسر صرف اتنی ہے کہ اس میں ’اسلامی نظام‘ قائم کر دیا جائے۔(۱) پھر اسے بنیاد (Base) بنا کر اسلام کے عالمی غلبے کی سعی وُجہد بہت آسان ہو جائے گی۔ منزل کے قرب کے اس احساس نے آتشِ شوق کو مزید بھڑکا دیا تھا۔ ان حالات میں جب جماعت اسلامی پاکستان میں ’’قیامِ نظامِ اسلامی‘‘ کی داعی بن کر سامنے آئی تو گویا اس نے جملہ قومی و ملی اور دینی و مذہبی جذبات کو اپیل کیا اور دوسرے بے شمار کارکنوں کی طرح میں بھی حد درجہ کیف و سرور کے عالم میں اس کی جدوجہد میں عملاً شریک ہو گیا۔

اُسی زمانے میں مَیں نے جماعت کے لٹریچر کا بھی بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی تصانیف تو اس زمانے میں کچھ ثقیل اور کچھ روکھی اور پھیکی معلوم ہوتی تھیں‘ لیکن مولانا مودودیؒ کی تصانیف کا ایک ایک حرف نظر سے گزار لیا۔ بایں ہمہ میں تحریک اسلامی کے ساتھ اپنے اس دور کے تعلق کو بھی شعوری نہیں‘ نیم شعوری قرار دیتا ہوں۔

اَواخر ۱۹۴۹ء میں مَیں میڈیکل کالج لاہور میں داخل ہوا اور ساتھ ہی میری رہائش بھی کالج کے

---

(۱) اُس وقت یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ ’’ زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است!‘‘

ہاسٹل میں منتقل ہوگئی۔ نتیجتاً تنظیمی اعتبار سے میرا تعلق جماعت اسلامی سے منقطع اور اسلامی جمعیت طلبہ سے قائم ہوگیا۔

۱۹۵۰ء میں مَیں نے جمعیت کی رکنیت اختیار کی اور فوراً ہی نظامتِ حلقہ میڈیکل کالج کا بوجھ میرے کاندھوں پر ڈال دیا گیا۔ ۱۹۵۱ء میں میں جمعیت لاہور کا ناظم بھی بنا دیا گیا اور جمعیت پنجاب کا بھی' اور ۱۹۵۲ء میں مَیں جمعیت کا ناظم اعلیٰ منتخب ہوگیا — واضح رہے کہ میں ان 'مناصب' کا ذکر کسی احساسِ فخر کے تحت نہیں کررہا ہوں بلکہ صرف اس حقیقت کے اظہار کے لیے کررہا ہوں کہ اس دور میں مَیں نے انتہائی جوش وخروش اور حد درجہ انہماک کے ساتھ اور تحریک کے تقاضوں کو دوسری ہر چیز پر مقدم جان کر کام کیا۔ یہاں تک کہ اپنی تعلیم کے نقصان[1] اور اپنے پیشہ ورانہ مستقبل (professional career) کی تباہی کی بھی کوئی پروانہ کی...... گویا: ؎

خیریت جاں' راحت تن صحت داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی!

یہاں کوئی صاحب یہ گمان نہ فرمائیں کہ مجھے اس پر کوئی پشیمانی یا پچھتاوا ہے' حقیقت اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ اپنی زندگی کا وہ دور مجھے انتہائی عزیز ہے اور اس کی یاد کو میں اب بھی اپنی ایک قیمتی متاع سمجھتا ہوں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آج دین کی جس خدمت کی توفیق مجھے بارگاہِ خداوندی سے ملی ہوئی ہے اس کی اساس اور بنیاد اسی دور میں قائم ہوئی تھی۔ گویا میرا معاملہ تو وہ ہے کہ ؎

اِس عشق' نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اِس دل میں بجز داغِ ندامت!

چنانچہ تحریر وتقریر کی جو بھی تھوڑی بہت صلاحیت آج مجھ میں ہے وہ اُسی دور میں ابھری اور پروان چڑھی۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ بطورِ زبان مجھے اردو پر نہ اُس وقت کوئی عبور حاصل تھا نہ اب حاصل ہے' تاہم ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اظہار مافی الضمیر کی جو بھی تھوڑی بہت استعداد مجھے حاصل ہے اس کی اوّلین تربیت اسلامی جمعیت طلبہ کے ہفتہ وار آرگن 'عزم' کی ادارت ہی سے حاصل ہوئی تھی۔ اسی

(۱) یہ تو مجھ پر اللہ کا فضل رہا کہ میرا پورا تعلیمی کیریر کسی امتحان میں فیل ہونے کے داغ سے بچا رہا' تاہم پرائمری' مڈل' میٹرک' ایف ایس سی اور میڈیکل کالج کے فرسٹ ایئر کے امتحانات میں جو شاندار کامیابیاں میں نے حاصل کیں وہ بعد میں برقرار نہ رہیں!

طرح کوئی شعلہ بیان خطیب یا جادو اثر مقرر تو میں نہ اُس وقت تھا نہ آج ہوں' تاہم تقریر و بیان کی جو بھی تھوڑی بہت صلاحیت مجھ میں موجود ہے وہ تمام تر اُسی دور کی مرہونِ منت ہے۔

جہاں تک مولانا مودودیؒ کی تصانیف کا تعلق ہے ان کا تو میں اُس دور میں 'متعلّم' ہی نہیں 'معلم' بن گیا تھا' خصوصاً ان کی جو تحریریں تحریک جماعت اسلامی کے اصول و مبادی اور اس کے مختلف ادوار سے متعلق تھیں ان کا تو ایک حد تک 'حافظ' ہو گیا تھا' چنانچہ اس تحریک کی امتیازی خصوصیات اور اس کے مخصوص طریقِ کار کے بارے میں اُس دور میں میرا ذہن بالکل صاف ہو چکا تھا اور اس میں کوئی ابہام نہ رہا تھا۔

مزید برآں اُس دور میں مجھ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم یہ ہوا کہ مجھے اوّلاً مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تصانیف اور پھر ان کی وساطت سے قرآن حکیم کے ساتھ ایک ذہنی مناسبت پیدا ہوگئی۔ مولانا کی تصانیف میں سے خصوصاً ''دعوتِ دین اور اس کا طریق کار'' سے مجھے عشق کی حد تک قلبی تعلق پیدا ہو گیا تھا' اور واقعہ یہ ہے کہ اسی کتاب کے ذریعے مجھ پر تحریک اسلامی کا 'دینی فکر' واضح ہوا اور فریضۂ تبلیغ و شہادتِ حق کی اصل اہمیت منکشف ہوئی۔ پھر جب مولانا کی ایک دوسری تالیف 'تدبرِ قرآن' کے نام سے شائع ہوئی تو اس کا مطالعہ بھی میں نے نہایت ذوق و شوق کے ساتھ کیا' اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم کے ساتھ ایک پختہ ذہنی مناسبت اور محکم قلبی اُنس کی بنیاد اس کتاب سے قائم ہوئی۔

دسمبر ۱۹۵۱ء کی کرسمس اور جولائی ۱۹۵۲ء کی موسم گرما کی تعطیلات میں میں نے لاہور میں ''تربیتی کیمپ'' منعقد کیے جن میں قرآن حکیم کے چند منتخب مقامات کا درس مولانا اصلاحی نے دیا۔ میں خود ان دونوں کیمپوں میں بحیثیت ناظم شریک تھا' چنانچہ میں نے ان سے بھرپور استفادہ کیا' اور واقعہ یہ ہے کہ ان سے نہ صرف یہ کہ میرے قرآن حکیم کے ساتھ ذہنی و قلبی تعلق میں اضافہ ہوا بلکہ میری طبیعت میں تعلیم و تعلّمِ قرآن کا داعیہ شدت کے ساتھ بیدار ہو گیا۔

قرآن حکیم کے ساتھ اس ذہنی و قلبی مناسبت اور اس قوتِ گویائی اور صلاحیتِ بیان نے جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں' مل جل کر مجھے اسی زمانے میں 'مدرّسِ قرآن' بنا دیا۔ چنانچہ جمعیت کے اجتماعات میں بھی 'درسِ قرآن' کی ذمہ داری اکثر و بیشتر مجھی پر رہتی تھی اور تعطیلات کے زمانے میں جب میں گھر آتا تھا (اُس وقت تک والد صاحب مرحوم منٹگمری حال ساہیوال میں اقامت اختیار فرما

چکے تھے) تو جماعت اسلامی کے اجتماعات میں بھی درسِ قرآن کی فرمائش مجھ ہی سے کی جاتی تھی اور میرا درس بالعموم پسند کیا جاتا تھا۔(۱)

قرآن حکیم کے ساتھ اس تعلق کا سب سے بڑا فائدہ جو مجھے پہنچا وہ یہ کہ دین کی اساسی تعلیمات بھی مجھ پر براہِ راست قرآن حکیم کی روشنی میں واضح ہو گئیں اور خاص طور پر دعوت و تبلیغ دین کی اہمیت اور شہادتِ حق اور اقامت دین کی فرضیت بھی مجھ پر ازروئے قرآن منکشف ہو گئی۔ گویا ﴿فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾ (البقرة:٢٥٦) کے مصداق میرے دینی فکر کا ایک براہِ راست تعلق قرآن حکیم سے قائم ہو گیا۔

اس کی اہمیت کا اندازہ مجھے اُس وقت تو نہ تھا' لیکن بعد میں اُس کا احساس مجھے شدت کے ساتھ ہوا کہ اگر خدانخواستہ اس وقت اس پہلو سے کوئی کمی رہ جاتی تو بعد میں جب بعض شخصیتوں سے میرا عقیدت کا رشتہ کمزور پڑا' یہاں تک کہ بالکل منقطع بھی ہو گیا اور جمعیت اور جماعت دونوں سے تنظیمی رشتہ بھی ختم ہو گیا تو اس فکر کا پورا تانا بانا بھی درہم برہم ہو جاتا اور میں بھی ان بہت سے لوگوں کے مانند ہو جاتا جو جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے تو ان کا تعلق نہ صرف تحریک اسلامی بلکہ بعض افسوسناک مثالوں کے اعتبار سے تو گویا اسلام ہی سے منقطع ہو گیا۔

الغرض جمعیت طلبہ سے تعلق کا زمانہ میری زندگی کا اہم ترین دور ہے جس میں خود دین و مذہب کے ساتھ بھی میرا صحیح فکری تعلق قائم ہوا اور تحریک تجدید و احیائے دین کے ساتھ بھی میرے حقیقی اور شعوری تعلق کا آغاز ہوا اور احیائے اسلام اور تجدیدِ ملت" کا وہ جذبہ جو بچپن میں علامہ اقبال مرحوم کی

(۱) ۱۹۵۳ء میں جمعیت کے سالانہ اجتماع کے موقع پر جو درس سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی ابتدائی آیات کا میں نے دیا تھا اس کا ذکر تقریباً بیس سال بعد ۱۹۷۲ء میں کراچی کے ایک سفر کے دوران میرے سامنے بہت عجیب طریقے سے آیا۔ ریل میں ایک ہم سفر سے گفتگو ہو رہی تھی جس میں تعلیم و تعلّمِ قرآن کی اہمیت کا ذکر چل نکلا۔ اس پر ان صاحب نے عجیب کیفیت کے ساتھ کہا کہ ''صاحب! ایک درس ۵۳ء میں ہم نے سنا تھا' اس کی حلاوت کا احساس ابھی تک باقی ہے!'' میں نے ذرا کرید اتو معلوم ہوا کہ دراصل میرے ہی درس کا ذکر ہے۔ چنانچہ میں نے بات وہیں ختم کر دی اور اپنا مزید تعارف مناسب نہ سمجھا! اسی طرح ۱۹۵۴ء میں ملتان میں منعقدہ جمعیت کی تربیت گاہ میں مولانا اصلاحی سے پڑھے ہوئے مقامات کا جو درس میں نے دیا تھا اس کا ذکر بہت سے احباب آج بھی کرتے ہیں۔ فللّٰه الحمد والمنّة۔

شاعری سے پیدا ہوا تھا اور جس میں ایک دینی فکر کا پیوند ابتداءً مولانا مودودیؒ کی تحریروں سے لگا تھا بالآخر مولانا اصلاحیؒ کی تصانیف کی وساطت سے قرآن حکیم کی محکم اساس پر استوار ہو گیا۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۚ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِىَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾

۱۹۵۴ء میں مَیں نے ایم بی بی ایس کا آخری امتحان پاس کیا اور جیسے ہی میرا نتیجہ نکلا میں نے اسلامی جمعیت طلبہ کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا اور جماعت اسلامی کی رکنیت کی درخواست داخل کر دی' اس لیے کہ میرے سامنے آنحضور ﷺ کا یہ فرمان مبارک تھا کہ ((اَنَا آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ' بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) (سنن الترمذی و مسند احمد' عن حارث الاشعری رضی اللہ عنہ) اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میری زندگی میں چند دن بھی بغیر جماعت کے بسر ہوں۔

لیکن افسوس کہ جماعت اسلامی میں میرا قیام بہت مختصر رہا۔

رکن کی حیثیت سے جماعت میں شامل ہوتے ہی پہلی بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے جماعت پر شدید انحطاط اور اضمحلال طاری ہو چکا ہے اور اس کے متوسلین میں کسی انقلابی تحریک کے بجائے عام سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کا سا مزاج پیدا ہو گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوا کہ جماعت کی دعوت اور اس کی اپیل کا رخ بھی اب وہ نہیں رہا جو آغاز میں تھا' بلکہ اس میں بھی ایک عام سیاسی جماعت کا سا انداز پیدا ہو چکا ہے۔

میرے ذہن نے جب اس قلبِ ماہیت کے اسباب وعوامل پر غور کرنا شروع کیا تو ساتھ ہی ایک اور سوال جو ابھر کر سامنے آ کھڑا ہوا وہ یہ تھا کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان میں نظامِ اسلامی کا قیام جو اس قدر آسان اور بالکل قریب نظر آ رہا تھا وہ آٹھ سالہ جدوجہد کے باوجود روز بروز نگاہوں سے دُور تر کیوں ہوتا چلا جا رہا ہے؟

جیسے جیسے میں ان مسائل پر غور کرتا گیا مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوتی چلی گئی کہ تحریک جماعت اسلامی اپنے اصل رخ سے بھٹک گئی ہے اور ۱۹۴۷ء میں ملک کے بدلے ہوئے حالات میں 'مواقع' اور 'امکانات' کے 'دام ہمرنگ زمیں' میں گرفتار ہو کر جماعت اسلامی کی قیادت نے طریق کار میں جو تبدیلی کی تھی اس نے تحریک کی ساری بلند پروازی کو ختم کر کے رکھ دیا ہے اور اب جماعت کا ''اصولی' اسلامی' انقلابی'' کردار تو ع ''خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود'' کے مصداق داستانِ

پارینہ بن چکا ہے' البتہ ایک اسلام پسند' قومی' سیاسی پارٹی کی حیثیت سے جماعت کا وجود باقی ہے!

ابتدا میں یہ انکشاف میرے لیے حددرجہ اذیت بخش تھا اور مجھ پر شدید رنج وغم اور مایوسی کا غلبہ ہو گیا تھا' مگر جیسے جیسے اس مسئلے کے دوسرے پہلو واضح ہوتے گئے اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ جماعت کی اس تبدیلی کو محسوس کرنے والا میں تنہا ہی نہیں ہوں بلکہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں' جن میں ایک اچھی بھلی تعداد اس کے 'اکابر' کی بھی ہے تو ذرا ہمت بندھی کہ غلطی کا ازالہ ممکن ہے اور ذرا کوشش کی جائے تو اس تحریک کو دوبارہ اپنے اصل رخ پر ڈالا جا سکتا ہے۔

اسی امید پر میں نے اڑھائی صد صفحات پر پھیلی ہوئی ایک تحریر کے ذریعے جماعت اسلامی کے قبل از تقسیم ہند موقف اور طریق کار اور بعد از تقسیم پالیسی کے تفاوت اور تضاد کو واضح کیا اور جماعت کے ارباب حل وعقد سے اپیل کی کہ وہ نئے طریق کار کو ترک کر کے سابق طریق کار ہی کی جانب رجوع کریں!

میری یہ تحریر اب ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے' اور اس موضوع پر میں اس وقت مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا سوائے اس کے کہ میں نے یہ تحریر ۱۹۵۶ء میں لکھی تھی اور اب ۱۹۷۴ء ہے' لیکن اٹھارہ سال گزر جانے کے بعد بھی میں اسے اتنا ہی صحیح سمجھتا ہوں جتنا اُس وقت سمجھتا تھا اور میرے موقف میں سرِ مو فرق واقع نہیں ہوا ہے' بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں پختگی ہی پیدا ہوتی چلی گئی ہے!

لیکن افسوس کہ جماعت اسلامی میں یہ اختلافِ رائے انتہائی ہنگامہ خیز بن گیا اور اَواخر ۵۶ء اور اوائل ۵۷ء کا تقریباً چھ ماہ کا عرصہ جماعت اسلامی پاکستان پر ایک سخت بحرانی کیفیت میں گزرا۔ جس کے نتیجے میں کم وبیش ستر اسّی ارکان جماعت سے علیحدہ ہو گئے' جن میں مجھ ایسے عام کارکنوں کے ساتھ ساتھ مولانا امین احسن اصلاحیؒ، مولانا عبدالجبار غازیؒ، مولانا عبدالغفار حسنؒ، مولانا عبدالرحیم اشرفؒ، شیخ سلطان احمد، سردار اجمل خان لغاریؒ ایسے اکابر بھی شامل تھے اور گویا جماعت کی قیادت کی پوری صفِ دوم جماعت سے کٹ گئی تھی۔

یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوا اور اس کی اصل ذمہ داری کس پر ہے؟ یہ ایک بڑی تلخ داستان ہے

جس کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے۔ تاہم میں نے آیۂ مبارکہ ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا﴾ (النحل: ۹۲) [۱] کے حوالے سے 'نقضِ غزل' کے عنوان کے تحت اس کے اہم حصے سپردِ قلم کر دیے تھے' جو حضرات دلچسپی رکھتے ہوں ان کا مطالعہ کر لیں۔ [۲]

میں نے جماعت کی رکنیت کی درخواست ۱۵ نومبر ۱۹۵۴ء کو تحریر کی تھی اور تقریباً ڈھائی سال بعد اپریل ۱۹۵۷ء کی کسی تاریخ کو میں نے انتہائی بوجھل دل کے ساتھ جماعت کی رکنیت سے استعفاء تحریر کر دیا۔ [۳]

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ میں نے زندگی کا وہ نصب العین بھی ترک کر دیا جس کے حصول کے لیے میں نے جماعت میں شمولیت اختیار کی تھی اور احیائے اسلام و تجدیدِ دین اور شہادتِ حق و اقامتِ دین کی اس جدوجہد سے بھی لاتعلقی اختیار کر لی جسے میں نے پورے شعور و ادراک کے ساتھ اپنا دینی فرض سمجھ کر قبول کیا تھا۔

اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ بحمد اللہ گزشتہ سترہ اٹھارہ سالوں کے دوران میں مجھ پر کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ میری نگاہوں سے احیائے اسلام اور اقامتِ دین کا بلند و بالا نصب العین اوجھل ہوا ہو یا مجھے اپنے ان فرائض کے بارے میں کوئی شک یا شبہ لاحق ہوا ہو۔ سبب اس کا پہلے ہی بیان کر چکا ہوں' یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرا تعلق پہلے ہی اشخاص سے نہیں بلکہ قرآن حکیم سے قائم ہو چکا تھا اور یہ بات مجھ پر از روئے قرآن منکشف ہو چکی تھی کہ شہادتِ حق میری ذمہ داری اور اقامتِ دین میرا فرض ہے۔ اگر کوئی جماعت ایسی موجود ہو جس میں انشراحِ صدر کے ساتھ شریک ہو کر اپنے ان فرائض کو ادا کر سکوں تو فبہا' اس جماعت کا وجود میرے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تب بھی فرض تو ساقط نہیں ہو جاتا' اگرچہ کام کٹھن ضرور ہو جاتا ہے' یعنی یہ کہ انسان از خود کھڑا ہو اور اپنے دینی فرائض کی ادائیگی کے لیے دوسروں کو دعوت دے اور ایک جماعت تشکیل دے کر ان فرائض

(۱) ''نہ بن جاؤ اس بڑھیا کے مانند جس نے اپنا سوت کاتنے کے بعد اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا!''

(۲) یہ داستان اب مکمل صورت میں ''تاریخ جماعتِ اسلامی کا ایک گمشدہ باب'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہے!

(۳) درخواستِ رکنیت اور تحریرِ استعفا دونوں ''تاریخ جماعتِ اسلامی کا ایک گمشدہ باب'' میں شامل ہیں۔

سے عہدہ برآ ہو‘ یا بصورتِ آخر کم از کم اپنی ذاتی حیثیت میں تن تنہا کوشاں رہے۔

اشخاص آئیں گے اور چلے جائیں گے‘ جماعتیں بنیں گی اور منتشر ہو جائیں گی‘ لیکن اللہ کا دین بھی دائم و قائم رہے گا اور اس کی کتاب بھی! انسان کا فرض یہ ہے کہ فرمانِ نبوی ((قَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَہٗ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِہٖ‘ کِتَابُ اللّٰہِ)) [۱] کے مصداق قرآن ہی کو اپنا رہنما اور ہادی و امام بنائے اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہے‘ اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے دین کی کسی خدمت کی توفیق مرحمت فرما دے تو اسے سراسر اُسی کا فضل و کرم اور انعام و احسان سمجھے۔ گویا: ؎

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی!
منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت!

جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد ابتداءً قوی امید تھی کہ علیحدہ ہونے والے حضرات ایک نئی تنظیمی ہیئت تشکیل دے کر جماعت کے سابق طریق کار کے طرز پر عملی جدوجہد شروع کر دیں گے‘ اور یہ امید ہرگز بے بنیاد نہ تھی‘ اس لیے کہ علیحدہ ہونے والوں میں نہ اہل علم کی کمی تھی نہ اصحابِ فضل کی‘ اور ان میں چار حضرات وہ بھی تھے جن کے کاندھوں پر مولانا مودودیؒ کی اسیری و نظر بندی کے مختلف مواقع پر جماعت کی امارت کا بوجھ آ چکا تھا‘ گویا تنظیمی اعتبار سے بھی جماعت میں ان کا مقام بلند رہا تھا!

یہی وجہ ہے کہ ابتدائی دو سال یعنی وسط ۵۷ء سے وسط ۵۹ء کا عرصہ اس حال میں بیتا کہ آج لاہور کا سفر ہے تو کل لائل پور کا‘ اور ابھی رحیم آباد سے لوٹا ہوں تو سکھر کے لیے رختِ سفر باندھ رہا ہوں۔ وَقِس علٰی ھٰذا۔ یہاں تک کہ ایک بار یعنی دسمبر ۱۹۵۸ء میں تو ساہیوال میں اپنا مطب بند کر کے اہل و عیال سمیت کراچی منتقل ہو گیا۔ اگرچہ وہاں سے چھ یا سات ماہ بعد ہی والد صاحب مرحوم کی علالت کے باعث لوٹ آنا پڑا۔

اس دوران میں متعدد اہم مشاورتی اجلاس بھی منعقد ہوئے جن میں سب سے بڑا خود میرے زیر اہتمام عزیز ٹینریز ہڑپہ میں منعقد ہوا تھا جس میں تقریباً تمام اہم لوگ شریک ہوئے اور جو غالباً تین روز تک جاری رہا۔

---

(۱) آنحضرت ﷺ کے خطبہ حجۃ الوداع کا ایک فقرہ: ’’میں چھوڑ چلا ہوں تمہارے مابین وہ چیز کہ اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھام لیا تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ یعنی کتاب اللہ!‘‘ (صحیح مسلم‘ باب حجۃ النبی ﷺ)

لیکن افسوس کہ یہ ساری بھاگ دوڑ بے نتیجہ رہی اور مختلف اسباب کی بنا پر جماعت سے علیحدہ ہونے والے حضرات کسی نئی ہیئتِ اجتماعیہ کے قیام پر متفق نہ ہو سکے اور رفتہ رفتہ سب نے اپنے اپنے ذوق اور مزاجِ طبع کی مناسبت سے انفرادی طور پر مختلف تعمیری سرگرمیوں کا آغاز کر دیا جو تقریباً سب کی سب علمی و تعلیمی نوعیت کی تھیں۔ مثلاً مولانا اصلاحی صاحبؒ نے لاہور میں حلقہ تدبرِ قرآن قائم کرلیا' ماہنامہ 'میثاق' جاری فرمایا اور تفسیر تدبرِ قرآن کی تسوید کا آغاز کر دیا۔ حکیم عبدالرحیم اشرفؒ نے لائل پور میں 'جامعہ تعلیمات اسلامیہ' قائم کرلیا اور ہفت روزہ 'المنبر' پر محنت شروع کر دی۔ مولانا عبدالغفار حسنؒ ابتداءً ان کے شریکِ کار رہے اور بعد میں میرے ساتھ اشتراکِ عمل کے لیے ساہیوال منتقل ہو گئے۔ مولانا عبدالجبار غازیؒ نے راولپنڈی میں ایک ہائی سکول قائم کیا اور وہ اس کی تعمیر و ترقی میں ہمہ تن منہمک ہو گئے' سردار اجمل خان لغاریؒ نے 'ادارہ اجمل باغ' کے نام سے جامعہ ملّیہ دہلی کے طرز پر ایک ادارہ قائم کرلیا۔ وَقِس علی ھذا۔

میں نے بھی وسط ۵۹ء میں کراچی سے واپس ساہیوال آ کر دو کاموں کا آغاز کر دیا۔ یعنی ایک حلقہ مطالعۂ قرآن اور دوسرے کالج میں زیرِ تعلیم طلبہ کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے ایک ہاسٹل کا قیام۔ ان دونوں سے مقصود ایک ہی تھا' یعنی مقدم الذکر کے ذریعے عوام میں اور مؤخر الذکر کے ذریعے کالج کے طلبہ میں قرآن حکیم سے ایک قلبی لگاؤ اور ذہنی تعلق پیدا کرنے کی کوشش۔ اس غرض کے لیے میں نے ان مقامات پر بعض اضافے کر کے جو میں نے مولانا اصلاحی صاحبؒ سے پڑھے تھے ایک قدرے وسیع تر منتخب نصاب مرتب کیا اور اس کا درس دیا۔

تقریباً ڈھائی برس (یعنی اواخر ۱۹۶۱ء تک) میں ساہیوال میں اپنے مطب کے ساتھ ساتھ ان دونوں کاموں میں پورے انہماک کے ساتھ مشغول رہا۔

اوائل ۶۲ء میں بڑے بھائی صاحب کی طرف سے دین اور دنیا یعنی معاش اور معاد دونوں کے لیے مشترکہ کوشش کی ایک نہایت دل آویز اور خوش آئند تجویز کے تحت میں کراچی منتقل ہو گیا' اور اگرچہ بہت جلد محسوس ہو گیا کہ یہ بھی ایک ''دامِ ہمرنگِ زمیں'' ہی ہے' تاہم ایک دفعہ اس میں گرفتار ہونے کے بعد کم و بیش تین سال اس سے رہائی حاصل کرنے میں لگے اور ۶۵ء میں مَیں واپس ساہیوال آ سکا۔

کراچی کے اس قیام کے دوران میں بھی میرا جنون بالکل بیکار نہ بیٹھ سکا۔ چنانچہ وہاں بھی میں نے

مقبول عام ہائی سکول میں ایک ''حلقۂ مطالعۂ قرآن'' قائم کیا جس کے ہفتہ وار اجتماعات میں مَیں اُسی منتخب نصاب کا درس دیتا رہا جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے! دوسرے اس زمانے میں مَیں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کا امتحان بھی پاس کرلیا جس میں اتفاقاً میں یونیورسٹی میں اول بھی آ گیا!

ساہیوال اور کراچی میں قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے درس سے کسی اور کو کوئی نفع پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو کم از کم مجھے ضرور یہ فائدہ پہنچا کہ تحریک اسلامی سے مسلسل آٹھ نو سال تک تنظیمی اعتبار سے لاتعلق رہنے کے باوجود اس کی اساسی دعوت سے بھی میرا ذہنی اور قلبی تعلق برقرار رہا اور اپنے دینی فرائض کے احساس اور ذمہ ّداریوں کے شعور سے بھی میرا ذہن فارغ نہ ہو سکا۔ گویا مجھے اپنا سبق یاد رہا اور میری حالت اس شعر کے مصداق رہی کہ ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا!

کراچی سے واپس ساہیوال آ کر میں ابھی اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ۱۱ نومبر ۱۹۶۵ء کو والد صاحب انتقال فرما گئے' اِنّا لِلّٰہ وانّا الیہ رَاجِعُون۔ نتیجتاً سرزمین ساہیوال سے جو ایک محکم رشتہ ان کی وجہ سے قائم تھا وہ ختم ہوگیا۔ ادھر دوبار نقل مکانی کے بعد اب از سرِ نو ساہیوال میں پریکٹس شروع کرنے میں بھی کچھ حجاب سا محسوس ہوتا تھا۔ سلبی طور پر ان دو عوامل اور اثباتی طور پر اس خیال نے کہ 'مقصدِ زندگی' کے اعتبار سے سرزمینِ لاہور ہی میں کسی کام کا آغاز مناسب ہوگا' مجھے اواخر ۶۵ء میں ساہیوال سے لاہور لا بٹھایا' اور اس طرح زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوگیا!

لاہور میں میرا اوّلین پروگرام یہ تھا کہ میں 'حلقۂ تدبرِ قرآن' میں شامل ہو کر مولانا اصلاحی کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہہ کروں گا اور عربی کی تکمیل بھی کروں گا اور علمِ قرآن کی تحصیل بھی۔ لیکن کچھ عرصہ حلقے میں شرکت کرنے کے بعد میں نے بھی محسوس کیا کہ مولانا پر پہلے گروپ پر محنت کے نتائج کے پیشِ نظر کچھ تکان سی طاری ہو چکی ہے اور اب وہ دوبارہ اس نوعیت کی محنت پر آمادہ نہیں ہیں اور

خود مولانا نے بھی واضح الفاظ میں یہ بات فرما دی۔ نتیجتاً میرا یہ ارادہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

اب جو آئندہ کے پروگرام کے بارے میں غور کیا تو وہ چنگاری پھر پوری شدت کے ساتھ بھڑک اٹھی جو گزشتہ آٹھ نو سالوں کے دوران بھی ع ''آگ بجھی ہوئی نہ جان آگ دبی ہوئی سمجھ!'' کے مصداق سلگتی رہی تھی' چنانچہ نگاہیں دو کاموں پر مرتکز ہو گئیں۔ ایک یہ کہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے سابق رفقاء میں سے زیادہ سے زیادہ جتنے لوگ ذہنی یکسوئی اور فکری یک جہتی کے ساتھ مجتمع ہو سکیں انہیں ایک نظم میں منسلک کیا جائے تاکہ عمومی دعوت و تبلیغ اور اصلاح و تربیت کا کام منظّم طریق پر کیا جا سکے اور فریضہ شہادتِ حق اور اقامتِ دین کے لیے اجتماعی جدوجہد دوبارہ انہی خطوط پر شروع کی جا سکے جن پر جماعت اسلامی نے اپنے دورِ اوّل میں کام کا آغاز کیا تھا' اور دوسرے یہ کہ علومِ قرآنی کی نشر و اشاعت کا وسیع بندوبست کیا جائے تاکہ ذہین نوجوان قرآن حکیم کی جانب متوجہ ہوں اور اس چشمۂ علم و حکمت سے کماحقہ سیراب ہو کر اس کی ہدایت و رہنمائی کو خالص علمی انداز میں پیش کر سکیں۔

پہلے مقصد کے لیے میں نے اولاً ۱۹۵۶ء کا تحریر شدہ بیان پورے دس سال بعد (۱) ''تحریک جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا' تاکہ ایک طرف تو وہ لوگ جو جماعت اسلامی سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں اور علیحدہ ہونے والوں سے بھی کسی قدر حسنِ ظن رکھتے ہیں اور لاعلمی کے باعث حیران ہیں کہ جماعت میں ۵۷۔۱۹۵۶ء میں جو اختلافِ رائے پالیسی اور طریق کار کے بارے میں پیدا ہوا تھا اس کی صحیح نوعیت کیا تھی' ان کے سامنے اختلاف کی صحیح صورت آ سکے۔ دوسری طرف جماعت اسلامی سے منسلک احباب بھی اپنے موقف پر نظر ثانی کر سکیں اور گزشتہ نو دس سالہ جدوجہد کے نتائج کی روشنی میں غور کر سکیں کہ ۵۷۔۱۹۵۶ء میں پالیسی کے بارے میں صحیح موقف کس کا تھا؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علیحدہ ہونے والے حضرات بھی غور کریں کہ وہ جماعت میں کس مقصد سے شامل ہوئے تھے' کس بنیاد پر علیحدہ ہوئے تھے اور اب کیا کر رہے ہیں؟ (۲)

---

(۱) مولانا محمد منظور نعمانیؒ مدیر 'الفرقان' لکھنؤ نے مولانا اصلاحی صاحبؒ کے نام اپنے ایک خط میں جو 'میثاق' بابت نومبر ۱۹۶۶ء میں شائع کر دیا گیا تھا کتاب اور اس کے مؤلف کے بارے میں اس تأثر کا اظہار فرمایا کہ ''کتاب بہت خوب ہے اور آٹھ دس سال تک اس کو روکے رکھنے کا ان کا عمل تو بہت ہی قابل داد اور لائق سبق آموزی ہے''۔

(۲) ظاہر ہے کہ اگر مجھے جماعت پر کیچڑ اچھالنا مطلوب ہوتا تو میں یہ کتاب جماعت سے علیحدہ ہوتے ہی فوراً شائع کر دیتا' لیکن اس وقت کتاب تو کیا شائع ہوتی میرے استعفے کی خبر بھی اخبار میں شائع نہ ہوئی۔

پھر جب کتاب شائع ہوگئی تو فطری طور پر اس پر اخبارات اور جرائد میں بھی تبصرے ہوئے اور بہت سے حضرات نے انفرادی خطوط میں بھی اظہارِ خیال فرمایا۔ ان 'تبصروں' اور 'آراء' میں دو باتیں نہایت نمایاں تھیں۔ ایک یہ کہ کتاب کے مؤلف کے خلوص کے بارے میں بھی بالعموم اطمینان کا اظہار کیا گیا اور خود کتاب کے اسلوبِ نگارش کو بھی سراہا گیا' اور خود جماعتی حلقوں کی جانب سے یا تو حیرت کے انداز میں یا الزامی جواب کے طور پر یہ بات کہی گئی کہ جب جماعت سے علیحدہ ہونے والوں کا موقف یہ ہے تو آخر انہوں نے علیحدگی کے بعد انہی خطوط پر کسی مثبت جدوجہد کا آغاز کیوں نہیں کیا؟

اس دوسرے سوال یا الزام کے جواب میں میں نے واضح طور پر تسلیم کیا کہ اگرچہ اس کے بہت سے اسباب ہیں تاہم ہے یہ بہرحال ایک اجتماعی تقصیر اور مجموعی کوتاہی جس کی تلافی جماعت سے علیحدہ ہونے والے حضرات پر فرض ہے۔

بحمد اللہ ان تمام امور کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور ۶۷۔۱۹۶۶ء میں جماعت سے علیحدہ ہونے والے حضرات کے حلقے میں ایک ہلچل پیدا ہوگئی جسے کسی مفید اور مثبت رخ پر ڈھالنے کی کوشش میں دو بزرگوں یعنی مولانا عبدالغفار حسن اور شیخ سلطان احمد صاحب نے خصوصی حصہ لیا۔ نتیجتاً اواخر ۶۷ء میں ایک خاصا بڑا اجتماع رحیم یار خاں میں منعقد ہوا اور اس میں ایک قرارداد اور اسی کی قدرے مفصل تشریح پر اتفاق ہوگیا اور خاصی قوی امید قائم ہوگئی کہ اب یہ قافلہ واقعتاً سفر کا آغاز کر دے گا۔ (۱)

لیکن معاملہ وہی ہوا کہ ع ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!'' اور بعض 'کرم فرماؤں' کی 'کرم فرمائی' سے یہ کوشش نہ صرف یہ کہ پروان چڑھنے سے پہلے ہی ختم ہوگئی بلکہ اپنے پیچھے مایوسی و بددلی اور تشتت و انتشار کے گہرے سائے چھوڑ گئی۔ میں یہاں کسی کا نام لینا نہیں چاہتا' اس لیے کہ جس نے جو کچھ کیا اس کی جزا یا سزا وہ اپنے رب کے یہاں پالے گا. ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ط﴾ (البقرۃ: ۲۸۶)

بہرحال اس مرحلے پر میں نے خوب سوچ سمجھ کر پوری دلجمعی کے ساتھ یہ فیصلہ کر لیا کہ اب جو کچھ کرنا ہے انفرادی طور پر اور از خود کرنا ہے۔ نہ بزرگوں کے انتظار میں رہنا ہے کہ وہ آگے بڑھیں تو میں بھی چلوں' نہ سابق رفقاء کی راہ تکنی

(۱) اس قرارداد اور اُس کی توضیحات کو اس کتاب کے آئندہ باب میں سمو دیا گیا ہے (مرتب)

ہے کہ وہ ساتھ قدم ملائیں تو میں بھی سفر کا آغاز کروں۔ ہر شخص خدا کی عدالت میں انفرادی طور پر پیش ہوگا اور اپنی اپنی جوابدہی کرے گا۔ ﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝۹۵﴾ (مریم) لہٰذا کوئی اور آگے بڑھے یا نہ بڑھے اور ساتھ دے یا نہ دے' مجھے اپنی ذمہ داری کی ادائیگی کی فکر بہرحال کرنی ہے!

اب جو میں نے اپنا جائزہ لیا تو نظر آیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب حکیم کے ساتھ ایک ذہنی مناسبت بھی عطا فرمادی ہے اور کچھ قوتِ گویائی اور تحریر وتقریر دونوں کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کے اظہار پر کسی قدر قدرت سے بھی نواز دیا ہے۔ لہٰذا دین کی ایک حقیر سی خدمت جو مجھ سے بن آ سکتی ہے اور احیائے اسلام اور شہادتِ حق کی عظیم جدوجہد میں ایک حقیر سا حصہ جو میں لے سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ لوگوں کو قرآن حکیم سے روشناس اور متعارف کراؤں' کتاب اللہ کی عظمت کو اُجاگر کروں اور لوگوں کو اس کے پڑھنے اور سمجھنے کی ترغیب دلاؤں۔ یہ خدمت میری نسبت سے چاہے کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو اپنی جگہ نہایت عظیم ہوگی۔ اس لیے کہ علم وحکمت کا اصل سرچشمہ قرآن حکیم ہی ہے۔ اس سے دلوں میں ایمان اور یقین کی شمعیں روشن ہوں گی' فکر بدلے گا' سوچ بدلے گی' نقطۂ نظر تبدیل ہوگا اور اقدار (values) بدل جائیں گی۔ نتیجتاً کردار وعمل میں بھی انقلاب برپا ہوگا' اور اگر اللہ نے چاہا تو یہی عمل (process) کسی ہمہ گیر انقلابی جدوجہد کا پیش خیمہ بن جائے گا۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ!

لہٰذا میں نے اللہ کا نام لیا اور جنوری ۱۹۶۸ء سے اپنی بہتر اور بیشتر مساعی اور اپنے بہتر اور بیشتر اوقات کو اسی مقصد عظیم کے لیے وقف کر دیا' اور آج جبکہ مجھے ان خطوط پر کام کرتے سات (۱) سال کا عرصہ ہونے کو آیا ہے میں پوری

---

(۱) واضح رہے کہ یہ تقریر ۱۹۷۴ء کی ہے۔ اور بانی محترمؒ اپنی حیاتِ مستعار کے آخری لمحے تک اسی اطمینانِ کامل کے ساتھ اسی ''مقصدِ عظیم'' کے لئے وقف رہے اور زبانِ حال سے یہ شعر پڑھتے ہوئے باری تعالیٰ کی جناب میں حاضر ہو گئے۔

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم
حافظؒ

(مرتب)

طرح مطمئن ہوں کہ میرا یہ فیصلہ بالکل صحیح تھا اور واقعتاً ''کرنے کا اصل کام''
یہی تھا! فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّة!!

اپنے پیش نظر مقصد کے لیے میں نے سب سے پہلے اس امر کی کوشش کی کہ وہ چشمہ فیض پھر پورے زور شور کے ساتھ جاری ہو جائے جس کے طفیل مجھ میں قرآن حکیم کے مطالعے کا ذوق وشوق اور اس کے علم وحکمت کے نشر واشاعت کا جذبہ پیدا ہوا تھا' یعنی مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور ان کے استاذ امام حمید الدین فراہیؒ کا فکر قرآنی اور اسلوب تدبر قرآن!

اس غرض سے اوّلاً میں نے تفسیر تدبّرِ قرآن کی جلد اوّل کی طباعت واشاعت کا بیڑا اٹھایا' اور یہ سراسر اللہ تعالیٰ ہی کا فضل واحسان ہے کہ میں اس کٹھن وادی سے سرخرو ہو کر نکلا(۱)۔ اس کے معاً بعد میں نے مولانا کی وہ دو تصانیف شائع کیں جن سے میں ابتداء ہی سے بہت متأثر تھا۔ یعنی ''مبادئ تدبّر قرآن'' اور ''دعوتِ دین اور اس کا طریق کار''۔ ان پر مستزاد تھے دو چھوٹے کتابچے یعنی ''قرآن اور پردہ'' اور ''اقامت دین کے لیے انبیاء کرام کا طریق کار''۔

ثانیاً مولانا اصلاحیؒ کے ایک ہفتہ وار درسِ قرآن کا اہتمام کرشن نگر میں پہلے اپنے مکان پر اور بعد ازاں ایک مسجد میں کیا۔ اگرچہ وہ زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا اور مولانا کی علالت کے باعث جلد ہی بند ہو گیا۔

ماہنامہ 'میثاق' جو مولانا نے جون ۱۹۵۹ء میں جاری فرمایا تھا اور جس کی اشاعت کچھ عرصے سے بند تھی اس کا دوبارہ اجرا میرے اہتمام میں اور میرے ہی زیر ادارت جولائی ۱۹۶۶ء میں ہو چکا تھا(۲)

---

(۱) مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر 'صدق جدید' لکھنؤ نے تدبّرِ قرآن جلد اوّل پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا: ''حسنِ معنوی سے قبل نظر کتاب کے جمال ظاہری پر پڑتی ہے اور جم کر رہ جاتی ہے۔ کوئی تفسیر قرآن اتنی حسین وجمیل چھپی ہوئی دیکھنا یاد نہیں پڑتی۔ کاغذ' کتابت' چھپائی' جلد بندی ہر اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہے!'' اور خود راقم نے لکھا کہ ''کسی کام کی تکمیل کے بعد 'فی کم فرغتَ ؟' کے بجائے اصل سوال 'ما صنعتَ ؟' کا ہوتا ہے تو اس پر میں اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر بجالاؤں کم ہے کہ کتاب کی اشاعت میں دیر چاہے ہوگئی اس کی کتابت' طباعت' جلد بندی سب کی سب نہایت عمدہ ہوئیں۔ مولانا اصلاحی کے لیے شاید کتاب کی تصنیف بھی اتنی بڑی بات نہ ہو جتنی میرے لیے اس کی طباعت اور اشاعت۔ میں اسی پر خوش ہوں ع ''شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم!'' (میثاق مارچ واپریل ۱۹۶۸ء)

(۲) ایک ماہانہ پرچے کی ضرورت میں نے 'تحریک جماعت اسلامی' کی اشاعت کے فوراً بعد ہی محسوس کر لی تھی' چنانچہ کچھ بھاگ دوڑ کر کے ''الرسالہ'' کے نام سے میں نے ایک ماہنامے کا ڈیکلریشن بھی حاصل کر لیا تھا' لیکن جب یہ چیز مولانا اصلاحیؒ کے علم میں آئی تو انہوں نے تاکیداً فرمایا کہ 'الرسالہ' کے بجائے 'میثاق' ہی کو دوبارہ (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

جس کے ذریعے اس فکر کی اشاعت بھی ایک وسیع حلقے میں ہو رہی تھی اور مولانا اصلاحیؒ کی تفسیر اور مولانا فراہیؒ کے 'افادات' کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری تھا!

طباعت اور اشاعت کے اس سلسلے کے لیے میں نے ''دارالاشاعت الاسلامیہ' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا' جسے کوئی اور صورت موجود نہ ہونے کے باعث مجبوراً ذاتی ملکیت کی شکل دی اور واضح کر دیا کہ جیسے ہی کوئی اجتماعی ہیئت قائم ہوئی' یہ پورا سلسلہ اس کو منتقل کر دیا جائے گا۔

دوسری طرف میں نے خود اپنے درس قرآن اور اپنی بعض تحریروں اور تقریروں کی اشاعت کا سلسلہ بھی پورے اہتمام کے ساتھ شروع کر دیا۔

جہاں تک درس قرآن کا تعلق ہے اس کا آغاز اگرچہ میں نے ۱۹۶۷ء کے دوران ہی میں کر دیا تھا' چنانچہ کرشن نگر میں بھی درس کے دو حلقے قائم تھے اور ایک حلقہ کچھ عرصہ دِل محمد روڈ پر واقع ایک رفیق کے مکان پر بھی قائم رہا تھا' تاہم لاہور میں میرے درسِ قرآن کا اصل آغاز جنوری ۶۸ء میں سمن آباد میں ہوا۔

تقریب اس کی یہ ہوئی کہ میرے ایک عزیز نے اپنے مکان واقع سمن آباد میں کچھ ترمیم اور کچھ تعمیر مزید کے سلسلے میں دو کمروں کے درمیان میں سے ایک دیوار نکلوا دی جس سے ایک بڑا سا کمرہ وجود میں آ گیا جس میں کم و بیش ایک صد آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ ادھر میں اس فکر میں تو تھا ہی' میں نے فوراً تجویز پیش کر دی کہ یہاں درس قرآن ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے انہیں اس میں کیا عذر ہو سکتا تھا۔ پس ہر اتوار کی صبح کو درس کی ہفتہ وار نشست شروع ہو گئی۔

ابتدا میں حاضری ۳۵۔۳۰ تھی' کچھ ہی عرصے بعد کمرہ بھر گیا۔ صاحبِ خانہ نے ہمت کی اور ایک لاؤڈ سپیکر خرید لیا اور کمرے کے باہر برآمدے اور پھر اس کے بعد لان میں بھی نشست کا انتظام کر دیا۔ لیکن جلد ہی محسوس ہوا کہ ع ''کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے!''

مسجدِ خضراء سمن آباد سے اوّل روز ہی سے پُرزور فرمائش تھی کہ درس یہاں ہونا چاہیے! میں مساجد کے معاملے میں بہت خائف تھا۔ اس لیے کہ اول تو مسجدیں اکثر و بیشتر فرقوں اور گروہوں کی ہوتی ہیں اور وہاں ایک مخصوص مسلک سے ہٹ کر کچھ کہنا ممکن نہیں ہوتا۔ پھر ان میں چودھراہٹ کے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) زندہ کر لو۔ چنانچہ میں نے ڈیکلریشن ضائع کر دیا اور 'میثاق' ہی کا اجرا کر دیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان ہی دنوں مولانا وحید الدین خاں دہلی سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ انہیں ''الرسالہ'' کا نام اس درجہ پسند آیا کہ اُسی کو اپنے جریدے کے لیے اختیار کر لیا!

لیے رسہ کشی بھی ہوتی رہتی ہے' تاہم جب ضرورت متقاضی ہوئی تو میں نے دعوت قبول کر لی اور درس گھر سے مسجد میں منتقل ہو گیا۔ وہاں اجتماعِ جمعہ میں تقریر کا سلسلہ پہلے ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ اس طرح مسجد خضراء اس قرآنی تحریک کا مرکز بن گئی۔

بعد میں مسجد خضراء میں ایک طویل عرصے تک جو غیر معمولی اور مثالی حالات رہے ان کے پیش نظر مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں اس کام کو شرفِ قبول حاصل ہو چکا تھا اور اس کی خصوصی تائید و توفیق اسے حاصل تھی۔

اسی تائید ایزدی کا نتیجہ تھا کہ جلد ہی لاہور میں اس حلقۂ درس کی دھوم ہو گئی اور اتوار کی صبح کو جبکہ عموماً طبائع پر کسل کا غلبہ بھی ہوتا ہے اور اکثر لوگوں نے بہت سے کام بھی ہفتہ وار چھٹی کے خیال سے رکھے ہوئے ہوتے ہیں بغیر کسی جماعتی تعلق یا تنظیمی بندھن کے' اور بغیر کسی ہنگامی یا سیاسی مسائل کی چاشنی کے' خالصۃً قرآن مجید کا درس سننے کے لیے آنے والے لوگوں کی تعداد تین ساڑھے تین صد تک پہنچ گئی' جن میں اکثریت پڑھے لکھے ہی نہیں' اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی ہوتی تھی۔

درآنحالیکہ درس دینے والا نہ عالم تھا نہ فاضل' نہ اس کے پاس کسی دارالعلوم کی سند تھی نہ کسی خانقاہ کا اجازت نامہ! بلکہ خود اپنے قول کے مطابق اس کی حیثیت محض ایک طالب علم کی تھی ۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

اس حلقۂ درس کا چرچا صرف لاہور تک محدود نہ رہا بلکہ کچھ تو لاہور آنے جانے والے لوگوں کے طفیل اور زیادہ تر ان حضرات کے ذریعے جو پہلے لاہور میں تھے اور درس میں شریک ہوتے تھے' بعد ازاں تبدیل ہو کر یا نقل مکانی کر کے دوسرے مقامات پر چلے گئے' اس کا ذکر دور دراز تک پہنچ گیا' اور میں اس حقیقت کو چھپانے کا ہرگز خواہشمند نہیں بلکہ ﴿وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ ۝۱۱﴾ (الضحی) کے مصداق اس کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے بڑی خوشی ہوئی جب مجھے معلوم ہوا کہ اس حلقۂ درس کے چرچے حرمین

شریفین میں بھی ہوئے اور ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بھی۔ ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝﴾ (الحدید)

اس حلقہ میں سب سے پہلے تقریباً چھ ماہ میں نے مطالعۂ قرآن حکیم کے اسی منتخب نصاب کا درس دیا جو اب ارتقائی مراحل طے کر کے گویا تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ بعد ازاں قرآن حکیم کا آغاز سے سلسلہ وار درس شروع کر دیا۔ ابتدا میں مجھے اندیشہ تھا کہ شاید اس مرحلے پر لوگوں کی دلچسپی برقرار نہ رہے لیکن صورت اس کے بالکل برعکس ہوئی اور بحمد اللہ شوق بڑھتا ہی گیا۔ ۱۹۷۰ء کے اواخر اور ۱۹۷۱ء کے آغاز میں علالت اور سفر حج وغیرہ کے باعث چار ماہ کے تعطل کے بعد جب اس حلقے میں دوبارہ درس کا آغاز ہوا تو ایک بار پھر میں نے منتخب نصاب ہی کا درس دیا' اور اس کے بعد سلسلہ وار مطالعہ شروع کر دیا' اور اب تقریباً ساڑھے چھ سال بعد ہم اس حلقے میں قرآن مجید کے چودھویں پارے کا مطالعہ کر رہے ہیں! (یہ ذکر ۱۹۷۴ء کا ہے!)

اس حلقے کا نقطۂ عروج تھا اگست ۱۹۷۲ء میں منعقد شدہ ایک دس روزہ تربیتی کیمپ جس میں پھر روزانہ تین اسباق کی شرح سے پورے منتخب نصاب کا درس دیا گیا اور جس کے دوران میں مسجد خضراء کا منظر واقعی ایسا تھا جیسے قرآن حکیم کا ایک حقیقی جشن منایا جا رہا ہو۔

اس کے علاوہ لاہور میں متعدد مقامات پر درس کے حلقے قائم ہوئے جس میں کہیں ہفتہ وار اور کہیں ماہوار درس ہوتے رہے اور اس طرح لاہور کی آبادی کے ایک خاصے قابل لحاظ حصے تک قرآن کی دعوت پہنچا دی گئی!

لاہور میں میرے اس کام کا ذکر سن کر کراچی سے بھی چند اصحاب جن کی اکثریت سے تعارف جماعت اسلامی کے سابق تعلق ہی کی بنا پر تھا غالباً اگست ۱۹۷۱ء میں لاہور آئے اور اس طرح کراچی میں بھی اس دعوتِ قرآنی کا آغاز ہوا' اور خود میری آمد و رفت کا بھی ایک مستقل سلسلہ شروع ہو گیا! جس کے دوران گاہے گاہے ملتان' رحیم یار خان' صادق آباد اور سکھر میں بھی قیام ہو جاتا تھا اور درسِ قرآن کی نشستیں منعقد ہو جاتی تھیں۔

درس قرآن کے اس روز افزوں سلسلے کے ساتھ ساتھ میں نے اپنی بعض تحریریں بھی کتابچوں کی صورت میں شائع کرنی شروع کیں۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی ''اسلام کی نشاۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام''، جس کا علمی حلقوں میں بہت خیر مقدم ہوا۔ چنانچہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے ایک مفصل تحریر

اس کی تحسین اور تائید میں لکھی[(۱)] اور جناب صفدر میر نے ایک پورا مقالہ 'پاکستان ٹائمز' کے ادارتی صفحات میں شائع کیا۔ بحمد اللہ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو گئے ہیں یہ اس لیے کہ اس کی حیثیت گویا اس قرآنی تحریک کے اساسی مینی فسٹو کی بن گئی تھی اور ہے!

دوسرے نمبر پر میری ایک تقریر شائع ہوئی ''قرآن اور امن عالم''۔

اور پھر شائع ہوا وہ کتابچہ جسے اللہ نے وہ قبولِ عام عطا فرمایا کہ باید و شاید! یعنی ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' جس کا پہلا ایڈیشن دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گیا' چنانچہ دوسری بار اسے دس ہزار کی تعداد میں شائع کرنا پڑا اور وہ بھی اب قریباً قریباً ختم ہے۔[(۲)] جس کا انگریزی ترجمہ پروفیسر محمد ابراہیم مرحوم و مغفور نے ایسی محبت اور عقیدت کے ساتھ کیا جو الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی' اور جس کا عربی ترجمہ پہلے ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع ہونے والے ماہنامے ''البعث الاسلامی'' میں قسط وار شائع ہوا اور بعد میں کتابچے کی صورت میں' اور جسے عوام نے بھی پسند کیا اور خواص نے بھی' جس کی حضرات علماء نے بھی تحسین و تصویب فرمائی اور انگریزی تعلیم یافتہ حضرات نے بھی قدر کی اور داد دی۔ جس کے بارے میں پروفیسر چشتی صاحب نے فرمایا کہ ''بلاشبہ یہ مضمون لکھ کر ڈاکٹر صاحب نے اپنے لیے سعادتِ اخروی کا بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے!'' اور مولانا اصلاحی صاحب نے دعا دی کہ ''اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے قلم میں برکت دے کہ وہ ایسی بہت سی چیزیں لکھنے کی توفیق پائیں!'' فللّٰہ الحمد والمنّۃ!

قصّہ مختصر یہ کہ ان حلقہ ہائے درسِ قرآن اور اس سلسلۂ مطبوعات نے مل جل کر اس 'دعوتِ قرآنی' کو ایک تحریک کی صورت دے دی جس نے ۱۹۷۲ء میں پہلے تنظیمی مرحلے میں قدم رکھ دیا۔

---

(۱) میرے اس اصل مضمون اور چشتی صاحب کی تائیدی تحریر کے بارے میں مولانا عبد الماجد دریابادیؒ نے ''صدقِ جدید'' بابت ۷ فروری ۱۹۶۹ء میں تحریر فرمایا:

''دونوں مقالے ماہنامہ 'میثاق' لاہور میں قسط وار نکل چکے ہیں' دونوں کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ دونوں فکر انگیز ہیں اور ایک طرف جوش و اخلاص اور دوسری طرف دانش اور باریک بینی کے مظہر ہیں۔ مرض کی تشخیص اور تدبیر علاج دونوں میں دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ تشخیص اور علاج اناڑیوں اور عطائیوں کا سا نہیں۔ رسالہ ہر پڑھے لکھے کے ہاتھ میں جانے کے قابل ہے......''

(۲) اس کے بعد اس کے متعدد مزید ایڈیشن طبع ہو کر ختم ہو چکے ہیں' اور یہ کتابچہ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکا ہے۔ جون ۲۰۰۹ء میں اس کا ۳۸واں ایڈیشن طبع ہوا ہے۔

دین کی اس چھوٹی سی خدمت کا آغاز‘ جس نے بعد میں ’دعوت رجوع الی القرآن‘ اور ’تحریک تعلیم وتعلّمِ قرآن‘ کی شکل اختیار کر لی‘ میں نے اوائل ۱۹۶۸ء میں بالکل تن تنہا کیا تھا اور اس میں مجھے سوا مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی دعا اور اشیر باد کے کسی پرانے بزرگ یا رفیق کا تعاون حاصل نہیں تھا‘ بلکہ ان میں سے کچھ حضرات کی جانب سے تو مجھے باقاعدہ مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا‘ جو بعض کی طرف سے تو اعلانیہ اور کھلم کھلا تھی اور بعض کی طرف سے خفیہ اور در پردہ......اور یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا فضل وکرم ہے کہ میں ان سے دل برداشتہ نہیں ہوا بلکہ کامل یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہا۔

تاہم یہ واقعہ ہے کہ ابتدا میں مجھے محنت بہت شدید کرنی پڑی۔ چنانچہ ایک طرف مطب اور اس کی ذمہ داریاں‘ دوسری طرف درس ہائے قرآن اور خطاباتِ عام‘ تیسری طرف ماہنامہ ’میثاق‘ کی ادارت اور اس کا اہتمام و انتظام[1]‘ اور چوتھی طرف دارالاشاعت اور اس کی گوناگوں مصروفیات۔ الغرض بالکل مختلف بلکہ متضاد النوع مصروفیات کی کشاکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو ہی سال کی مدّت میں صحت نے جواب دے دیا اور مستقل حرارت رہنے لگی جو شام کے وقت باقاعدہ بخار کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔

ابتدا میں مَیں نے اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی‘ پھر مجبوراً تشخیص کی طرف توجہ کرنی پڑی‘ لیکن بہت سی تحقیق وتفتیش سے جب کوئی حتمی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو طے پایا کہ آرام کیا جائے۔ چنانچہ دو تین ہفتوں کے لیے لاہور سے باہر جا کر آرام کیا۔ لیکن واپس آکر دوبارہ کام شروع کیا تو پھر وہی صورت پیدا ہوگئی۔ بالآخر کچھ اسی بددلی کے باعث اور کچھ بعض دوسرے اسباب کی بنا پر میں نے طے کیا کہ چار چھ ماہ ملک سے باہر بسر کیے جائیں۔ اب ظاہر ہے کہ بیرونِ ملک ارضِ مقدس سے بہتر جگہ اور کون سی ہوسکتی تھی‘ چنانچہ اواخرِ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں مَیں عازمِ حجاز ہوگیا۔

رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ میں نے پورا مدینہ منورہ میں مولانا عبدالغفار حسن صاحبؒ کی معیت میں بسر کیا۔ اس کے بعد میں ایک ماہ کے لیے برادرِ عزیز ڈاکٹر ابصار احمد سلّمہٗ کی دعوت پر لندن چلا گیا۔ وہاں سے واپس پھر حجاز آیا اور فروری ۱۹۷۱ء میں جامیؔ کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

---

(۱) اب غور کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ۱۹۶۹ء کے دوران ’میثاق‘ ہر ماہ ۸۰ صفحات پر مشتمل شائع ہوتا رہا تھا اور اس کی کل ذمہ داری مجھ پر تھی!

مشرف گرچہ شد جامؔی ز لطفش
خدایا آں کرم بارے دگر کن!

حجِ بیت اللہ سے دوسری بار مشرف ہوا۔

اس پورے عرصے کے دوران میں میں مسلسل آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچتا رہا اور بالآخر سرزمین حجاز میں حج ہی کے مبارک موقع پر میں نے اپنی زندگی کا اہم فیصلہ کرلیا......یعنی یہ کہ آئندہ مطب کا سلسلہ بالکل بند اور جتنی بھی مہلتِ عمر بقایا ہے سب کی سب وقف برائے خدمتِ کتاب اللہ وسعیِ اعلاءِ کلمۃ اللہ!

نتیجتاً مارچ ۱۹۷۱ء میں ارضِ مقدس سے واپسی پر جب بالکل یکسو ہو کر از سرنو کام کا آغاز کیا تو چند ہی ماہ میں اس نے اتنی وسعت اختیار کرلی کہ ایک تنظیمی ڈھانچے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

اس ضرورت کے احساس کو کچھ تقویت اس سے بھی حاصل ہوئی کہ اس وقت تک طباعت و اشاعت کا سارا کام میرے ایک ذاتی ملکیتی ادارے کے تحت ہو رہا تھا' اور اگرچہ اس میں یافت کچھ بھی نہ تھی تاہم لوگوں کو ان مطبوعات کی اشاعت کی ترغیب دلانے میں مجھے خود بھی حجاب محسوس ہوتا تھا' اور بعض بزرگوں نے بھی توجہ دلائی کہ یہ بات کچھ اچھی نہیں لگتی! چنانچہ خیال آیا کہ کوئی ادارہ قائم کیا جائے اور طباعت و اشاعت کا سارا سلسلہ اس کے حوالے کر دیا جائے' تاکہ دوسرے مصنفین کی کتابوں کی اشاعت سے بھی اگر کچھ بچت ہو تو وہ کسی فرد کی کمائی نہ بنے بلکہ ادارے کی ملکیت ہو۔ رہی میری تحریریں تو ان پر تو نہ کوئی منفعت ادارہ حاصل کرے نہ میں ہی کوئی حقِ تالیف وصول کروں' تاکہ میں پورے انشراحِ صدر کے ساتھ کہہ سکوں کہ میرا کوئی مفاد ان کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس پورے کام کو محض رسماً تو کرنا مقصود نہیں تھا' اصل پیش نظر تو یہ تھا کہ یہ ایک صحیح اسلامی دعوت کی تمہید بنے اور دعوتِ حق کے مزاج سے اس چیز کو کوئی ادنیٰ مناسبت بھی حاصل نہیں کہ داعی اپنی دعوتی تحریروں کی رائلٹی کو اپنی معاش کا ذریعہ بنائے۔ 'داعی الی اللہ' کا مقام اور مرتبہ تو بہت ہی بلند ہے اور اس کے لیے تو لازم ہے کہ واضح طور پر یہ کہہ سکے کہ ﴿وَمَا اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۱۰۹﴾ (الشعراء) دین کی کسی ادنیٰ خدمت میں بھی کوئی شخص کسی ادارے یا جماعت

سے ایک معین مشاہرہ بقدرِ کفاف لے لے تو اس کی گنجائش تو نکل سکتی ہے، لیکن کسی دینی خدمت کے ضمن میں تحریر یا تقریر کو ذریعۂ معاش بنانا تو کسی درجے میں بھی مناسب نہیں! چنانچہ ماضی قریب تک ہمارے بزرگوں کا دستور یہ رہا کہ ساری عمر مختلف اداروں یا دارالعلوموں میں نہایت قلیل مگر معین مشاہروں پر گزارہ کرتے ہوئے بسر کر دی اور اس پورے عرصے کے دوران میں جو کچھ لکھا اسے ہوا اور پانی کی طرح مباح کر دیا کہ جو شخص چاہے شائع کرے، اپنا کوئی حقِ تصنیف اس پر نہیں رکھا—— میں اگرچہ ذاتی طور پر تو پہلے ہی اس طریق پر عمل پیرا ہو چکا تھا، چنانچہ ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کا پہلا ایڈیشن اگرچہ شائع تو ''دارالاشاعت الاسلامیہ'' کے تحت ہوا تھا، لیکن اس پر لکھ دیا گیا تھا کہ ''اس کتابچے کی طباعت واشاعت کی ہر شخص کو کھلی اجازت ہے![1]'' تاہم اب ضرورت محسوس ہوئی کہ پورے سلسلۂ طباعت کو ایک نظام کے تحت لے آیا جائے۔

بہرحال، ان گوناگوں اسباب سے ایک ہیئتِ تنظیمی کی ضرورت محسوس ہوئی، اور چونکہ یہ بات بالکل واضح تھی کہ ''سمع وطاعۃ'' کے ٹھیٹھ اسلامی اصولوں پر مبنی نظمِ جماعت کا قیام ابھی بہت قبل از وقت تھا، لہٰذا ذہن ایک انجمن کی تشکیل کی جانب منتقل ہوا کہ ''SERVANTS OF BIBLE SOCIETY'' کے طرز پر ''انجمن خدام القرآن'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جائے۔

اب جو غور کیا تو محسوس ہوا کہ تنظیمی اعتبار سے 'انجمن' ﴿اِنَّ اَوۡهَنَ الۡبُيُوۡتِ لَبَيۡتُ الۡعَنۡكَبُوۡتِ ﴾[2] کا کامل مصداق ہوتی ہے اور عام طور پر اس کے قواعد وضوابط کا جو ڈھانچہ بنایا جاتا ہے اس کی بنا پر وہ موم کی ناک بن کر رہ جاتی ہے کہ جدھر چاہے موڑ لی جائے، بلکہ بسا اوقات انجمن اپنے مؤسسین کے مقصد ومنشا کے بالکل خلاف رُخ پر چل پڑتی ہے اور ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ وہ مؤسس یا مؤسسین جنہوں نے کسی انجمن کی تاسیس اور داغ بیل ڈالنے میں خون پسینہ ایک کیا ہوتا ہے اس طرح نکال دیے جاتے ہیں جیسے دودھ سے مکھی۔

دوسری طرف ایک عرصہ تک غور وفکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا اور مجھ پر یہ بات شدت

---

(۱) اس کتابچے کا انگریزی ترجمہ بھی پروفیسر محمد ابراہیم مرحوم ومغفور نے بالکل بلا معاوضہ کیا اور جب وہ طبع ہوا تو اس پر بھی تصریح کر دی گئی کہ اس پر کسی فرد یا ادارے کا کوئی حق 'محفوظ' نہیں ہے، جو چاہے شائع کرے۔ بعد ازاں اس کا فارسی ترجمہ بھی پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد مرحوم نے از خود اور بالکل بلا معاوضہ کیا!

(۲) ''یقیناً تمام گھروں میں کمزور ترین گھر مکڑی کا ہوتا ہے''۔ (العنکبوت: ۴۱)

کے ساتھ منکشف ہو چکی تھی کہ اسلام کا تنظیمی مزاج نہ صرف یہ کہ دورِ جدید کی جماعت سازی کے طریقوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا بلکہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ عہد حاضر میں کسی بھی ہیئتِ تنظیمی کی اصل اساس اس کے 'دستور اور قواعد وضوابط' ہوتے ہیں جن سے عہدِ وفاداری استوار کر کے لوگ اس ہیئتِ تنظیمی میں شریک ہوتے ہیں۔ پھر یہ لوگ اپنے میں سے کثرتِ رائے سے اپنا ایک صدر چنتے ہیں جسے صرف ایک آئینی سربراہ کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور جس کا انتخاب محض ایک معینہ مدت کے لیے ہوتا ہے۔ پھر اس صدر اور عام اراکین کے مابین ایک اور ادارہ مجلس عاملہ وغیرہ ناموں سے قائم کیا جاتا ہے جس کی اصل غرض اس صدر کی 'نگرانی' ہوتی ہے۔ آگے اس صدر اور مجلس عاملہ یا منتظمہ کے مابین حقوق و اختیارات کی تقسیم کے مختلف طریقوں کی بنیاد پر صدارتی یا پارلیمانی طرز ہائے جماعت وجود میں آتے ہیں، لیکن ان سب میں یہ امر بطور قدرِ مشترک موجود ہوتا ہے کہ تنظیمی ڈھانچہ نیچے سے اوپر کی جانب بڑھتا ہے۔ یعنی اس میں اصل حیثیت بنیادی رکنیت (primary membership) کو حاصل ہوتی ہے نہ کہ صدر یا سربراہ کو!

اس کے برعکس اسلام کا تنظیمی ڈھانچہ اوپر سے نیچے کی طرف بڑھتا ہے، یعنی کوئی شخص معین جسے اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرماتا ہے، دین کی کسی خدمت کے داعیے سے سرشار ہو کر اٹھتا ہے اور لوگوں کو پکارتا ہے کہ "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ" کون ہے جو اللہ کے دین کی اس خدمت میں میرا دست و بازو بننے کے لیے تیار ہو؟ اور جنہیں اللہ توفیق دیتا ہے وہ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ شخص معین آپ سے آپ ان کا سربراہ بن جاتا ہے اور اسے کسی کے ووٹوں سے 'منتخب' ہونے کی ہرگز کوئی حاجت نہیں ہوتی۔ پھر یہ کہ وہ محض ایک دستوری اور آئینی سربراہ نہیں ہوتا بلکہ 'امیر' یعنی 'صاحبِ امر' ہوتا ہے اور رہنمائی کی اصل ذمہ داری اسی کے کاندھوں پر ہوتی ہے۔ وہ اپنے رفقاء سے مشورہ ضرور کرتا ہے لیکن اپنی ضرورت کے احساس کے تحت نہ کہ ان کا حق ادا کرنے کی خاطر...... یہ ایک ایسا فطری نظمِ جماعت ہے جس میں قواعد وضوابط اور دخول وخروج کے لمبے چوڑے قوانین وضع کرنے کی حاجت ہی نہیں ہوتی۔ جس شخص کو جس قدر اتفاق اس دعوت کے ساتھ اور جتنا اعتماد اس داعی کی ذات پر ہوتا ہے اتنا ہی وہ اس کے ساتھ تعاون کرتا ہے، اور جب اور جتنی کمی ان دونوں چیزوں میں واقع ہو جائے اسی مناسبت سے دوری اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ جنہیں اس کے ساتھ کامل اتفاق اور اس پر پورا اعتماد ہو جاتا ہے وہ اس کے ہاتھ پر "بیعت" کر کے اس کے ساتھ سمع و طاعت کے ایک شخصی رابطے میں منسلک

ہو جاتے ہیں اور اسی کو اس ہیئتِ تنظیمی کے اصل مرکز (nucleus) کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے!

بنا بریں میں نے یہ طے کیا کہ اگرچہ ابھی سمع و طاعت کے اصول پر مبنی ایک ٹھیٹھ اسلامی نظم جماعت کے قیام کا وقت تو نہیں آیا اور سرِ دست صرف ایک انجمن ہی قائم کی جائے جس کے تحت اس 'دعوت رجوع الی القرآن' اور 'تحریک تعلیم و تعلّمِ قرآن' کے کم از کم ان جملہ امور کو منضبط کر لیا جائے جن کا تعلق روپے پیسے سے ہو' تاہم اس کا تنظیمی ڈھانچہ عام انجمنوں کی طرز پر نہ ہو جس کے بارے میں علامہ اقبال نے اپنے ظریفانہ کلام میں بہت خوب کہا ہے کہ:

الیکشن' ممبری' کرسی' صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

بلکہ اسی فطری طرز پر ہو جس کی وضاحت میں کر چکا ہوں' اور چونکہ مجھے اس پر پورا انشراحِ صدر حاصل تھا 'لہٰذا میں نے اسے ہرگز مخفی نہیں رکھا بلکہ اواخر ۱۹۷۱ء ہی میں جبکہ ایک انجمن کے قیام کی تجویز ابتدائی مراحل میں تھی' میں نے متعدّد بار مسجد خضراء میں درس قرآن کے بعد اپنا ذہن کھول کر حاضرین کے سامنے رکھ دیا اور پھر جولائی ۱۹۷۲ء کے 'میثاق' میں 'مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' کے مجوزہ خاکے کے ساتھ بھی میں نے 'تذکرہ و تبصرہ' کے صفحات میں اپنا نقطۂ نظر پوری وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا۔

اس کا ردِّعمل بھی وہی ہوا جس کی اس 'جمہوریت نواز' بلکہ 'جمہوریت پرست' دور میں مجھے پہلے سے توقع تھی' چنانچہ مذاق بھی اڑایا گیا اور پھبتیاں بھی کسی گئیں۔ لیکن الحمدللّٰہ والمنۃ کہ لاہور میں جن لوگوں نے اس کام میں میرے ساتھ تعاون کا بیڑا اٹھایا تھا ان میں سے کسی ایک نے بھی اختلاف نہیں کیا اور بالآخر اواخر ۱۹۷۲ء میں 'مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور' انہی اصولوں پر بالفعل قائم ہو گئی اور اس طرح یہ چھوٹی سی اسلامی تحریک اپنے پہلے تنظیمی مرحلے میں داخل ہو گئی۔

اس مرحلے پر عام لوگوں کے استہزاء کی تو میں نے کوئی پروا نہ کی لیکن بعض بزرگوں کا شدید اختلاف میرے لیے بڑی آزمائش بن گیا۔ ان حضرات کی خدمت میں َمیں نے بصد ادب عرض کیا کہ دلائل سے میری رائے

تبدیل ہو جائے تو میں یقیناً رجوع کرلوں گا لیکن محض لحاظِ بزرگی کے باعث یا صرف پاسِ ادب کے طور پر میں اپنا قدم واپس نہیں لے سکتا۔اس سے کچھ شکر رنجیاں بھی ہوئیں اور بعض معاملات میں Re-Adjustments بھی کرنی پڑیں' لیکن بحمدِ اللہ کام رُکا نہیں بلکہ قافلہ رواں ہی رہا!

اس کے بعد مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی دوڈھائی سال کی کارکردگی کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا تھا جسے یہاں حذف کیا جارہا ہے' اس لیے کہ اب بحمداللہ

''دعوت رجوع الی القرآن کا منظروپس منظر''

نامی کتاب شائع ہوچکی ہے جس میں جملہ تفاصیل موجود ہیں۔(شائع کردہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور)

قصہ مختصر یہ کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں اس عرصے میں پوری طرح مصروف رہا ہوں اور جہاں تک میرے اوقات اور میری حقیرسی قوتوں اور صلاحیتوں کا تعلق ہے ان کا پورا مصرف انجمن ّخدام القرآن کے تحت ہورہا ہے اور بحمداللہ اپنی حقیرسی محنت کے نتائج سے بھی میں نہ بددل ہوں نہ مایوس' تاہم اس پورے عرصے کے دوران میں ایک خلش میرے دل میں مسلسل موجود رہی ہے اور یہ سوال بار بار ذہن میں اُبھرتا رہا ہے کہ کیا اس طرح میری تمام دینی ذمہ داریاں پوری ہورہی ہیں اور میں اپنے جملہ فرائضِ دینی سے عہدہ برآ ہورہا ہوں؟ اور کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے اپنے اصل فرائض سے پہلوتہی کرنے کی غرض سے گریز کی راہ اختیار کرلی ہو۔اور ایک باقاعدہ جماعت کے قیام اور شہادتِ حق اور اقامتِ دین ایسے کٹھن فرائضِ دینی کی ''تپتی راہوں'' سے فرار کی خاطر ایک انجمن اور اس کے تحت صرف درس وتدریس اور طباعت واشاعت کی ''ٹھنڈی چھاؤں'' میں بسیرا کرلیا ہو؟[1]

میں نے اپنی سوچ کا جو پس منظر اور اپنے فکر کا جو ''شجرۂ نسب'' آج تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اس کے پیشِ نظر اس بات کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں اس محدود اور جزوی کام پر پوری

---

(۱) تپتی راہیں مجھ کو پکاریں دامن پکڑے چھاؤں گھنیری (جگر مرادآبادی)

طرح مطمئن ہوسکتا۔ چنانچہ انجمن خدام القرآن کے مجوزہ خاکے کی اس اشاعت کے ساتھ ہی جولائی ۱۹۷۲ء کے 'میثاق' میں جو تصریحات میں نے شائع کی تھیں ان میں بھی یہ الفاظ موجود ہیں کہ:

''واضح رہے کہ راقم الحروف اپنی ذہنی ساخت اور مزاج وطبع کی افتاد کے اعتبار سے محض انجمن سازی پر نہ کبھی پہلے مطمئن ہوسکا ہے اور نہ اب مطمئن ہوسکتا ہے' بلکہ اس کے پیش نظر بحمد اللہ اعلائے کلمۃ اللہ اور اظہارِ دینِ حق کا بلند و بالا نصب العین ہے اور اس کے لیے ایک ہمہ گیر جدوجہد ہی اس کی زندگی کا اصل مقصد ہے...... پھر یہ بات بھی اس پر بخوبی واضح ہے کہ یہ کام انجمنوں کے ذریعے نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لیے لازم ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ایک قولِ مبارک کے مطابق سمع وطاعت اور جہاد و ہجرت کی بنیادوں پر باقاعدہ ایک جماعت قائم کی جائے' اور اسے امید واثق ہے کہ بفضلہٖ تعالیٰ اس کی زندگی میں یہ مرحلہ بھی ضرور آ کر رہے گا' تاہم ابھی نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا مناسب وقت کب آئے گا اور فی الوقت ان مقاصدِ عظیمہ کی اصل جدوجہد کی تمہید کے طور پر صرف تعلیم وتعلّمِ قرآن کے جزوی کام پر اکتفا کیے ہوئے ہے اور پیش نظر انجمن کی حیثیت اس جزوی کام کے بھی ایک شعبے کی ہے۔ چنانچہ مجوزہ انجمن کی قراردادِ تاسیس کے الفاظ سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ''منبع ایمان و یقین یعنی قرآن حکیم کے علم وحکمت کی وسیع پیمانے پر تشہیر واشاعت'' بجائے خود مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود یعنی ''اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی'' کی شرطِ لازم یعنی ''تجدید ایمان کی عمومی تحریک'' برپا کرنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہے''۔ (ماہنامہ 'میثاق' بابت جولائی ۱۹۷۲ء)

بایں ہمہ مجھے اپنی کمزوریوں' خامیوں اور کوتاہیوں کا شدید احساس اس راہ میں پیش قدمی سے روکے رہا۔ اس لیے کہ جیسا کہ میں پہلے تفصیل سے بیان کر چکا ہوں میرے نزدیک مدرّس اور معلّم کا مقام اور ہے' داعی کا مقام اور[1]! مدرّس یا معلم کا کام بات سمجھا کر یا راستہ دکھا کر ختم ہو جاتا ہے جبکہ داعی کا فرض یہ ہوتا ہے کہ خود آگے بڑھے اور نہ صرف یہ کہ لوگوں کو اپنے ساتھ آنے کی دعوت دے بلکہ خود راہِ عزیمت پر گامزن ہوکر دوسروں کے لیے مثال اور نمونہ پیش کرے' اور ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری نہایت کٹھن ہے اور اس کی شرائط بہت سخت ہیں! میں نے جب بھی کبھی اپنے آپ کو ان تقاضوں

---

(۱) بقول علامہ اقبال مرحوم:

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — ملا کی اذاں اور! مجاہد کی اذاں اور!
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

کے اعتبار سے تولا تو محسوس ہوا کہ میں اس مقام کے کم از کم معیار پر بھی پورا نہیں اترتا۔ لہٰذا اپنے آپ کو اس راہ میں اقدام سے روکے رکھنے ہی میں عافیت نظر آئی۔

لیکن اِدھر کچھ عرصے سے بعض باتیں ایسی سامنے آئیں جنھوں نے مجھے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔

یہ خدشہ تو‘ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں‘ مجھے پہلے بھی تھا کہ کہیں میرا نفس عافیت کوشی کی خاطر مجھے گریز اور فرار کی راہیں نہ سجھا رہا ہو۔ لیکن ایک بزرگ[۱] نے یہ اندیشہ بھی پوری شدت کے ساتھ پیش کیا کہ یہ کہیں شیطان کا وسوسہ ہی نہ ہو اور ایسا نہ ہو کہ اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے اقرار اور اعترافِ تقصیر کے پردے میں دراصل وہی دشمن ازلی راستہ روکے کھڑا ہو اور معاملہ وہی ہو کہ: ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری!

پھر یہ بات بھی سامنے آئی کہ معصومیت خاصۂ نبوت ہے اور نبوت کا دروازہ بند ہو چکا! امامت معصومہ کے قائلین کے لیے تو گنجائش ہو سکتی ہے کہ وہ حالتِ انتظار ہی میں رہیں‘ لیکن دوسروں کے لیے تو ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ وہ جیسے بھی ہوں اپنی اصلاح اور تربیت کی فکر کرتے ہوئے فرائض کی انجام دہی پر کمربستہ ہو جائیں۔ پھر یہ بات بھی چاہے کلیۃً صحیح نہ ہو‘ جزوی حقیقت ضرور ہے کہ کام خود بہترین مربی ہے اور اصلاح و تربیت کے بعض تقاضے اس کے بغیر پورے ہو ہی نہیں سکتے کہ انسان اللہ کا نام لے کر کام کا آغاز کر دے اور منجدھار میں کود پڑے!

پھر یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ اگرچہ راہ نہایت پُرخطر ہے اور جو غلطیاں دوسروں سے ہوئیں کوئی ضمانت نہیں کہ ویسی ہی نہیں ان سے بھی کہیں زیادہ بڑی غلطیوں کا صدور تم سے نہ ہو گا‘ یا جو لغزشیں یا کوتاہیاں دوسروں سے ظاہر ہوئیں تم ان سے محفوظ رہو گے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر عین ممکن ہے کہ جس طرح ماضی میں بہت سے لوگ دین کی خدمت کے داعیے کے تحت کھڑے ہوئے اور ﴿اَعۡطٰی قَلِیۡلًا وَّ اَکۡدٰی ﴿۳۴﴾﴾ (النجم)[۲] کے مصداق تھوڑے سے خیر کے ساتھ بہت سا شر پیدا کر گئے اسی طرح تم بھی کسی فتنے کی داغ بیل ڈال کر چلتے بنو...... لیکن ان خدشات و خطرات سے فرض

---

(۱) حاجی عبدالواحد مرحوم (۲) ”اور دیا کچھ تھوڑا سا اور فوراً رک گیا!“

تو ساقط نہیں ہو جاتا اور خطرات کی پیش بندی کا یہ طریق تو بہر حال صحیح نہیں ہے کہ سرے سے کام ہی نہ کیا جائے۔ زندگی بذاتِ خود ایک عظیم چیلنج ہے جس کا مواجہہ ہر ذی حیات کے لیے لازم ہے' اِلّا آنکہ وہ زندگی ہی سے مستعفی ہو جائے۔ اسی طرح اسلام و ایمان بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ انسان کے کاندھے پر لا ڈالتے ہیں جن کے شعور سے انسان پر بجا طور پر لرزہ طاری ہوتا ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم: ؎

چوں می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا اِلٰہ را

......لیکن ان سے جی چرانا اور فتنوں کے اندیشے سے وہ روش اختیار کرنا جس پر قرآن حکیم کا وہ فتویٰ راست آئے کہ ﴿اَلَا فِی الۡفِتۡنَۃِ سَقَطُوۡا ؕ﴾ (التوبۃ:۴۹)[1] یقیناً دانش مندانہ روش نہیں!......جن لوگوں کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ صلوٰۃ و صوم اور حج و زکوٰۃ کے علاوہ بھی دین کا کوئی تقاضا اور مطالبہ ہے' وہ تو شاید اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی عذر پیش کر سکیں' لیکن جن پر یہ بات منکشف ہو چکی ہو کہ شہادتِ حق اور اقامتِ دین بھی مسلمان کے دینی فرائض میں شامل ہیں اور وہ ان کے بارے میں عنداللہ مسئول ہیں' ان کے لیے تو ایک ہی راہ ممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کی نصرت و حمایت کی امید پر اور اسی سے ہدایت و استقامت کی دعا کرتے ہوئے ان فرائض کی ادائیگی پر کمر بستہ ہو جائیں۔ اس کے سوا ''مَعۡذِرَۃً اِلٰی رَبِّکُمۡ'' کی بھی کوئی سبیل کم از کم قرآن حکیم سے تو معلوم نہیں ہوتی! گویا بقول شاعر: ؎

تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ
مرحلہ سخت ہے اور جان عزیز!

دوسری طرف بعض حضرات نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ تم لوگوں کے سامنے دین کے مطالبات تو بہت بلند و بالا بیان کرتے ہو لیکن ان کی ادائیگی کی کوئی عملی صورت ان کے سامنے نہیں آتی۔ تم نے خود جو کام عملاً شروع کیا ہے اس میں لوگوں کی شرکت کے مواقع بہت محدود ہیں۔ ''تحریک تعلیم و تعلّمِ قرآن'' میں بالفعل صرف وہی لوگ شریک ہو سکتے ہیں جو عربی سیکھ سکیں اور قرآن کا

(۱) ''ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں ہمیں رخصت عطا فرما دیجیے اور خواہ مخواہ کے امتحان میں نہ ڈالیے! آگاہ ہو جاؤ کہ امتحان میں تو وہ پہلے ہی مبتلا ہو چکے!''

علم اس حد تک حاصل کر سکیں کہ دوسروں تک پہنچانے کے قابل ہو سکیں اور ظاہر ہے کہ یہ سب کے لیے ممکن نہیں۔ اب جو شخص نہ عربی سیکھ سکتا ہو نہ قرآن مجید کا درس دے سکتا ہو وہ تمہارا شریکِ کار بنے تو کیونکر؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ)) لیکن ظاہر ہے کہ یہ ہر شخص کے کرنے کا کام نہیں ہے۔

تمہارے درسِ قرآن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمانِ حقیقی کا رکنِ لازم جہاد فی سبیل اللہ ہے، جس کی غایتِ اولیٰ فریضۂ شہادت حق کی ادائیگی ہے اور غایتِ قصویٰ اعلاء کلمۃ اللہ اور غلبۂ دینِ حق کی جدوجہد، لیکن تم یہ نہیں بتاتے کہ آخر ان فرائض کی ادائیگی کی عملی شکل کیا ہو؟ لوگ کیا کریں؟ کیسے جمع ہوں؟ کہاں سے سفر کا آغاز کریں؟ اور کس کی رہنمائی میں آگے چلیں؟ اگر تم ان سوالوں کا جواب نہیں دیتے اور لوگوں کے لیے عمل کی راہ نہیں کھولتے تو بجائے اس کے کہ تمہاری طرف سے ان پر حجت قائم ہو الٹی ان کی حجت تم پر قائم ہوئی جا رہی ہے!

بعض نے طنزاً اور بعض نے خلوص کے ساتھ یہ بھی کہا کہ تمہارے درسِ قرآن میں شریک ہونے والوں کی عظیم اکثریت محض روایتی اور رسمی طور پر حصولِ ثواب کی خاطر درس سنتی ہے۔ جیسے ہی تم نے عمل کے لیے پکارا اور ''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ!'' کی ندا دی تم خود دیکھ لوگے کہ ساری بھیڑ چھٹ جائے گی، گویا ع ''دیکھنا اِن بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں!'' تو اگرچہ ان کی یہ بات کلیۃً تو درست نہیں ہے اس لیے کہ متعدد مثالیں ایسی موجود ہیں کہ اس سلسلۂ درس سے منسلک ہو کر عملی اعتبار سے لوگوں کی زندگیوں میں عظیم انقلاب برپا ہو گیا، تاہم ادھر کچھ عرصے سے میں خود بھی نہایت شدّت کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے حلقۂ احباب میں درسِ قرآن کے سلسلے کو واقعتہً ایک رسم اور روایت کی حیثیت حاصل ہوتی جا رہی ہے اور گویا خود درسِ قرآن ہی مقصود بالذات بنتا چلا جا رہا ہے اور بہت سے لوگ اسے اپنے معمول (routine) میں داخل کر کے مطمئن ہو گئے ہیں!...... یہ واقعہ ہے کہ ہم مسلمانوں نے اپنے دورِ انحطاط میں دین کے اعلیٰ سے اعلیٰ اعمال کو محض رسم بنا کر رکھ دینے کے فن میں یدِ طولیٰ حاصل کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں اس میں مہارتِ تامہّ حاصل ہے، لیکن میں لرز جاتا ہوں اس خیال سے کہ اگر قرآن کا پڑھنا پڑھانا اور سیکھنا سکھانا محض ایک رسم بن کر رہ گیا تو پھر اور کون سی چیز رہ جائے گی جو لوگوں کو آمادۂ عمل کر سکے...... اور میں کانپ اٹھتا ہوں اس احساس سے کہ اگر لوگ سورۃ الصّف اور سورۃ الحدید کو بھی 'پی' گئے اور ٹس سے مس نہ ہوئے اور سورۃ العنکبوت، سورۃ الاحزاب، سورۃ المنافقون اور سورۃ التوبہ کو بھی بے سمجھے بوجھے

نہیں بلکہ خوب سمجھ کر اور ایک بار نہیں بار بار پڑھ گئے لیکن معاملہ وہی رہا کہ ع ''زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد!'' تو ﴿فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ﴾ (المرسلات)[1]

میرے لیے اس معاملے کا سب سے زیادہ قابلِ حذر پہلو یہ ہے کہ اگر لوگوں کی بے عملی اور ان کے تعطل و جمود میں کچھ دخل میری ہچکچاہٹ اور میرے تذبذب کو بھی حاصل ہوا تو کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اور کون سی زمین مجھے پناہ دے گی! گویا میرے سامنے اب یہ معاملہ بالکل دوٹوک طور پر آ چکا ہے کہ یا تو یہ صورت حال ختم ہونی چاہیے کہ ''یہ صور پھونک کے تم سو گئے کہاں آخر[2]!'' اور سیدھی طرح دین کے تقاضوں کے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ادائیگی کے لیے واضح لائحہ عمل بھی پیش کیا جائے اور خود راہ عزیمت پر پیش قدمی کر کے لوگوں کے لیے راستہ کھولا جائے یا پھر قرآن مجید کے اس انقلابی درس کا کام بھی کسی ایسے باہمت اور صاحبِ عزیمت انسان کے لیے چھوڑ دیا جائے جو محض درس ہی نہ دے' سامنے آ کر لوگوں کی رہنمائی کا فرض بھی انجام دے سکے! گویا میرے نزدیک اب صورتِ مسئلہ یہ ہے کہ ''یا چناں کن یا چنیں!'' اور ع ''یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر!''

اندریں حالات' جیسا کہ میں آغاز میں عرض کر چکا ہوں' میں نے اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق کے بھروسے پر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ میری مساعی صرف درس و تدریس اور تعلیم و تعلّمِ قرآن تک محدود نہیں رہیں گی بلکہ میں خالص دینی بنیادوں پر ایک نئی جماعت یا تنظیم قائم کرنے کی کوشش کروں گا جس میں وہ لوگ شامل ہوں جو:

اوّلاً ...... اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے عائد کردہ حلال و حرام کی جملہ قیود کی پابندی کا عہد کریں اور اس معاملے میں رخصتوں کے بجائے عزیمت کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے آمادہ ہوں۔

ثانیاً...... 'سمع و طاعت' کے ٹھیٹھ اسلامی اصول پر مبنی نظمِ جماعت کی پابندی کا عہد کریں اور معروف کے دائرے کے اندر اندر اطاعتِ امیر کے التزام کے لیے پوری طرح آمادہ ہوں،......اور

ثالثاً...... یہ عہد کریں کہ دُنیوی زندگی اور اس کے لوازمات کے باب میں کم از کم پر قناعت اور قوُتِ لایموت پر اکتفا کرتے ہوئے اپنی بہتر اور بیشتر مساعی اور اپنے اموال اور اوقات کا معتدبہ حصہ احیائے اسلام اور تجدید دین کی کوشش اور شہادتِ حق اور اقامتِ دین کی جدوجہد میں کھپا دیں گے۔

---

(۱) ''اب اس کے بعد وہ آخر کس بات پر یقین لائیں گے؟'' (۲) جناب نعیم صدیقی کا مصرعہ۔

اپنی جگہ خود میں آپ سب کو گواہ بنا کر عہد کرتا ہوں کہ میرا جینا اور مرنا اللہ کے دین ہی کے لیے ہو گا اور میں ہر حال میں دین کو دنیا پر مقدم رکھتے ہوئے اپنے بہتر اور بیشتر اوقات اور اپنی بہتر اور بیشتر تو تیں جیسی کچھ اور جتنی کچھ وہ مجھ میں ہیں اور بیشتر صلاحیتیں جیسی کچھ اور جتنی کچھ وہ مجھے حاصل ہیں، فریضۂ شہادتِ حق کی ادائیگی اور اعلاءِ کلمۃ اللہ اور غلبۂ دین متین کی سعی و جہد کے لیے وقف کر دوں گا۔ گویا:

﴿اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرۡتُ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۱۶۳﴾﴾ (الانعام)

اللہ تعالیٰ مجھے اپنے عہد پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ وَاِلَیۡہِ اُنِیۡبُ۔

اب آپ میں سے ہر شخص کو بھی اپنے آئندہ طرزِ عمل کے بارے میں واضح فیصلہ کرنا ہو گا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے اگر کوئی کامل رفاقت پر آمادہ ہو اور پوری طرح دست و بازو بننے کے لیے تیار ہو تب تو کیا ہی کہنے! ''دیدہ و دل فرشِ راہ!'' کوئی جزوی طور پر تعاون کرنا چاہے تو بھی سر آنکھوں پر، کوئی صرف دعاؤں اور نیک تمناؤں سے تائید کرے تو وہ بھی بسرو چشم قبول، اور اگر کوئی محض سامع کی حیثیت سے حسب سابق ہماری محفلوں اور مجلسوں کو رونق بخشتا ہے، تو وہ بھی شکریہ کا مستحق۔

......لیکن اپنی جگہ آپ کو چند باتیں واضح طور پر سمجھ لینی چاہئیں:

اوّلین اور اہم ترین معاملہ دین کے مطالبوں اور تقاضوں کے بارے میں انشراحِ صدر کا ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ جو شخص اس دعوتِ قرآنی سے کسی درجے میں بھی منسلک رہا ہو اسے اس سلسلے میں کوئی اشتباہ لاحق ہو سکے! جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں اس 'تحریک تعلیم وتعلّم قرآن' کا پورا اٹھان مطالعۂ قرآن حکیم کے ایک منتخب نصاب کی اساس پر ہوا ہے جس کا مرکزی مضمون ہی یہ ہے کہ ازروئے قرآن انسان کی نجات کے لوازم کیا ہیں اور اللہ کی کتاب کی رُو سے ایک مسلمان کی دینی ذمہ داریاں اور فرائض کیا ہیں۔ اس منتخب نصاب کو میں سرزمینِ لاہور میں متعدد بار بیان کر چکا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر کسی نے اسے تسلسل کے ساتھ ایک مرتبہ بھی پڑھ یا سن لیا تو اسے کم از کم اپنے دینی فرائض کے بارے میں ہرگز کوئی مغالطہ یا اشتباہ لاحق نہیں ہو سکتا۔

اس منتخب نصاب میں شامل مقامات میں سے ایمان اور عمل صالح کے تفصیلی مباحث سے قطع نظر کرتے ہوئے ذرا اس مرکزی مضمون کی ڈور پر نگاہ جمائیے جو گویا ان تمام مقامات کو پروئے ہوئے ہے تو بات پھر دو اور دو چار کی طرح واضح ہو جائے گی۔

'سورۃ العصر' مختصر ترین سورتوں میں سے ہونے کے باوجود ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کو بھی انسان کی نجات کی لازمی شرائط کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ آیۂ برّ (البقرہ: ۱۷۷) نیکی کے صرف اسی تصور کو مبنی برصداقت قرار دیتی ہے جس میں بدی سے پنجہ آزمائی کرنا اور اسے میدانِ جنگ میں للکارنا لازماً شامل ہو۔ سورۂ لقمان کا دوسرا رکوع اجتناب عن الشرک اور التزامِ توحید' شکرِ باری اور برّ والدین' اور ایمان بالمعاد اور اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ 'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' کو بھی لازمی قرار دیتا ہے۔ سورۂ حٰم السجدۃ میں دعوت الی اللہ کی پرزور ترغیب ملتی ہے۔ سورۃ الحجرات کے آخری حصے میں یقینِ قلبی کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ اور اس میں جان اور مال کھپانے کو بھی ایمانِ حقیقی کے لوازم میں سے شمار کیا گیا ہے۔ سورۃ الحج کا آخری رکوع ﴿ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ﴾ کے ساتھ ﴿جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ﴾ (آیت ۷۷) کا حکم بھی سناتا ہے اور اس کی غرض وغایت قرار دیتا ہے شہادتِ حق کو' بفحوائے الفاظِ قرآنی ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ﴾ (آیت ۷۸)۔ سورۃ الصّف پھر عذابِ الیم سے چھٹکارا پانے کے لیے ایمان کے ساتھ ساتھ ﴿وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۱) کی شرط عائد کرتی ہے اور اس کا ہدف ومقصود قرار دیتی ہے غلبۂ دینِ حق کو' بفحوائے الفاظ قرآنی ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (آیت ۹) اور محبوبیت ِ خداوندی کی شرط کے طور پر پیش کرتی ہے اس کی راہ میں اس طرح جنگ کرنے کو گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں کہ کوئی رخنہ ڈالا ہی نہ جا سکے۔ سورۃ الحدید دین کے تمام تقاضوں کو دو الفاظ میں سمیٹ کر بیان کرتی ہے' ایک ایمان اور دوسرے انفاق۔ اور یہاں انفاق سے مراد صرف انفاقِ مال نہیں بلکہ بذلِ نفس بھی ہے۔ چنانچہ اسی کی کوکھ سے فوراً ہی قتال بھی برآمد ہو جاتا ہے اور بالآخر ارسالِ رسل' انزالِ کتاب ومیزان اور تخلیق حدید سب کی غرض یہ بیان ہوتی ہے کہ ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ﴾ (الحدید: ۲۵) یعنی اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون ہیں اس کے وہ وفادار بندے جو اس کی اور اس کے رسولوں کی نصرت وحمایت میں سلاحِ جنگ ہاتھ میں لے کر سر بکف میدان میں نکل

آ ئیں ...... پھر سورۃ العنکبوت ہو یا سورۃ الاحزاب' سورۃ التوبۃ ہو یا سورۃ الحدید سب اس راہ سے گریز اور اس کے شدائد ومصائب سے گھبرانے اور ہمت ہار جانے پر نفاق کی وعید سناتی ہیں' جس کا انجام ہے: ﴿خَسِرَ الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃَ ؕ﴾ (الحج:۱۱)

تو بتائیے کہ آخر فرار کی راہ کون سی باقی رہ گئی؟(۱) مجھے تو عافیت کی راہ صرف ایک نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ انسان قرآن کو اوّل تو پڑھے ہی نہیں یا پڑھے تو کم از کم سمجھے نہیں۔ ورنہ قرآن تو جس صراطِ مستقیم یا سواءؔ السبیل کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس کے ناگزیر سنگ ہائے میل وہی ہیں جو میں نے ابھی بیان کیے اور اس کی آخری منزل وہ ہے جو سورۃ الاحزاب میں بیان ہوئی' یعنی یہ کہ یا تو انسان ﴿فَمِنۡہُمۡ مَّنۡ قَضٰی نَحۡبَہٗ﴾ کی فہرست میں شامل ہو کر سرخرو ہو جائے یا پھر ﴿وَمِنۡہُمۡ مَّنۡ یَّنۡتَظِرُ﴾ (آیت ۲۳) کے زمرے میں شریک ہو کر اپنی باری کا انتظار کرے۔ غالباً اسی احساس کے تحت کہا تھا علامہ اقبال مرحوم نے کہ: ؎

رفت سوزِ سینۂ تاتار و کرد
یا مسلماں مرد یا قرآں بمرد!

اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ یہ کسی مخلوق کی تصنیف یا تالیف نہیں' خالق کا کلام ہے' کسی انسان کے نظریات نہیں جو بدل بھی سکتے ہوں' قرآن کی آیاتِ محکمات ہیں جو اٹل بھی ہیں اور غیر مبدلؔ بھی' یہ ہزل نہیں قولِ فصل(۲) ہے' پھر چیستاں نہیں کتابِ مبین ہے اور کسی مُردہ زبان میں نہیں 'لسانٍ عربیٍ مبینٍ'' میں ہے......اور اچھی طرح جان لیجیے کہ اگر قرآن حکیم کے ان مقامات کو پڑھتے ہوئے آپ کے دل نے گواہی دی ہو کہ ان کا جو معنی ومفہوم اور مراد ومقصود میں نے بیان کیا ہے وہ حق ہے تو قرآن کی جانب سے ایک حجتؔ آپ پر قائم ہو چکی۔ اب دو ہی راستے کھلے ہیں' یا تو ان فرائض کی ادائیگی پر کمر بستہ ہو جائیں اور قرآن کو اپنے حق میں حجت اور دلیلِ راہ بنائیں یا اس سے پہلو تہی کی روش اختیار کر کے اپنے خلاف حجت اور برہانِ قاطع بنالیں۔(۳) تیسری کوئی راہ ممکن نہیں!

دوسرا مسئلہ میرے ساتھ تعاون کرنے یا نہ کرنے اور میرا ساتھ دینے یا نہ دینے کا ہے' تو سیدھی

(۱) جز دار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ ناچار گنہگار سوئے دار چلے ہیں (فیض)

(۲) ﴿اِنَّہٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ ﴿۱۳﴾ وَّمَا ہُوَ بِالۡہَزۡلِ ﴿۱۴﴾﴾ (الطارق)

(۳) ((اَلْقُرْاٰنُ حُجَّۃٌ لَکَ اَوْعَلَیْکَ)) (الحدیث)

سی بات ہے اگر آپ کو کسی معقول سبب سے میرے خلوص و اخلاص پر اعتماد نہ ہو یا آپ کو میرے بارے میں کوئی حقیقی خدشہ اور واقعی اندیشہ لاحق ہو تو آپ ہرگز میرا ساتھ دینے پر مکلّف نہیں۔ لیکن خوب سمجھ لیجیے کہ اس سے آپ کے فرائض بہر حال ساقط نہیں ہو جاتے۔ اگر آپ کو کسی اور پر اعتماد ہو تو اس کے ساتھ مل کر کام کریں ورنہ از خود کھڑے ہوں اور اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کی فکر کریں...... اور خود ایک قافلہ تشکیل دے کر سفر کا آغاز کر دیں۔

لیکن اگر آپ کے پاس کوئی معقول وجہ مجھ سے سوءِ ظن کی نہیں ہے تو پھر آپ پر لازم ہے کہ میرا ساتھ دیں اور خواہ مخواہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ نہ بنائیں۔ اس معاملے میں آپ کا اصل مفتی آپ کا دل[1] ہے۔ اسے ٹٹولیے' اگر وہ مجھ پر اعتماد کے حق میں رائے دے تو گویا ایک دوسری حجت آپ پر قائم ہو گئی اور آپ پر واجب ہو گیا کہ میرا ساتھ دیں۔ خوب سمجھ لیجیے کہ محض گریز اور فرار کی خاطر الزام و اعتراض سے یہاں تو آپ دامن بچا جائیں گے خدا کے یہاں معاملہ مشکل ہو جائے گا۔

اس سلسلے میں میں آپ کو کھلی اجازت دیتا ہوں کہ میرے بارے میں جو شبہات بھی آپ کے دل میں آتے ہوں بلا جھجک بیان کریں اور جو دریافت کرنا ہو بلا تکلف دریافت کریں' خواہ وہ میرے حال سے متعلق ہو یا ماضی سے' اور خواہ اس کا تعلق میری پبلک لائف سے ہو خواہ نجی زندگی سے! لیکن یہ احتیاط بہر صورت ملحوظ رہے کہ مجھے وضاحت کا موقع دیے بغیر میرے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کریں۔ اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ محض آپ کا سوءِ ظن ہو اور آپ سورۃ الحجرات میں یہ الفاظ پڑھ چکے ہیں کہ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ (آیت ۱۲)

اس موقع پر ابتدا میں خود بھی میں اپنے بارے میں بعض وضاحتیں کیے دیتا ہوں:

ایک یہ کہ میں عالمِ دین ہونے کا ہرگز مدعی نہیں بلکہ مجھے اپنی کم علمی کا پورا اعتراف ہے۔ گویا بقول علامہ اقبال مرحوم ع ''میں نہ عارف' نہ مجدد' نہ محدث' نہ فقیہہ!'' لہٰذا مجھے فقہی معاملات میں رائے دینے کا ہرگز کوئی شوق نہیں' بلکہ میں صاف اقرار کرتا ہوں کہ مجھ میں اس کی اہلیت ہی موجود نہیں ہے...... میری کُل حیثیت قرآن کے ایک ادنیٰ طالب علم اور دین کے ایک ادنیٰ خادم کی ہے۔

البتہ قرآن کے مطالعے سے مجھے یہ ضرور معلوم ہو گیا ہے کہ دین میں مقدم

(۱) ((اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ وَلَوْ اَفْتَاكَ الْمُفْتِی)) (الحدیث)

کیا ہے اور مؤخر کیا' اوّلیت کسے حاصل ہے اور ثانوی درجہ کس کا ہے' جڑ اور اصل کی حیثیت رکھنے والی چیزیں کون سی ہیں اور فروعات کی حیثیت کن کی ہے۔

گویا 'حکمتِ دین' کے اس شعبے سے اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک حصہ عطا فرمایا ہے جس کی جانب اشارہ آنحضور ﷺ کے ان الفاظِ مبارک میں ملتا ہے جو آپؐ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائے تھے: ((اِنْ شِئْتَ حَدَّثْتُكَ يَا مُعَاذُ بِرَاْسِ هٰذَا الْاَمْرِ وَذِرْوَةِ السَّنَامِ مِنْهُ)) یعنی ''اے معاذ! اگر تم چاہو تو میں تمہیں یہ بتاؤں کہ ہمارے اس کام (دینِ حق) کی جڑ اور اساس کیا ہے اور اس کی سب سے اونچی چوٹی کون سی ہے!'' اور مجھے خالصتاً تَحْدِيْثًا لِلنِّعْمَةِ یہ عرض کرنے میں بھی کوئی باک نہیں کہ اس معاملے میں بحمد اللہ مجھے اپنے آپ پر پورا اعتماد حاصل ہے اور میں پورے وثوق کے ساتھ جانتا ہوں کہ اس اُمت نے کس طرح دین کی جملہ اقدار کو تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے اور اصل کو فرع اور فرع کو اصل کا درجہ دے کر فرائضِ دینی کا پورا تصوّر ہی مسخ کر دیا ہے۔ نتیجتاً حضرت مسیحؑ کے الفاظ میں ''مچھر چھانے جا رہے ہیں اور سموچے اونٹ نگلے جا رہے ہیں'' اور ایک عظیم اکثریت کا حال یہ ہے کہ انہیں نہ ''رأس ھذا الامر'' سے کوئی بحث ہے نہ ''ذِرْوَةُ السَّنَامِ مِنْهُ'' سے کوئی دلچسپی۔ صرف کچھ درمیانی اعمال اور ان کے بھی محض ظاہر کو کل دین سمجھے بیٹھے ہیں۔ گویا نہ جڑ کا دھیان نہ چوٹی کی فکر' تنے کی بھی صرف چھال نے کل دین کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اب ساری بحث وتمحیص' قیل و قال' مناظرہ ومجادلہ اور تحقیق وتفحص کا موضوع صرف رفع یدین' آمین بالجہر اور تعدادِ رکعاتِ تراویح ایسے فروعی مسائل بن کر رہ گئے ہیں!...... اور میں علیٰ وجہ البصیرت جانتا ہوں کہ اصلاحِ احوال کی کوئی صورت اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس معاملے میں نسبت وتناسب کو ازسرِ نو درست کیا جائے۔ چنانچہ آپ کو بھی میرا مشورہ یہ ہے کہ فروعات کے باب میں اہل سنت کے جس مسلک پر آپ چاہیں عمل پیرا ہوں اور فقہی معاملات میں اپنے ہم مسلک علماء ہی کی جانب رجوع کریں۔ البتہ دوسروں کے لیے وسعتِ قلب پیدا کریں اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں اختلاف سے دل گرفتہ نہ ہوں...... البتہ دین کی جڑ اور اس کے 'ذروۂ سنام' کے بارے میں کوئی اشکال یا اشتباہ ہو تو مجھے وضاحت کا موقع دیں۔ پھر اگر آپ کا دل مطمئن ہو تو میری بات قبول کر لیں ورنہ میرے مُنہ پر دے ماریں۔

دوسرے یہ کہ مجھے اپنی عملی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا بھی بخوبی علم ہے اور مجھے نفسِ مزکیٰ ہونے کا ہرگز کوئی دعویٰ نہیں' بلکہ حقیقت یہ ہے ''من آنم کہ من دانم!'' اور جیسا کہ میں تفصیلاً عرض کر چکا ہوں یہی وہ احساس تھا جو مجھے اب تک اس راہ میں پیش قدمی سے روکے رہا اور اب بھی اقدام کی جرأت کر رہا ہوں تو صرف اس دعا کے سہارے کہ ''رَبِّ آتِ نَفْسِی هُدَاهَا وَزَكِّهَا فَاِنَّكَ خَيْرُ مَن زَكَّاهَا''۔ اپنے بہت سے عیوب پر تو میں خود بھی مطلع ہوں اور ان کو دور کرنے کی امکان بھر سعی کروں گا۔ مزید پر جو بھی مجھے متنبہ کرے گا اس کا شکریہ ادا کروں گا اور ان شاء اللہ العزیز اس کی بھی اصلاح کی سعی کروں گا۔ ''بِيَدِهِ التَّوفِيقُ وعَلَيهِ التّكلانُ''۔

تیسرے یہ کہ میرا ایک ماضی بھی ہے جس سے دستبردار ہونے کے لیے میں ہرگز تیار نہیں۔ اس لیے کہ مجھے اس پر نہ کوئی ندامت ہے نہ پشیمانی۔ مجھے پورا اطمینان ہے کہ میں نے اپنا جو وقت اسلامی جمعیتِ طلبہ یا جماعت اسلامی میں صرف کیا وہ ہرگز ضائع نہیں ہوا' اور اپنی جو قوتیں اور صلاحیتیں ان میں کھپائیں وہ قطعاً رائیگاں نہ گئیں۔ اس لیے کہ میں نے یہ کام خلوص کے ساتھ محض خدمتِ دین کے جذبے کے تحت کیا' لہٰذا اللہ کے یہاں میرا اجر بالکل محفوظ ہے۔ میں وہاں تھا تو اللہ کے لیے تھا اور وہاں سے نکلا تو بھی صرف اللہ کے لیے نکلا۔ کسی سے ذاتی نوعیت کی کوئی شکایت یا نجی قسم کی کوئی رنجش اس علیحدگی کا باعث نہیں بنی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج آپ کے سامنے اپنا پورا ماضی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور اپنی امکانی حد تک اس میں سے کسی چیز کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے بعد بھی میں یہ چاہتا ہوں کہ جو حضرات اس کام میں میرا ساتھ دینے کا کوئی ارادہ یا خواہش دل میں پاتے ہوں وہ میری کتابیں ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' اور ''تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب'' ضرور نظر سے گزار لیں' مبادا کوئی چیز بعد میں ان کے علم میں آئے اور وہ جز بز ہوں۔ پھر ان کے مطالعہ کے بعد بھی کوئی اشکال ذہن میں رہ جائے تو میں حاضر ہوں' وضاحت طلب کیجیے اور کامل اطمینان کے بعد ہی رفاقت اختیار کیجیے!

آئندہ کام کا جو نقشہ میرے ذہن میں ہے اس کو سمجھنے کے لیے میں درخواست کروں گا کہ ایک تو میرے کتابچے ''اسلام کی نشاۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' کا مطالعہ پوری توجہ کے ساتھ کر لیا جائے' جو طبع شدہ موجود ہے' اور دوسرے ۱۹۶۷ء میں تنظیم اسلامی کے قیام کی جو سعی ہم نے کی تھی اس کی

قرارداد اور اس کی توضیحات بھی غور سے پڑھ لی جائیں اور اس پر جو تقاریر مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور مولانا عبدالغفار حسنؒ نے کی تھیں ان کو بھی نظر سے گزار لیا جائے۔[۱] وہ قرارداد اور اس کی توضیحات دراصل میں نے ہی لکھی تھیں جنہیں معمولی سی لفظی ترامیم کے ساتھ اجتماع نے اختیار (adopt) کر لیا تھا اور میں ان پر آج بھی اتنا ہی مطمئن ہوں جتنا اُس وقت تھا۔

رہا آئندہ کا تفصیلی لائحہ عمل...... اور ہیئت تنظیمی کی مفصل صورت' تو ان مسائل کے بارے میں میں اس وقت کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا' اس لیے کہ ان کا دار و مدار کلیۃً اس پر ہے کہ کتنے لوگ تعاون پر آمادہ ہوتے ہیں اور کتنی کچھ صلاحیتوں اور قوتوں کا سرمایہ جمع (pool) ہوتا ہے۔

آخر میں ''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہ'' کے سوال پر اپنی تحریر کو ختم کرتا ہوں' اس وضاحت کے ساتھ کہ مجھے اس کا کوئی فوری جواب مطلوب نہیں۔ اگر صرف جذبات میں ہاں کرا لینے کی خواہش ہوتی تو شاید میں ابھی آپ سب کے ہاتھ کھڑے کرا لیتا۔

لیکن مطلوب اصل میں یہ ہے کہ:

جو آئے خوب سوچ سمجھ کر آئے' دل و دماغ کے متفقہ فیصلے کے بعد آئے' اور پھر آئے تو تحفّظات کے ساتھ نہ آئے بلکہ تن' من' دھن سب کے ساتھ آئے' اور یہ اچھی طرح جان کر آئے کہ ؎

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطر ہاست بسے
شرطِ اوّل قدم ایں است کہ مجنوں باشی!

اَقُول قَولی ھٰذا وَاستغفر اللّٰہَ لِی وَلکم وَلِسائِرِ الْمُسلمِیْنَ وَالْمُسلِماتِ
وَاٰخِرُ دعوانااَنِ الحمد لِلّٰہِ رَبّ العَالمین○○

---

(۱) یہ تمام چیزیں اگلے باب میں ملاحظہ فرمائیں (مرتب)

بابِ سوم

قراردادِ تاسیس

مع توضیحات و تقاریظ

زیرِ نظر باب چار حصوں پر مشتمل ہے آغاز اُس تقدیم سے ہوتا ہے جو بانی محترمؒ نے ۱۹۹۱ء میں ''تعارفِ تنظیم اسلامی'' نامی کتابچے کی اشاعت کے موقع پر تحریر فرمائی تھی۔ یہ تقدیم اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں تنظیم کی قرار دادِ تاسیس کی تاریخی تناظر کو اجاگر کیا گیا ہے جس کی وجہ سے قرار دادِ تاسیس کے اصل مدلول کو سمجھنا قارئین کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ انہی خصوصیات کے پیشِ نظر اس تقدیم کو قدرِ ترمیم کے ساتھ شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے دوسرا حصہ مشتمل ہے قرار دادِ تاسیس اور اس کی توضیحات پر جو ۱۹۶۷ء کے اجتماعِ رحیم یار خان میں منظور ہوئی تیسرے حصے میں دو جلیل القدر علماء یعنی مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور مولانا عبدالغفار حسنؒ کی وہ تاثراتی تقاریر شامل ہیں جو ان حضرات نے اس قرارداد کے منظور ہونے کے بعد اس کے بعض اہم نکات کی مزید وضاحت کے طور پر ارشاد فرمائی تھیں چوتھا حصہ مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ اور مولانا عبدالباری ندویؒ کی ارسال کردہ تقاریظ پر مشتمل ہے جو اس قرارداد پر موصول ہوئیں اور بعد ازاں میثاق بابت نومبر دسمبر ۱۹۶۷ء میں شائع کی گئیں۔ (مرتب)

تقدیم

برائے باب 3

تنظیم اسلامی اگرچہ تاحال ایک مختصر سے قافلے کی حیثیت رکھتی ہے، تاہم بحمد اللہ اس کا اجمالی تعارف، کسی نہ کسی درجہ میں، نہ صرف پاکستان کے طول وعرض، بلکہ بیرونی ممالک میں بھی کم از کم اردو بولنے والوں کی حد تک بہت وسیع پیمانے پر ہو چکا ہے۔ اندریں حالات ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ اس کے اساسی نظریات، جو تاحال مختلف کتابچوں کی صورت میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں' انہیں افادۂ عام کے لئے یکجا کر دیا جائے تاکہ ایک جانب کسی بھی نئے شخص کے لئے تنظیم کے مقاصد اور نظریات کے سمجھنے میں سہولت پیدا ہو جائے، اور دوسری جانب اُس کے اہداف و مقاصد اور ہیئت تنظیمی کے ضمن میں جو ارتقائی عمل بروئے کار آیا ہے وہ بھی واضح اور معین ہو جائے۔ چنانچہ یہی پیش نظر کتاب کی اشاعت کا اصل مقصد ہے۔

مختصر ترین الفاظ میں تنظیم اسلامی کی اجتماعی مساعی کے اہداف و مقاصد اور اس کی موجودہ ہیئت تنظیمی کا جامع و مانع تعارف مندرجہ ذیل دو جملوں کے ذریعے ہوسکتا ہے جو تنظیم کے ''نظام العمل'' کی پہلی دفعہ (شق ا اور د) سے ماخوذ ہیں:

۱۔ یہ ایک اصولی ''اسلامی'' انقلابی جماعت ہے جو پہلے پاکستان اور بالآخر کل روئے زمین پر اللہ کے دین کے غلبے، یعنی اسلام کے نظام عدل اجتماعی کے قیام، یا بالفاظ دیگر اسلامی انقلاب، کے لئے کوشاں ہے۔

۲۔ اس کی تنظیمی اساس 'سمع وطاعت فی المعروف' کی شخصی بیعت پر قائم ہے۔

تاہم اس کا ایک طویل پس منظر ہے، جسے ع ''دیکھئے کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک!'' کے مصداق پیش نظر رکھنا مفید ہی نہیں، ضروری ہے!

''تنظیم اسلامی'' کا نام پہلی بار اُس ہیئت تنظیمی کے ضمن میں سامنے آیا تھا جس کے قیام کا فیصلہ اُس اجتماع میں کیا گیا جو ۸۔۹ ستمبر ۱۹۶۷ء کو رحیم یار خان میں منعقد ہوا تھا اور جس میں لگ بھگ چالیس کی تعداد میں ایسے حضرات نے شرکت کی تھی جو اکثر و بیشتر ۵۸۔۱۹۵۷ء میں' اور بعض بعد میں

مختلف مراحل پر جماعت اسلامی پاکستان سے علیحدہ ہوئے تھے اُس اجتماع میں ان سطور کا عاجز و ناچیز راقم بھی موجود تھا جو علم و فضل اور تقویٰ و تدیّن کے اعتبار سے تو کمترین تھا ہی، جہاں تک یاد پڑتا ہے عمر میں بھی سب سے کم تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس اجتماع کا انعقاد اصلاً اُسی کی تحریک و تحریض اور ڈیڑھ دو سال کی انتھک مساعی کا نتیجہ تھا۔

۵۸۔ ۱۹۵۷ء کے دوران میں مولانا مودودی مرحوم کے جن قریب ترین رفقاء نے جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کی تھی، اُن میں اُن چاروں حضرات کے علاوہ جنہیں مولانا مرحوم کی نظر بندی کے دوران مختلف مواقع پر امارت جماعت کی ذمہ داری تفویض کی جاتی رہی تھی(۱) جماعت کی قیادت کی صف دوم کا بہت بڑا حصہ شامل تھا، اُن میں سے بعض حضرات تو اس درجہ مایوس اور دل شکستہ ہو گئے تھے کہ انہوں نے نئی تشکیل و تعمیر کی کسی کوشش میں قطعاً کوئی حصہ نہ لیا (جیسے مولانا عبدالجبار غازی مرحوم اور جناب سعید احمد ملک صاحب) لیکن بقیہ اکابرین میں سے مولانا امین احسن اصلاحیؒ، مولانا عبدالغفار حسنؒ اور حکیم عبدالرحیم اشرفؒ نے بھرپور کوشش کی کہ کوئی نئی ہیئت تنظیمی فوری طور پر وجود میں آ جائے۔ ان کی اس کوشش میں جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والے اُن عام ارکان کی اکثریت بھی شریک تھی جو معتدبہ تعداد میں لاہور، لائلپور (حال فیصل آباد) اور منٹگمری (حال ساہیوال) سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن افسوس کہ مختلف اسباب کی بناء پر یہ مساعی ناکام رہیں، اور جماعت کے سابق ارکان پر مشتمل کوئی نئی اجتماعیت وجود میں نہ آ سکی، جس کے نتیجے میں ایک عمومی مایوسی اور بددلی اس پورے حلقے میں پھیل گئی۔

واضح رہے کہ اگرچہ ان جملہ مساعی میں راقم الحروف بھی ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے شامل رہا تھا، تاہم ایک طویل عرصے تک ان کا اصل اعصابی مرکز بھی لائلپور رہا تھا، اور اُن کی روح رواں کی حیثیت بھی حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب ہی کو حاصل رہی تھی۔ البتہ کچھ عرصہ بعد جب محسوس ہوا کہ حکیم صاحب موصوف کچھ زیادہ ہی مایوس اور بددل ہو گئے ہیں، تو راقم نے ذاتی تحریک اور منٹگمری کے احباب کے تعاون سے ایک بھرپور مشاورتی اجتماع کا اہتمام کیا جو عزیز ٹیریز، ہڑپہ میں منعقد ہوا اور کئی روز تک جاری رہا۔ لیکن افسوس کہ یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ نتیجتاً مایوسی کے سائے مزید گہرے ہو گئے اور ۶۱۔۱۹۶۰ء کے لگ بھگ جماعت سے علیحدہ ہونے والے اکابر اور عام ارکان کے حلقے

(۱) یعنی مولانا عبدالجبار غازیؒ، مولانا امین احسن اصلاحیؒ، مولانا عبدالغفار حسنؒ اور شیخ سلطان احمد

میں کسی نئی تعمیر وتشکیل کے ضمن میں کسی عملی سعی و جہد تو کجا، مستقبل قریب میں اس کی کسی اُمید کے آثار بھی باقی نہ رہے، اور بالعموم وہ فضا طاری ہوگئی جس کا نقشہ ان الفاظ میں سامنے آتا ہے کہ ع ''اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا!'' اگرچہ بحمد اللہ اس وقت بھی ذاتی طور پر راقم کے قلبی احساسات کی کیفیت یہ تھی کہ ع ''آگ بجھی ہوئی نہ جان، آگ دبی ہوئی سمجھ!''

راقم الحروف اوائل ۶۲ء سے اواخر ۶۵ء تک بعض خاندانی مسائل کی بناء پر کراچی میں مقیم رہا اور اس اثناء میں مولانا عبدالغفار حسنؒ بھی مدینہ منور منتقل ہوگئے، جہاں اُن کا تقرر جامعہ اسلامیہ میں بحیثیت استاذِ حدیث ہوگیا تھا۔

اواخر ۱۹۶۵ء میں راقم تعمیر جدید اور تشکیل نو کے عزم تازہ کے ساتھ لاہور منتقل ہوا تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنا وہ اختلافی بیان جو اُس نے ۱۹۵۶ء میں جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کی مقرر کردہ جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کیا تھا ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے شائع کردیا، جو دینی حلقوں اور مذہبی جماعتوں کے علاوہ اخبارات و جرائد میں بھی شدّ ومدّ کے ساتھ زیرِ بحث آیا، جس کے نتیجے میں، سابقینِ جماعت کے حلقے میں بھی کسی نئی تعمیر وتشکیل کی خواہش ازسرنو انگڑائی لینے لگی۔ چنانچہ ۱۹۶۶ء میں جب مولانا عبدالغفار حسنؒ اپنی سالانہ تعطیلات پر پاکستان آئے تو انہوں نے راقم کے ساتھ کامل اتفاق کرتے ہوئے نہ صرف کراچی اور لاہور بلکہ بعض دوسرے مقامات پر بھی سابق ارکان جماعت کو ایک نئی تنظیم کے قیام پر آمادہ کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اُن کی ان مساعی کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کے دلوں میں قیام اجتماعیت کی وہ چنگاری جو خاکستر کی موٹی تہہ میں دب چکی تھی دوبارہ پورے آب وتاب کے ساتھ بھڑک اُٹھی۔

مولانا موصوف تو اپنی تعطیلات کے اختتام پر واپس مدینہ منورہ چلے گئے۔ لیکن اُن کی غیر حاضری میں شیخ سلطان احمد صاحب نے اُن کی نیابت کا حق بخوبی ادا کیا- اور نہ صرف مفصل خط وکتابت کے ذریعے بلکہ اپنی شدید خانگی اور کاروباری مصروفیات کے علی الرغم ایک رفیق کی معیت میں پاکستان کے متعدد اہم مقامات کے سفر کی صعوبت جھیل کر اس تحریک کے پودے کو پروان چڑھایا۔ نتیجتاً جون ۱۹۶۷ء میں آں محترم اور یہ خاکسار رحیم آباد ضلع رحیم یار خاں میں سردار محمد اجمل خان لغاری مرحوم کے دولت کدے پر جمع ہوئے، جہاں طویل گفت وشنید اور بحث وتمحیص کے بعد ہم تینوں نے ایک قرارداد پر دستخط ثبت کردیئے جو

جولائی ۱۹۶۷ء کے میثاق میں قراردادِ رحیم آباد کے نام سے شائع ہوگئی۔

اس قرارداد کا اکثر و بیشتر حصہ تو وہی ہے جو تنظیم اسلامی کی قراردادِ تاسیس کے عنوان سے اس فصل میں درج ہے۔ البتہ اُس کے پہلے پیراگراف کی بجائے ''قراردادِ رحیم آباد میں حسب ذیل عبارت درج تھی:

''ہم اس امر پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ جس نے ہماری راہ کے موانع کو دور فرمایا اور حالات کو اس طرح سازگار فرمایا کہ ہم ایک بار پھر ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے ایک مقام پر جمع ہو سکے۔

ہمارے نزدیک یہ بھی اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم اور انعام و احسان ہے کہ گفت و شنید کے نتیجہ میں ہم نے محسوس کیا کہ بحمد اللہ ہمارے نقطہ نظر اور طرز فکر میں بہت حد تک یکسانی و یک رنگی موجود ہے اور ہم دین کی کسی چھوٹی یا بڑی خدمت کے لئے جمع ہو کر سعی و جہد کر سکتے ہیں۔

بنا بریں ہم یہ طے کرتے ہیں کہ ایک ایسی اجتماعیت کا قیام عمل میں لایا جائے جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری مدد و معاون ہو۔ جس میں وہ لوگ بھی شریک ہو سکیں جو اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے جماعت اسلامی میں شامل ہوئے تھے لیکن پھر مختلف مراحل پر اس سے مایوس ہو کر علیحدہ ہوتے چلے گئے اور اب کسی ہیئت اجتماعی میں منسلک نہ ہونے کی بناء پر تشنگی محسوس کر رہے ہیں اور وہ لوگ بھی شریک ہو سکیں جنہیں اپنے دینی فرائض کا احساس ہو جائے اور وہ اپنی اجتماعی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے کسی اجتماعی نظم میں منسلک ہونا چاہیں۔''

اور اختتام پر ان الفاظ کا اضافہ تھا:

''مندرجہ بالا رہنما اصولوں کی روشنی میں تفصیلی نقشہ کار کی تعیین اور ایک ہیئت اجتماعی کی تشکیل کے لئے طے کیا جاتا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو، ہم خیال لوگوں سے رابطہ کیا جائے اور پھر کوئی ایسی صورت اختیار کی جائے کہ ایسے لوگ ایک جگہ جمع ہو کر کسی اجتماعیت کے قیام کی عملی صورت اختیار کر لیں۔ اس کام کی انجام دہی کے لئے فی الحال شیخ سلطان احمد (صاحب) کو مامور کیا جاتا ہے۔''

واضح رہے کہ اس قرارداد کو بھی الفاظ کا جامہ راقم الحروف ہی نے پہنایا تھا اور پھر جب راقم نے لاہور واپس آ کر اسے مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی خدمت میں پیش کیا اور اُن کی جانب سے اس کی بحیثیت مجموعی تائید و تحسین کے بعد طے کیا گیا کہ اس کی ایک مختصر وضاحت بھی ضبط تحریر میں لے آئی

جائے تو یہ خدمت بھی راقم ہی نے سرانجام دی۔ دریں اثناء لاہور میں منعقدہ ایک اجتماع میں مجوزہ اجتماعیت کے ضمن میں ایک مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آ چکا تھا جس کے ایک اجلاس میں نہ صرف ''قرارداد رحیم آباد'' بلکہ متذکرہ بالا توضیحات کو بھی معمولی حک واضافے کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔ چنانچہ، میثاق، بابت اگست ۱۹۶۷ء میں یہ تمام چیزیں ''مجلس مشاورت'' کی جانب سے شائع ہو گئیں اور اُن کی اساس پر ایک اجتماع ۸۔۹ ستمبر کو بمقام رحیم یار خان طلب کر لیا گیا۔

رحیم یار خان میں ۶۔۷ ستمبر کو مجلس مشاورت کا اجتماع ہوا...... اور بعد ازاں ۸۔۹ ستمبر کو کھلے اجلاس ہوئے جن میں اولاً راقم ہی نے مجوزہ قرارداد اور اس کی توضیحات پڑھ کر سنائیں۔ پھر مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور مولانا عبدالغفار حسنؒ نے مزید تائیدی اور توضیحی تقریریں کیں۔ شرکاءِ اجتماع کی جانب سے بعض لفظی ترامیم بھی پیش ہوئیں ...... اور بالآخر قرارداد کو مع توضیحات منظور کر لیا گیا۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ قرارداد رحیم آباد کے ان ابتدائی تین پیروں کی بجائے، جو اوپر نقل ہو چکے ہیں، یہ پیرا شامل کیا گیا:

''آج ہم اللہ کا نام لے کر ایک ایسی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی واجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری مدد ومعاون ہو۔''

اور اسی طرح قرارداد رحیم آباد کے محولہ بالا آخری الفاظ درج کئے گئے کہ:

''مندرجہ بالا رہنما اصولوں کی روشنی میں عملی جدوجہد کے آغاز اور ایک ہیئت اجتماعی کی باقاعدہ تشکیل کے لئے مندرجہ ذیل اصحاب پر مشتمل ایک مجلس مشاورت کے تقرر کی توثیق کی جاتی ہے۔''

۱۔مولانا امین احسن اصلاحی	۲۔ مولانا عبدالغفار حسن
۳۔مولانا عبدالحق جامعی	۴۔شیخ سلطان احمد (معتمد)
۵۔سردار محمد اجمل خان لغاری	۶۔ڈاکٹر محمد نذیر مسلم

اور ۔۷ ڈاکٹر اسرار احمد

'میثاق' کی ستمبر اکتوبر ۱۹۶۷ء کی مشترکہ اشاعت میں ترمیم شدہ قرارداد اور توضیحات بھی شائع کر دی گئیں اور مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن کی تقاریر بھی مزید برآں صرف قرارداد اور اس کی توضیحات کو ''ایک نئی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ'' کے عنوان سے ایک کتابچے کی

صورت میں بھی شائع کر دیا گیا تا کہ اسے زیادہ وسیع حلقے تک پہنچایا جا سکے۔

یہ عرض کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے کہ اگر چہ اس نئی تنظیم کی سربراہی یا امارت کے لئے تا حال رسمی طور پر کسی کا نام نہ تجویز ہوا تھا نہ منظور' لیکن اس ''بارات کے دولہا'' بہر حال مولانا امین احسن اصلاحیؒ ہی تھے...... اور اگر چہ اس نئی ہیئت اجتماعی کے نام کے بارے میں بھی متعدد تجاویز کے پیش ہونے کے باوجود کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا، تاہم چونکہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ 'تنظیم اسلامی'' کے نام پر مُصر تھے، لہٰذا غیر رسمی طور پر یہ نام بھی تقریباً طے شدہ ہی تھا۔ اگر چہ راقم الحروف نے یہ احتیاط ملحوظ رکھی تھی کہ یہ اسم علَم نہ 'میثاق' میں استعمال ہوا نہ متذکرہ بالا کتابچے میں۔

اجتماع رحیم یار خان میں اپنے الوداعی خطاب میں بھی مولانا اصلاحیؒ نے اپنی سابقہ تقصیر کے اعتراف کے ساتھ آئندہ کے لئے عزم مصمّم کا اظہار کیا تھا اور اس کے بعد بھی چند ماہ تک ان کی طبیعت میں نشاط کی کیفیت برقرار رہی اور ع ''ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا'' کے سے انبساط وانشراح کا اظہار ہوتا رہا۔ چنانچہ بعض چھوٹے اسفار کے علاوہ ایک طویل سفر بھی انہوں نے از لاہور تا سکھر بذریعہ کار اور وہاں سے کراچی بذریعہ ریل کیا جس میں راقم بھی حضرت موسیٰ کے فتیٰ کے مانند اُن کے ساتھ رہا۔

لیکن افسوس کہ ایک حادثہ تو اس سفر کے دوران سکھر میں ایک اجتماع عام کے موقع پر پیش آ گیا...... اور بعض دوسرے حوادث اس کے کچھ عرصہ بعد رونما ہو گئے جن کے نتیجے میں ایک جانب تو مولانا اصلاحی کی طبیعت بجھ کر رہ گئی...... اور دوسری جانب بعض اہم رفقاء کے مزاج میں بھی تکدّر پیدا ہو گیا...... چنانچہ جماعت اسلامی کے ساتھ سابق تعلق کی قدرِ مشترک کی اساس پر نئی تنظیم کے قیام کی یہ آخری کوشش بھی ع ''خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود،'' کی مصداق کامل بن گئی!

تاہم راقم الحروف نے اُسی وقت طے کر لیا تھا کہ اقامت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے بلند و بالا مقاصد کے لئے خالص اصولی اور انقلابی طریق پر جدوجہد، یا بالفاظ دیگر اسلامی انقلاب کی سعی کے لئے ٹھیٹھ اسلامی اصولوں پر کسی نئی تحریک کے اجراء اور تنظیم کے قیام کے لئے خود اپنی بساط کے مطابق کوشش جاری رکھے گا۔ خواہ اُسے نئے سفر اور نئی تعمیر و تشکیل کے لئے تنہا ہی آغاز کرنا پڑے۔

لاہور میں حلقہ ہائے مطالعہ قرآن اور ''دارالاشاعت الاسلامیہ'' کا قیام اور ماہنامہ میثاق کا دوبارہ اجراء پہلے ہی عمل میں آ چکا تھا۔ چنانچہ قرآن حکیم کے انقلابی فکر اور ولولہ انگیز دعوت کی اساس

پر ہم خیال لوگوں کا ایک بالکل نیا حلقہ وجود میں آ چکا تھا جو فطری تدریج کے ساتھ مسلسل ترقی کر رہا تھا۔ چنانچہ اب راقم نے اپنے جسم و جان کی تمام توانائیوں کو بالکل یکسو ہو کر اور ع 'شرط اوّل قدم این است کہ مجنوں باشی' کے سے انداز میں قرآن کی انقلابی دعوت کے نشر و اشاعت پر مرکوز کر دیا۔(۱) جس کے نتیجے میں اولاً ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام عمل میں آیا اور ۲۱/جولائی ۱۹۷۴ء کی شام کو اکیس روزہ قرآنی تربیت گاہ کے اختتام پر راقم نے اپنے اس فیصلے کا اعلان کر دیا کہ آئندہ معاملہ صرف قرآن کے درس و تدریس اور تعلیم و تعلم تک محدود نہیں رہے گا اور صرف ''انجمن'' پر اکتفا نہیں ہوگی بلکہ اقامت دین کی اجتماعی جدوجہد کے لئے ایک باضابطہ جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔

راقم الحروف کی متذکرہ بالا تقریر، تسوید و تبییض کے جملہ مراحل طے کر کے بعض اضافوں کے ساتھ کچھ ''میثاق'' بابت ستمبر ۱۹۷۴ء میں اور بقیہ اکتوبر اور نومبر کی مشترک اشاعت میں شائع ہوگئی جس کے ذریعے راقم نے اپنا ذہنی و فکری پس منظر، سابقہ تحریکی و جماعتی تعلق اور فرائض دینی کے بارے میں اپنا تصور پوری طرح واضح کر دیا۔

پھر 'میثاق' بابت اکتوبر نومبر میں راقم نے ایک جانب ایک طویل مقالے کے ذریعے امّتِ مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کے دوران عروج اور زوال کے دو دو ادوار کی وضاحت اور تیسرے عروج کی جانب پیش قدمی کے ضمن میں ''ہمہ جہتی اور احیائی عمل'' کے مختلف گوشوں کی تعیین کے ساتھ یہ بات بھی واضح کر دی کہ راقم اور اُس کی تجویز کردہ تنظیم اُن میں سے کون سے گوشے سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری جانب ۱۹۶۷ء کے اجتماع رحیم آباد کی منظور کردہ قرارداد مع توضیحات بھی شائع کر دی اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور مولانا عبدالغفار حسنؒ کی تقاریر کے علاوہ وہ تائیدی تبصرے بھی شائع کر دیئے جو ۶۸۔۱۹۶۷ء میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور مولانا عبدالباری ندویؒ نے کیے تھے...... اور اعلان کر دیا کہ ان ہی فکری و نظری اساسات پر ایک نئی تنظیم کی تشکیل اگلے سال (۱۹۷۵ء) کے اوائل میں ہو جائے گی!

----

(۱) اس کی تفصیلی روداد کے لئے ملاحظہ ہو راقم کی تالیف ''دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر!''

۱۹۶۷ء کی قرارداد کے بارے میں راقم الحروف کو اس وقت بھی یہ احساس تھا کہ اس میں اقامت دین کی فرضیت کا تصور کچھ دب گیا ہے اور اس کی اہمیت کما حقہ، واضح نہیں ہو رہی...... اور اگرچہ دین کی اقامت کی اصطلاح اس میں موجود ہے تاہم بحیثیت مجموعی اُس سے اصلاً ایک تبلیغی اور اصلاحی تحریک کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ اس کا اصل سبب بھی راقم کے سامنے واضح تھا، یعنی یہ کہ جماعت اسلامی کی تحریک کی قلب ماہیت اور ایک اسلامی انقلابی جماعت کے بجائے اسلام پسند قومی سیاسی جماعت کا انداز اختیار کر لینے اور اس کے نتیجے میں اُس کے کارکنوں کے مزاج میں سیاسی رنگ کے غلبے نے سابقین جماعت کے حلقے میں ردّعمل کے طور پر ''دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے!''...... اور ''سانپ کا ڈسا رسی سے بھی ڈرتا ہے!'' کے مطابق ''انقلاب کے لفظ سے وحشت (Allergy) پیدا کر دی تھی...... اس کے باوجود راقم نے نئی تشکیل کے لئے قراردادِ تاسیس کے طور پر اُسی کو اختیار کیا۔ اس لئے کہ ایک تو اس کی شدید خواہش تھی کہ ۱۹۶۷ء میں جمع ہونے والے تمام بزرگ اور احباب اس میں شمولیت اختیار کر لیں اور اس ضمن میں اُن پر یہ حجت قائم ہو جائے کہ نئے سفر کا آغاز ٹھیک اسی مقام سے کیا جا رہا ہے جہاں سے سات سال قبل قافلہ منتشر ہوا تھا...... اور دوسرے اسے یقین تھا کہ جیسے ہی قافلہ مصروف سفر ہو گا سابقہ تجربات اور ایک طویل عرصے کے جمود کے باعث جو وحشت پیدا ہو گئی ہے خود بخود رفع ہو جائے گی اور...... ع ''پھر دلوں کو یاد آ جائے کا پیغام سجود!'' کے مصداق سب بھولے ہوئے سبق دوبارہ یاد آ جائیں گے۔ (جس کا ایک ثبوت بھی راقم کو بالکل ابتدائی مرحلے ہی پر مل گیا تھا جس کی تفصیل یہ ہے کہ سردار محمد اجمل خان لغاری مرحوم کے مزاج میں متذکرہ بالا وحشت کی شدت کے باعث قرارداد رحیم آباد میں ان الفاظ کے بعد کہ: ''لہٰذا پیش نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہئے کہ اس میں فرد کی دینی اور اخلاقی تربیت کا کما حقہ، لحاظ رکھا جائے!'' مزید تاکید اور حزم و اختیار کے لئے یہ الفاظ بھی شامل تھے کہ ''اور اُسے محض کسی اجتماعی انقلاب کے لئے آلہ کار کی حیثیت نہ دے دی جائے!''...... لیکن جیسے ہی جمود ٹوٹا اور حرکت کا آغاز ہوا تو اس وحشت کی شدت میں فوراً کمی آ گئی۔ چنانچہ رحیم یار خان میں منظور ہونے والی قرارداد سے یہ الفاظ حذف کر دیئے گئے۔

تنظیم اسلامی کا تاسیسی اجلاس ۲۷/اور ۲۸ مارچ ۱۹۷۵ء کو مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے دفتر واقع ۱۲۔اے، افغانی روڈ، سمن آباد لاہور میں منعقد ہوا۔ جس میں لاہور کے علاوہ کراچی، سکھر، بہاولپور، ساہیوال، فیصل آباد، شیخوپورہ، گوجرانوالہ اور بعض دوسرے مقامات سے کُل ایک سو تین (۱۰۳) افراد شریک ہوئے۔

ان میں اوّل تو جماعتِ اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والے حضرات کی کل تعداد بھی پانچ چھ سے زیادہ نہ تھی، مزید برآں وہ سب بھی جماعت کے عام ارکان میں سے تھے، اور اُن میں سے کوئی بھی جماعتِ اسلامی میں کبھی کسی منصب پر فائز نہیں رہا تھا ___ (سوائے شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کے کہ وہ کراچی کی جماعت کے معروف اور نمایاں لوگوں میں شامل رہے تھے!) ______ گویا یہ پورا قافلہ راقم کی دعوتِ قرآنی کے نتیجے میں عالمِ وجود میں آیا تھا اور اس کے جملہ اساسی تصورات مطالعۂ قرآن حکیم کے اُس منتخب نصاب پر مبنی تھے جسے راقم نے اپنی دعوتِ قرآنی کا مرکز ومحور بنایا تھا۔

چنانچہ راقم نے اس اجلاس کی افتتاحی نشست میں بھی ایک بار پھر اپنے مطالعۂ قرآن کا نچوڑ پیش کیا اور سورۃ الصّف کے دوسرے رکوع اور سورۃ الحجرات کی آیات ۱۴۔۱۵ کے حوالے سے فرائضِ دینی کا جامع تصور اور اس کے ضمن میں شہادت علی الناس اور غلبۂ اقامتِ دین کی جدوجہد کی فرضیت اور اس کے لئے التزام جماعت کی اہمیت پر زور دیا۔ اس کے ساتھ ہی راقم نے ۶۷ء والی قراردادِ تاسیس مع توضیحات پڑھ کر سنائی اور اس کی پُر زور وکالت کی، صرف اس لئے نہیں کہ یہ اس کے اپنے رشحاتِ قلم تھے، بلکہ اس لئے کہ اقامتِ دین کے بلند وبالا مقصد کے لئے جو مردانِ کار درکار ہیں اُن کی فراہمی اور سیرت سازی کے لئے جو پروگرام اُس قرارداد اور اُس کی توضیحات کے ذریعے سامنے آتا ہے اُس کی صحت وحقانیت پر میرا دل ۷۵۔۱۹۷۴ء میں بھی اتنا مطمئن تھا، جتنا ۶۷۔۱۹۶۶ء میں۔ اور الحمدللہ کہ ان سطور کی تحریر کے وقت بھی (جنوری ۱۹۹۱ء) راقم کو یقینِ کامل حاصل ہے کہ فرائضِ دینی کی پہلی دو منزلوں یعنی بندگی رب اور شہادت علی الناس کے اُصول ومبادی کے ضمن میں اس قرارداد اور اس کی توضیحات کو ایک اہم اور جامع دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ (چنانچہ اس کتاب کا حصہ اول اسی قرارداد اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہے۔) _____ بہرحال چونکہ یہ اجتماع اِن ہی کی اساس پر طلب کیا گیا تھا لہٰذا اس کا کوئی امکان ہی موجود نہ تھا کہ ان کے کسی نکتے سے شرکاء اجلاس میں سے کسی کو کوئی اختلاف ہو۔ لہٰذا اِن کی منظوری کا مرحلہ بآسانی طے ہوگیا۔

اگلا مرحلہ، نام، شرائطِ شمولیت، ہیئت تنظیمی، اور قواعد وضوابط کی منظوری تھا جن میں سے نہ نام کے سلسلے میں کوئی ردّ وقدح ہوئی، نہ ہیئتِ تنظیمی، اور قواعد وضوابط کے ضمن میں کوئی مشکل پیش آئی۔ البتہ شرائطِ شمولیت میں شامل بعض کڑوی گولیوں کا نگلنا موجود الوقت حالات میں بہت سے احباب کو دشوار ہی نہیں محال نظر آیا۔ چنانچہ نام کے ضمن میں اتفاق رائے کے ساتھ ''تنظیم اسلامی'' ہی کے حق میں فیصلہ ہوگیا۔ اور اُس وقت کے دستورِ تنظیمِ اسلامی کی دفعہ ''۱'' قرار پائی:

''اس تنظیم کا نام **'تنظیم اسلامی'** ہوگا۔''

اسی طرح ہیئت تنظیمی کے ضمن میں حسبِ ذیل اُمور بھی بالاتفاق طے پا گئے:

دفعہ۳۔ ہیئتِ تنظیمی

تنظیمی اعتبار سے پہلے تین سال ایک عبوری دور شمار ہوں گے جن کے دوران میں مقدور بھر سعی کی جائے گی کہ تجدید ایمان، توبہ اور تجدید عہد کی وہ دعوت زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا دی جائے جس کی تفصیل دفعہ۲ میں دی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں شامل ہوسکیں۔ اس عرصے کی تکمیل پر ایسے تمام لوگوں کا ایک عام اجتماع طلب کیا جائے گا جو ''تنظیم اسلامی'' کے لئے مستقل دستور طے کرے گا۔ گویا دفعاتِ آئندہ میں جو تنظیمی ڈھانچہ دیا جا رہا ہے وہ صرف اس عبوری دور کے لئے شمار ہوگا۔

دفعہ۴۔ مرکزی نظام

(الف) ڈاکٹر اسرار احمد کو تنظیم اسلامی کے ''داعی عمومی'' کی حیثیت ہوگی اور وہ اس دور میں ''اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ'' کے وسیع تر اصول کے تحت تنظیم کے معاملات کو بھی چلائیں گے اور اس کی دعوت کو بھی زیادہ سے زیادہ وسیع تر حلقے تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ وہ ایک معین مجلسِ شوریٰ کو بھی نامزد کرنے کے مجاز ہوں گے لیکن ان کو حق استقرار حاصل ہوگا۔

(ب) تمام رفقائے تنظیم داعیٔ عمومی کی ''اطاعت فی المعروف'' کے پابند ہوں گے!

رہے ''قواعد وضوابط'' تو چونکہ اِن اصولی باتوں کے طے ہو جانے کے بعد زیادہ تفصیلی قواعد و قوانین کی چنداں ضرورت ہی باقی نہیں رہی تھی، لہٰذا وہ سب کے سب پانچ دفعات کی صورت میں کل تین صفحات میں سما گئے اور وہ بھی بالاتفاق طے ہوگئے۔

جہاں تک مذکورہ بالا دستور کی دفعہ۲ میں شامل ''شرائطِ شمولیت'' کا تعلق تھا اس کی بھی کل چھ میں

سے صرف ایک یعنی چوتھی شق ایسی تھی جو بہت سے احباب کے تنظیم میں شامل ہونے کی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔اس لئے کہ اُس کی رُو سے یہ لازم آتا تھا کہ صرف وہی لوگ تنظیمِ اسلامی میں شمولیت اختیار کر سکیں گے جو تجارتی اور نجی ہر نوع کے سُودی لین دین سے عملاً تائب ہو جائیں، اور ایسے اداروں کی ملازمت بھی ترک کر دیں جن میں سودی لین دین کا غلبہ ہو جیسے بنک اور انشورنس کمپنیاں وغیرہ۔مزید برآں سرکاری محاصل یعنی انکم ٹیکس، سیلز ٹیکس وغیرہ کے ضمن میں بھی کسی غلط بیانی سے ہرگز کام نہ لیں۔ ان شدید وثقیل اور موجودالوقت احوال وظروف کے اعتبار سے تقریباً ناممکن العمل پابندیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان ایک سو تین حضرات میں سے جو اس اجتماع میں ابتداءً شریک ہوئے تھے صرف باسٹھ حضرات نے تنظیم میں بالفعل شرکت اختیار کی۔

یہاں اس بات کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ تنظیم کی ''شرائطِ شمولیت'' کی متذکرہ بالا شق بھی اصلاً جماعت اسلامی ہی کے فلسفہ واصولِ تنظیم کے تسلسل کی مظہر تھی۔اور اس معاملے میں اگرچہ ذاتی طور پر راقم الحروف کے نظریات تبدیل ہو چکے تھے، تاہم چونکہ شدید دلی خواہش تھی کہ جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والے احباب واکابر کی زیادہ سے زیادہ تعداد اس نئے قافلے میں شامل ہو اور اُن کی اکثریت بالخصوص اہم شخصیات کے تصورات میں ابھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، لہٰذا جہاں یہ مناسب سمجھا گیا کہ تنظیم کے ''مستقل دستور'' کے معاملے کو ابھی 'کُھلا' (Open) رکھا جائے وہاں ''شرائطِ شمولیت'' کے ضمن میں بھی سابقہ طرزِ فکر ہی کو برقرار رکھا گیا۔

جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ابتداء میں جو صورت اختیار کی گئی وہ یہ تھی کہ صرف وہی لوگ تنظیمِ اسلامی میں شامل ہو سکیں گے جو ان منکرات کو بالفعل ترک کر چکے ہوں، یہی وجہ ہے کہ تاسیسی اجلاس کے ابتدائی ایک سو تین شرکاء میں سے صرف باسٹھ (۶۲) حضرات تنظیم میں شمولیت اختیار کر سکے! ______ لیکن تقریباً ڈھائی سال بعد جب تنظیم کے لئے بیعت کے نظام کو اختیار کیا گیا تو متعلقہ عبارت میں بھی مناسب لفظی ترمیم کر دی گئی اس لئے کہ نظامِ بیعت کا تو اصل الاصول ہی یہ ہے کہ کوئی شخص جب 'جہاں' اور جیسے ہی عزم اور ارادہ کر لے کہ وہ مسلمان جئے اور مسلمان مرے گا اور اپنے جملہ فرائضِ دینی ادا کرنے کے لئے امکان بھر کوشاں رہے گا فوراً بیعت کر کے راہِ حق کے قافلے میں شامل ہو سکتا ہے۔تعلیم، تربیت اور تزکیے کے مراحل بعد میں آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کے قلوب واذہان کو ایمانِ حقیقی اور یقین ومعرفت کے نور سے منور فرمائے، ہمیں جملہ فرائض و واجبات کے التزامِ تام اور منکرات ومنہیات سے اجتناب کلّی کی توفیق عطا فرمائے، اور اپنے جملہ عہود وعقود کے ایفائے کاملہ کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

ذاتی طور پر راقم الحروف کی رائے جماعت سے علیحدگی کے دو سال کے اندر اندر یعنی اپریل ۱۹۵۹ء کے لگ بھگ ہی یہ بن چکی تھی کہ اقامتِ دین کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعت کی تنظیمی اساس بیعت کے مسنون اور ماثور اُصول پر قائم ہونی چاہئے نہ کہ عہدِ حاضر کے مغرب سے درآمد شدہ دستوری اور جمہوری اصولوں پر--- تاہم راقم کے نزدیک نہ مقدم الذکر ہیئتِ تنظیمی فرض یا واجب کے درجہ میں ہے نہ مؤخر الذکر مباحات کے دائرے سے خارج ہے--- یہی وجہ ہے کہ آٹھ سال بعد ۱۹۶۷ء میں اوّلاً رحیم آباد اور پھر رحیم یار خاں میں ایک نئی تنظیم کے قیام کا فیصلہ ہوا تو راقم اُس میں پُورے انشراح ہی نہیں، بھرپور جوش وخروش کے ساتھ شریک ہوا، حالانکہ جیسے کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ، یہ بات اظہر من الشّمس تھی کہ اُس ''بارات کے دولہا'' کی حیثیت مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کو حاصل تھی، اور وہی بلا شبہ ریب وشک مجوزہ تنظیم کے امیر بنتے اور اُن کے بارے میں یہ بات ظاہر و باہر اور معلوم ومعروف تھی کہ اُن کا شدید رجحان ہی نہیں قطعی وحتمی رائے دستوری اور جمہوری نظام کے حق میں ہے--- اسی طرح مزید آٹھ سال بعد یعنی ۱۹۷۵ء میں جب موجودہ تنظیمِ اسلامی کی تاسیس کا مرحلہ آیا تب بھی راقم نے نظامِ جماعت کے مسئلے کو کھلا رکھا اور پہلے تین سالوں کو عبوری دور قرار دیتے ہوئے اپنی حیثیت صرف کنوینر کی رکھی تاکہ جماعتِ اسلامی سے علیحدگی اختیار کرنے والے دوسرے بزرگ حضرات بھی شمولیت پر آمادہ ہو جائیں تو اُن کے مشورے بلکہ صوابدید کے مطابق ہیئتِ تنظمی تشکیل دے لی جائے! اور اس میں ہرگز کسی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ اگر وہ حضرات شمولیت اختیار کر لیتے تو لامحالہ ایک دستوری اور جمہوری نظم ہی قائم ہوتا۔

لیکن جب دو ڈھائی سال کے انتظار کے بعد ثابت ہوگیا کہ بزرگ سابقینِ جماعت میں سے کوئی ایک شخص بھی اس نئے قافلے میں شمولیت پر آمادہ نہیں ہے، تو چار ونا چار راقم کو یہ فیصلہ کر لینا پڑا کہ اب اسے اپنی ذاتی صوابدید ہی کو بُروئے کار لانا ہے۔ اور اپنی رائے پورے شرح وبسط کے ساتھ رفقاء کے سامنے رکھ دینا ہے۔ تاکہ بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّ

یَحۡیٰی مَنۡ حَیَّ عَنۡ بَیِّنَۃٍ﴾ (الانفال:۴۲) جسے ساتھ دینا ہے وہ بھی پورے انشراح صدر کے ساتھ دے، اور جسے ساتھ چھوڑ دینا ہے وہ بھی خوب سوچ سمجھ کر علیحدہ ہو!

تنظیم اسلامی کا پہلا سالانہ اجتماع ۲۵ تا ۲۷ مارچ ۱۹۷۶ء اپنے مقامِ تاسیس ہی پر منعقد ہوا تھا اور دوسرے سالانہ اجتماع کے انعقاد کے لئے بھی اواخر مارچ ۱۹۷۷ء کی تاریخوں کا تعین ہو چکا تھا کہ اچانک ملکی انتخابات میں حکومتِ وقت کی جانب سے کی گئی دھاندلیوں کے خلاف احتجاجی مظاہروں نے ملک گیر تحریک کی صورت اختیار کر لی جو ''تحریک نظامِ مصطفیٰ (ﷺ)'' کے نام سے موسوم ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی۔ لہٰذا تنظیم کے اجتماع کو ملتوی کرنا پڑا--- ۴ اور ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی درمیانی شب کو ملک میں مارشل لاء نافذ ہوا تو امن و امان کی صورتحال بحال ہوئی اور چونکہ کچھ اندازہ نہ تھا کہ تین ماہ بعد مارشل لاء کے اختتام پر ملک میں دوبارہ کیسے حالات پیدا ہو جائیں، لہٰذا بعض اہم رفقاء کے مشورے سے طے کر لیا گیا کہ پہلی فرصت میں تنظیم کا ایک اجتماع منعقد کر لیا جائے جو دوسرے اور تیسرے سالانہ اجتماعات کا قائم مقام ہو اور اس میں تنظیم کے مستقل نظام کے بارے میں حتمی فیصلہ کر لیا جائے۔

یہ اجتماع جو کچھ دو اجتماعات کے قائم مقام ہونے کے ناتے اور کچھ اہم موضوعات پر تفصیلی گفت و شنید اور بحث و تمحیص کی ضرورت کے پیشِ نظر پورے ایک ہفتے کے لئے طلب کیا گیا تھا۔ ۵ تا ۱۱ راگست ۱۹۷۷ء قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور میں جاری رہا۔ اور راقم نے حسبِ ذیل تین تنقیحات کے ذیل میں نہ صرف یہ کہ اپنے دینی فکر کو پوری وضاحت اور شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا بلکہ جملہ شرکائے اجتماع کو بھی اظہارِ خیال اور اختلافِ رائے کا پورا موقع فراہم کیا:

۱۔ اقامتِ دین، شہادت علی الناس اور غلبہ و اظہارِ دین کی **سعی و جدو جہد** نفلی عبادت یا اضافی نیکی نہیں بلکہ از روئے قرآن و حدیث **بنیادی دینی فرائض** میں شامل ہے۔

۲۔ اس دینی فریضہ کی ادائیگی کے لئے **التزامِ جماعت** واجب ہے۔

۳۔ ایسی دینی جماعت کی ہیئتِ تنظیمی مغرب سے درآمد شدہ دستوری، قانونی اور جمہوری طرز کی نہیں بلکہ قرآن و سنت اور اسلاف کی روایات سے مطابقت رکھنے

والے بیعت کے اصول پر مبنی ہونی چاہئے۔

الحمدللہ کہ ان تنقیحاتِ ثلاثہ پر پورے چھ دن سیر حاصل گفتگو ہوئی جس کے نتیجے میں شرکاءِ اجتماع کی غالب اکثریت نے راقم کے خیالات اور نظریات سے کامل اتفاق کیا اور بالآخر ناظم عمومی جناب شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کی تحریک پر حسب ذیل قرارداد منظور ہوگئی:

تنظیم اسلامی کا یہ اجتماع عام حسبِ دفعہ۳ دستور تنظیم اسلامی طے کرتا ہے کہ:

۱۔ آئندہ تنظیمِ اسلامی کا نظام مغرب سے درآمد شدہ دستوری قانونی اور جمہوری اُصولوں کے بجائے قرآن وسنت سے ماخوذ اور اسلاف کی روایات کے مطابق بیعت کے اصول پر مبنی ہوگا۔ چنانچہ تنظیمِ اسلامی کے داعیِ عمومی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب آج کے بعد سے ''امیرِ تنظیم اسلامی'' ہوں گے۔ اور تنظیم میں داخلہ ان کے ساتھ اطاعت فی المعروف کی بیعت کا شخصی رابطہ استوار کرنے سے ہوگا اور وہ بحیثیت امیر تنظیم اسلامی اپنے فرائض ''اَمْرُهُمْ شُوْرَىٰ بَيْنَهُمْ'' اور ''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ'' کی قرآنی ہدایات کے مطابق ادا کریں گے۔

۲۔ اس فیصلے سے لازم آتا ہے کہ:

(i) تنظیم اسلامی میں جو حضرات اب تک شریک رہے ہیں ان کی رفاقت آج سے ختم شمار ہوگی تا آنکہ وہ اس قرارداد کے جزء اوّل کے مطابق بیعت کے نظام میں شامل ہوجائیں۔

(ii) تنظیم اسلامی کا موجودہ دستور بھی کالعدم متصور ہوگا اور امیر تنظیمِ اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو اختیار ہوگا کہ وہ جن رفقاء سے مناسب سمجھیں مشورہ کر کے آئندہ کا دستور العمل طے کرلیں۔

۱۰/اگست ۱۹۷۷ء کو اس قرداد کی منظوری اور اس پر جملہ شرکاء اجتماع کے دستخط ثبت ہونے پر گویا تنظیمِ اسلامی کا عبوری دور ختم اور نیا اور مستقل دور شروع ہوگیا۔

اس عرصے کے دوران اگر کوئی خیر ذاتی طور پر راقم الحروف اور اجتماعی طور پر تنظیمِ اسلامی سے بن آیا ہے تو وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور توفیق وتیسیر کا مظہر ہے--- اور کوتاہیاں اور لغزشیں سرزد ہوئیں تو ہمارے اپنے نفوس کی شرارتوں کی بنا پر--- چنانچہ آئندہ کے لئے اللہ تعالیٰ ہی سے دعا

ہے کہ وہ اپنے خصوصی فضل وکرم سے نوازتے ہوئے ہدایت واستقامت میں اضافہ فرمائے اور شیطان کے فریب اور نفس کی شرارتوں سے اپنی حفاظت میں رکھے! رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ! آمین

تنظیم اسلامی کے لئے اُصولی طور پر ''بیعتِ سمع وطاعت فی المعروف'' کی تنظیمی اساس کو اختیار کر لینا تو مشکل نہ تھا لیکن موجودہ حالات میں اس بنیاد پر ایک جماعتی نظام کا ڈھانچہ بالفعل کھڑا کرنا ہرگز آسان نہ تھا۔ اس لئے کہ ایک جانب یہ تصور ''آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل'' کے مصداق ذہنوں سے بالکل خارج ہو چکا تھا، اور دوسری جانب ''بیعت'' کے ساتھ ایسے بہت سے عجیب وغریب تصورات لازم وملزوم کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں جن سے موجودہ ذہن ہی نہیں خود فطرتِ انسانی اِبا کرتی ہے--- یہی وجہ ہے کہ ابتداء میں کچھ عرصے تک ہم خود بھی اس کے اظہار واعلان میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے رہے کہ دنیا کیا کہے گی--- ؎ ''کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!'' --- بعد میں جب اس کا چرچا عام ہوا تو نہ صرف تمسخر اور استہزاء، بلکہ تردید اور مخالفت کا بازار بھی گرم ہوا--- لیکن بحمد للہ اب جبکہ اس نظام کو بالفعل چلتے ہوئے کئی برس ہونے کو آئے ہیں، اور نہ صرف اندرون ملک کثیر تعداد میں، بلکہ بیرون ملک حتیٰ کہ انگلستان اور امریکہ میں مقیم حضرات نے بھی معتد بہ تعداد میں اپنے فرائضِ دینی کی ادائیگی کے لئے بیعت کا قلادہ گردن میں ڈالنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی ہے، ہم اپنے دلوں میں گہرے تشکر آمیز اطمینان کا احساس موجزن پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک مردہ سنت کے احیاء کی توفیق عطا فرمائی--- وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْ لَا اَنْ هَدَانَا اللّٰهِ!!

بیرونی تمسخر اور مخالفت کو برداشت کرنے سے زیادہ کٹھن مرحلہ اُن غلط تصورات کے خاتمے کا تھا جو بیعت کے لفظ کے ساتھ لامحالہ وابستہ ہو گئے ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور مکروہ تصور یہ ہے کہ بیعت کے نظام میں نہ باہمی مشاورت کی کوئی گنجائش ہے نہ اختلافِ رائے اور اظہارِ خیال کا کوئی موقع! چنانچہ ہمیں اس غلط تصور کی نفی اور اس حقیقت کے اثبات میں بہت محنت بھی کرنی پڑی اور بہت سا وقت بھی صَرف کرنا پڑا کہ نظامِ بیعت میں اختلافِ رائے کی گنجائش' اظہارِ خیال کے مواقع' اور باہمی مشاورت کا میدان نام نہاد جمہوری نظام سے بھی وسیع تر موجودہ ہے--- اور فرق صرف اتنا ہے کہ جمہوری نظام میں آخری فیصلہ ؎ ''بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!'' کے مصداق

آراء کی گنتی کی بنیاد پر ہوتا ہے جبکہ نظامِ بیعت میں اظہارِ رائے اور کھلی بحث وتمحیص کے بعد آخری فیصلہ صاحبِ امر کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے! گویا نظامِ بیعت میں اُصولِ قرآنی: ''وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ'' (الشوریٰ: ۳۸) کی بالفعل تعمیلِ حکمِ قرآنی: ''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ'' (آل عمران: ۱۵۹) کے مطابق ہوتی ہے۔

دوسری جانب اس تصور کا خاتمہ بھی ہرگز آسان نہ تھا کہ مشاورت باہمی کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اکثریت کی رائے کو فیصلہ کُن قرار دیا جائے، اس لئے کہ عہدِ حاضر میں ''سلطانیٔ جمہور'' کا تصور نہ صرف یہ کہ حد درجہ عالمگیر ہو چکا ہے بلکہ لوگوں کے شعور ہی نہیں تحت الشعور کی گہرائیوں میں اس حد تک سرایت کر چکا ہے، کہ بسا اوقات بیعت کے نظام کو اصولاً تسلیم اور اختیار کر لینے کے بعد بھی اس پر اصرار برقرار رہتا ہے کہ امیر کو شوریٰ کی اکثریت کے فیصلے کا ''پابند'' ہونا چاہئے۔

الغرض تنظیم اسلامی کے لئے بیعت کا نظام اُصولی طور پر تو ۱۹۷۷ء میں اختیار کر لیا گیا تھا[۱]، اور اس کے بعد عملاً تنظیم کی گاڑی اسی پٹڑی پر چل رہی ہے، تاہم اس کے مضمرات اور متضمنات کے واضح ہونے اور اسی کی بنیاد پر ایک جماعتی نظام کی تفصیلی تشکیل اور اس کے خدوخال کے صفحۂ قرطاس پر مرتسم ہونے میں کم وبیش دس سال کی مدت صرف ہوئی۔ اور نہ صرف اصولی غور وخوض بلکہ دس سالہ تجربات کی روشنی میں تنظیم اسلامی کے لئے ایک تحریری ''نظام العمل'' کی تسوید وتبییض کا مرحلہ اوائل ۱۹۸۸ء میں شروع ہو سکا۔ جبکہ تنظیم کی مرکزی مجلسِ مشاورت نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲، ۳ مارچ ۱۹۸۸ء میں باضابطہ طے کیا کہ:

> ''تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لئے بیعت کی اساس اگرچہ دس سال قبل اختیار کر لی گئی تھی لیکن فی زمانہ کسی ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے اس مسنون اساس کے متروک العمل ہونے کے باعث تنظیم اسلامی کو بھی اس کے عملی تقاضوں سے کامل ہم آہنگی کے ضمن میں تدریجی مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ اسی ضمن میں اگرچہ متعدد فیصلے مختلف اوقات میں کئے جاتے رہے ہیں لیکن ان کو باضابطہ ضبطِ تحریر میں نہیں لایا گیا۔ اسی طرح اگرچہ تنظیم کی قراردادِ تاسیس اور اس کی توضیحات میں بعض تاریخی اسباب کی بنا پر فریضۂ اقامتِ دین کی اہمیت اور اس کے لئے جہاد فی سبیل اللہ کے لزوم کے قدرے خفی اور غیر نمایاں ہونے کے پیشِ نظر تنظیم کے آٹھویں سالانہ اجتماع میں یہ اعلان کر

(۱) ''اسلامی نظم جماعت اور بیعت کی اہمیت'' کے عنوان سے تفصیلات اس تالیف کے حصہ سوم یعنی ''تنظیم اسلامی کی فکر اور طریقہ کار'' میں ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب)

دیا گیا تھا کہ آئندہ تنظیم اسلامی محض اصلاحی اور دعوتی نہیں بلکہ انقلابی تنظیم ہو گی۔ تاہم ابھی تک یہ بات بھی پوری وضاحت کے ساتھ تحریری طور پر سامنے نہیں آئی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان دونوں اُمور کو مجوزہ نظام العمل میں صراحت کے ساتھ درج کر دیا جائے اور جیسے کہ پانچ سال قبل طے کیا گیا تھا تنظیمِ اسلامی کی قراردادِ تاسیس مع توضیحات اور ''شرائطِ شمولیت'' پر مشتمل مفصل تحریر کو آئندہ تنظیم کی آئینی و دستوری اساس نہیں بلکہ اس کے دعوتی اور تربیتی لٹریچر کا اہم اور اساسی حصہ سمجھا جائے۔''

الحمدللہ کہ اندریں اثناء تنظیم کا تفصیلی ''نظام العمل'' تیار ہو کر ''سلسلۂ اشاعتِ تنظیمِ اسلامی نمبر۴'' کی حیثیت سے شائع ہو رہا ہے۔(۱)

خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ

۱۹۹۱ء

(۱) اس تالیف کے اختتام پر ضمیمہ جات میں اس نظام العمل کا تازہ ایڈیشن شائع کر دیا گیا ہے۔(مرتب)

قرار داد تاسیس

(منظور شدہ اجتماعِ رحیم یار خان ۸۔۹ ستمبر ۱۹۶۷ء)

مع

توضیحات وتقاریظ

تقاریر: مولانا امین احسن اصلاحیؒ و مولانا عبدالغفار حسنؒ

اور

تقاریظ: مولانا عبدالماجد دریابادیؒ و مولانا عبدالباری ندویؒ

(شائع شدہ 'میثاق' نومبر، دسمبر ۱۹۶۷ء)

قرار دادِ تاسیس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

’’آج ہم اللہ کا نام لے کر ایک ایسی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں جو دین کی جانب سے عائد کردہ جُملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری ممدّ و معاون ہو۔

ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اُسی کی اخلاقی و روحانی تکمیل اور فلاح و نجات، دین کا اصل موضوع ہے، اور پیشِ نظر اِجتماعیت اصلاً اسی لئے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے۔

لٰہذا پیشِ نظر اِجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہئے کہ اُس میں فرد کی دینی اور اخلاقی تربیت کا کماحقہٗ لحاظ رکھا جائے اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے کہ اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جِلا حاصل ہو، ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے، ان کے عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو، عبادات اور اتباعِ سنت سے اُن کا شغف اور ذوق و شوق بڑھتا چلا جائے، عملی زندگی میں حلال و حرام کے بارے میں اُن کی حِس تیز تر اور اُن کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نُصرت و اقامت کے لئے اُن کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے۔ اِن تمام اُمور کے لئے

ذہنی اور علمی رہنمائی کے ساتھ ساتھ عملی تربیت اور تاثیرِ صحبت کے اہتمام کی جانب خصوصی توجہ ناگزیر ہے۔

دعوتِ دین کے ضمن میں ہمارے نزدیک ''اَلدِّینُ النَّصِیحۃُ'' کی روح اور ''اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ'' کی تدریج ضروری ہے۔ لہٰذا دعوت واصلاح کے عمل کو فرد سے اوّلاً کنبہ اور خاندان اور پھر تدریجاً ماحول کی جانب بڑھانا چاہیئے۔ اس ضمن میں نئی نسل کی دینی تعلیم وتربیت کا خصوصی اہتمام ناگزیر ہے۔

عامۃُ النّاس کو دین کی دعوت وتبلیغ کی جو ذمہ داری امتِ مسلمہ پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتی ہے' اس کے ضمن میں ہمارے نزدیک اہم ترین کام یہ ہے کہ جاہلیتِ قدیمہ کے باطل عقائد ورسوم اور دورِ جدید کے گمراہ کن افکار ونظریات کا مدلّل ابطال کیا جائے اور حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کے لئے کتاب وسنت کی ہدایت ورہنمائی کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے، تاکہ ان کی اصلی حکمت اور عقلی قدر و قیمت واضح ہو اور وہ شبہات وشکوک رفع ہوں جو اس دَور کے لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں۔''

توضیحات

قرارداد میں جن اُمور کی وضاحت کی گئی ہے ان میں اوّلین اوراہم ترین امر یہ ہے کہ ''ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔اسی کی اخلاقی اور روحانی تکمیل اور فلاح ونجات، دین کا اصل موضوع ہےاور پیش نظر اجتماعیت اصلاً اسی لئے مطلوب ہے کہ وہ فرد کواس کے اصل نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے!--- اس تصریح کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ماضی میں مسلمانوں کوان کی یہ ذمہ داری تو بالکل ٹھیک یاد کرائی گئی کہ جس دین کے وہ مدعی ہیں اسے دنیا میں عملاً قائم کرنے کی سعی و جہد بھی ان پرفرض ہےاور یہ کہ دین محض ذاتی عقائداور کچھ مراسمِ عبودیت یعنی انسان اوررب کے مابین پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی پوری انفرادی واجتماعی زندگی کواپنے احاطے میں لینا چاہتا ہے لیکن ان اُمور پراس قدر زور دیا گیا کہ بندے اوررب کے مابین تعلق کی اہمیت اورافراد کی اپنی علمی، اخلاقی اوررُوحانی ترقی نظرانداز ہوتی چلی گئی۔آئندہ جوکام پیشِ نظر ہے اُس کے اُصُول ومُبادی میں یہ نکتہ بہت زیادہ قابلِ لحاظ رہے گا کہ ایک مسلمان کا اصل نصب العین صرف نجات اُخروی اور رضائے الٰہی کا حصول ہےاوراس کے لئے اسے اصل زور اپنی سیرت کے تطہیر وتزکیے اور اپنی شخصیت کی تعمیر وتکمیل پر دینا ہوگا جس سے تعلق مع اللہ اور محبت خدا اور رسول ﷺ میں اضافہ ہوتا رہےاوراس میں زیادہ سے زیادہ اخلاص پیدا ہوتا چلا جائے۔دین کی تائید ونصرت اورشہادت واقامت یقیناً فرائضِ دینی میں سے ہیں لیکن ان کے لئے کوئی ایسی اجتماعی جدوجہد ہرگز جائز نہیں ہے جوافراد کوان کے اصل نصب العین سے غافل کرکے انہیں محض ایک دُنیوی انقلاب کے کارکن بناکے رکھ دے!--- چنانچہ پیش نظر اجتماعیت میں اوّلین زور افراد کی دینی واخلاقی تربیت پر دیا جائے گا اوراس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے گا کہ --- ''اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کوجِلا حاصل ہو، ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے، ان کے عقائد کی تصحیح وتطہیر ہو، عبادات اوراتباعِ سنت سے ان کا شغف اور ذوق وشوق بڑھتا چلا جائے، عملی زندگی میں حلال وحرام کے

بارے میں ان کی حس تیز تر اور ان کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت واشاعت اور اس کی نصرت واقامت کے لئے ان کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے۔''

''دینی جذبات کے جِلا'' کے لئے قرآن مجید کی بلا ناغہ تلاوت مع تدبر، سیرتِ نبویؐ اور سِیَر الصحابہؓ کا مطالعہ، مجالسِ وعظ کا انعقاد، باہمی مذاکرۂ آخرت اور مضامینِ موعظت پر مشتمل آسان لٹریچر کی اشاعت پر زور دیا جائے گا۔

''علم میں اضافے'' کے لئے عربی زبان کی تحصیل کی عام ترغیب اور اس کا اہتمام قرآنِ حکیم اور حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے باقاعدہ حلقہ ہائے درس کا قیام اور جاہلیتِ قدیمہ وجدیدہ پر اسلام کے نقطۂ نظر سے تنقیدی کتب کی نشر واشاعت کا اہتمام کیا جائے گا۔

مندرجہ بالا دونوں اُمور سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ جاہلیتِ قدیم وجدید دونوں کے اثرات قلوب واذہان سے محو ہوں، عقائد کی تصحیح وتطہیر ہو اور صحیح اسلامی عقائد کی تخم ریزی وآبیاری ہو سکے۔

شرکائے تنظیم کے دینی جذبات کے جِلا اور علم میں اضافے کا براہِ راست اثر عملی زندگی پر پڑے گا اور ان کی زندگیوں میں دینی تبدیلی عملاً پیدا ہوتی چلی جائے گی لیکن اس میدان میں اس امر کی شدید ضرورت ہوگی کہ اس بات کی کڑی نگرانی کی جائے کہ یہ تبدیلی ہمہ جہتی ہو اور اعمالِ انسانی کے مختلف گوشوں میں متناسب انداز میں ظہور پذیر ہو۔ چنانچہ عبادات میں ذوق وشوق، معاملات میں احتیاط و تقویٰ اور دعوتی وتنظیمی سرگرمیوں میں شغف اور دلچسپی متناسب انداز میں بڑھے۔ یہ صورتِ حال کہ جلسوں کے انعقاد کے ضمن میں تو پابندی بھی ملحوظ رہے اور جوش وخروش کا بھی مظاہرہ کیا جائے لیکن نماز باجماعت کی پابندی گراں محسوس ہو اور نوافل سرے سے خارج از بحث ہو جائیں، دین کی نصرت وحمایت کا جذبہ تو ترقی کرتا چلا جائے لیکن تزکیۂ باطن کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے، یا سنتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی حجیت و اہمیت پر دلائل تو ازبر ہوں لیکن خود اپنی زندگی میں اتباعِ نبویؐ کی جھلک نظر نہ آئے، نہ صرف یہ کہ افراد کے حق میں سمِّ قاتل ہے بلکہ خود اجتماعیت کے لئے بھی سخت مُضر اور مہلک ہے--- لہٰذا اس امر کی کڑی نگرانی ضروری ہوگی کہ شرکاء میں عبادات سے شغف، اتباعِ سنت کا جذبہ، معاملات میں حلال وحرام کی حدود و قیود کی پابندی اور دعوتی وتنظیمی سرگرمیوں سے دلچسپی توافق وتناسب کے ساتھ بڑھیں۔ خصوصاً یہ احتیاط تو انتہائی لازمی ہوگی کہ پیشِ نظر اجتماعیت کے تنظیمی ڈھانچے میں جو لوگ آگے آئیں وہ تیزی ومستعدی اور نفاست وباقاعدگی سے کام کرنے کی صلاحیت کے اعتبار سے چاہے کسی قدر تہی دست ہوں، عبادات اور

اتباعِ سنت کے ذوق وشوق سے ہرگز تہی دامن نہ ہوں۔

شرکائے جماعت میں مندرجہ بالا تبدیلیوں--- یا بالفاظ دیگر ان کے نفوس کے تزکیہ اوران کی شخصیت کی دینی تعمیر کے لئے جہاں ذہنی وعلمی رہنمائی اورفکری تربیت لازمی ولابدی ہیں وہاں عملی تربیت اور تاثیرِ صحبت کا موثر اہتمام بھی ضروری و ناگزیر ہے۔ اس غرض کے لئے مختلف مقامات پر تربیت گاہوں کا سلسلہ بھی شروع کیا جاسکتا ہے اورایک ایسی مرکزی تربیت گاہ کا قیام بھی عمل میں لایا جاسکتا ہے جس میں مختلف مقامات کے رفقاء گروپس (GROUPS) کی صورت میں شریک ہوں اورایک مقررہ میعاد میں انہیں قرآن وحدیث کے منتخب حصص کا درس بھی دیا جائے اورایک ایسی دینی فضا بھی مہیا کی جائے جس میں ان کے دینی جذبات بھی از سرنو تروتازہ ہوں اورایک خالص اسلامی زندگی بسر کرنے کا عملی تجربہ بھی حاصل ہوجائے۔

قرارداد کے بنیادی نکات میں سے دوسرااہم اور بنیادی نکتہ یہ ہے کہ __ ''دعوت کے ضمن میں ہمارے نزدیک ''الدین النصیحة'' کی روح اور''الاقرب فالاقرب'' کی تدریج ضروری ہے۔ ''پیش نظراجتماعیت لازماً یہ چاہے گی کہ اس کا ہرشریک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں داعی الی اللہ اوراپنے ماحول میں حسب مقدور وصلاحیت اور بقدر ہمت واستطاعت ہدایت کا ایک روشن چراغ بن کررہے اوراس کی شخصیت پر بحیثیت مجموعی داعیانہ رنگ غالب ہوجائے۔

اس دعوت کا اصل محرک ابنائے نوع کی ہمدردی اورنصح وخیرخواہی کا جذبہ ہونا چاہئے اوراس میں نہ تواپنی شخصیت کی نمود کا کوئی شائبہ شامل ہونا چاہئے نہ طلب جاہ کا۔ حتیٰ کہ اللہ، رسولؐ اورشریعت کی وفاداری کے جذبے کے تحت اگرکبھی کسی فرد، گروہ یا ادارے پر تنقید کی نوبت آجائے تو اس میں بھی ہمدردی اوردلسوزی غالب رہے اورذاتی رنجش یا انتقامِ نفس کا کوئی شائبہ نہ پیدا ہونے پائے۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت بہت ضروری ہے کہ--- ہمارے معاشرے کا مجموعی مزاج اگرچہ دین سے بہت دورجاچکا ہے اوراس اعتبار سے انتہائی اصلاح طلب ہے لیکن دعوت واصلاح کے عمل میں دو حقائق کا لحاظ ضروری ہے۔ ایک یہ کہ یہ معاشرہ ایک مجموعی اکائی ہے اوراس کے تمام طبقات میں انحطاط سرایت کرچکا ہے۔ اس اعتبار سے اس کے مختلف طبقات میں کمیت کا تھوڑا بہت فرق چاہے موجود ہوکوئی بنیادی امتیاز موجودنہیں ہے اوردوسرے یہ کہ انحطاط براہِ راست نتیجہ ہے جذبات ایمانی کے ضعف اورکتاب وسنت کے علم کی کمی کا۔ اس میں دین دشمنی کا عنصر چندایسی استثنائی صورتوں کے

سوا موجود نہیں ہے جو اگرچہ بجائے خود تو بہت خطرناک ہیں اور ان سے خبردار رہنے کی بھی ضرورت ہے تاہم مجموعی اعتبار سے ہمارے معاشرے کے عام بگاڑ کا اصل سبب دین دشمنی نہیں بلکہ دین سے لاعلمی ہے۔ حکومت اس معاشرے کا جامع عکس اور اربابِ اقتدار اس کا اہم جزو ہیں۔ اُن کو اپنی اہمیت اور معاشرے میں اثر و نفوذ کی قوت و صلاحیت کے اعتبار سے دعوت و تخاطب میں اولیت تو دی جاسکتی ہے اور دی جانی چاہئے لیکن انہیں دین کا دشمن قرار دے کر ان کے خلاف نفرت و عداوت کے جذبات پیدا کرنے کے لئے عوام کے دینی جذبے کو مشتعل کرنا درآں حالیکہ خود عوام کی ایک عظیم اکثریت کا حال دین سے بے خبری اور عملی بُعد کے اعتبار سے خود کم و بیش وہی ہے جو اصحابِ قوت و اختیار کا، نہ ان کی خیر خواہی ہے نہ خود دین کی۔ رہا اقتدار کے حصول کی خاطر برسرِ اقتدار طبقے کے مخالف و معاند کی حیثیت اختیار کرنا تو یہ ہمارے نزدیک دینی نقطہ نظر سے نہایت مضر ہی نہیں سخت مہلک ہے جس سے کُلّی اجتناب لازمی و لابدی ہے۔ ہمارے نزدیک ''اَئِمَّةُ الْمُسْلِمِين'' اور ''عامّتهم'' دونوں ہی نصح و خیر خواہی کے برابر مستحق اور دعوت و اصلاح کے یکساں محتاج ہیں!

یہاں یہ تصریح بھی ضروری ہے کہ ہماری دانست میں انتخابات کے ذریعے عمومی اصلاح کا نظریہ نری خام خیالی پر مبنی ہے، بحالاتِ موجودہ تو اس امر کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں ہے کہ انتخابات کے ذریعے اصلاح کی اُمید کی جائے۔ ویسے بھی ہماری رائے میں انتخابات میں دوسری جماعتوں کے مخالف و مقابل کی حیثیت سے شرکت، دعوت و اصلاح کے صحیح نہج کے منافی ہے اور اس سے قبولِ حق کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

داعی کے قلب میں اپنے ابنائے نوع کے لئے جس ہمدردی اور نصح و خیر خواہی کا ہونا لازمی ہے، اسی کا ایک اہم مظہر رافت و رحمت اور شفقت و رقت کا وہ جذبہ ہے جو ابنائے نوع کو تکلیف اور مصیبت میں دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور عملی زندگی میں خدمتِ خلق اور ایثار و انفاق کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ دعوت دین اور خدمت خلق کا ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں بلکہ بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ دین کا وہ داعی جو خادم خلق نہ ہو اپنی دعوت میں دولت اخلاص سے محروم ہے۔ اس ضمن میں یہ فرق البتہ ضرور پیش نظر رہنا چاہئے کہ خدمت خلق کی اجتماعی سکیموں کا زیرِ عمل لانا بالکل دوسری بات ہے اور افراد میں خدمت خلق کے جذبے کا پیدا ہونا اور بڑھنا بالکل دوسری چیز ہے۔ خدمت خلق کی اجتماعی سکیموں کی اہمیت اپنی جگہ کتنی ہی مسلم ہو، دعوت دین

کے نقطہ نظر سے اصل مطلوب افراد کے قلوب میں شفقت و رحمت کے جذبے اور عمل میں ایثار و انفاق کی کیفیت کا ظہور ہے۔ پیشِ نظر اجتماعیت میں اصل زور ان شاء اللہ اسی پر دیا جائے گا۔

دعوت کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس کا تخاطب لازماً ایک تدریج کے ساتھ داعی کے اپنے نفس سے شروع ہو کر ﴿عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ اپنے اہل و عیال ﴿قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ اور کنبے قبیلے ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ سے ہوتے ہوئے اپنی قوم ﴿يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ﴾ اور پھر پوری انسانیت ﴿لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ تک پہنچنا چاہئے۔ ہمارے نزدیک یہ صورت کہ داعی اپنے آپ کو بھول جائے اور برّ و تقویٰ کی ساری دعوت دوسروں کو دیتا رہے۔ ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ یا اپنے خاندان اور کنبے قبیلے کو تو بھول جائے اور دور دراز کے لوگوں میں ہدایت کی سوغات بانٹنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہو، نہایت خطرناک مرض کی علامت ہے، دعوت کے عمل کا صحیح نہج یہ ہے کہ اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ کے اصول پر آگے بڑھے اور جس سے جتنی قربت اور محبت داعی کو ہو دعوت و تخاطب میں اسی قدر اسے مقدم رکھا جائے۔ اس سلسلے میں یہ خیال البتہ صحیح نہ ہوگا کہ ایک مرحلے کی تکمیل کے بعد ہی دوسرا مرحلہ شروع کیا جائے۔ مطلوب صرف یہ ہے کہ دعوت کے عمل کو ایک فطری تدریج اور حسین تناسب کے ساتھ اپنی ذات، اہل و عیال، کنبے قبیلے اور پھر عوام الناس تک بڑھنا چاہئے۔

اس سلسلے میں ہمیں اپنی اولاد اور فی الجملہ نئی نسل کے بارے میں خصوصی توجہ و اہتمام سے کام لینا ہوگا، اس لئے کہ ان کے بارے میں ہم حدیث نبویؐ (كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّ كُلُّكُمْ مَّسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ).... کی رو سے براہِ راست مسئول اور ذمہ دار ہیں۔ اولاد کی دینی تعلیم و تربیت کا یہ اہتمام ذاتی و انفرادی بھی ہوگا اور جہاں جہاں ممکن ہوگا اور وسائل دستیاب ہو سکیں گے اس امر کی سعی بھی کی جائے گی کہ ایسے مدارس اپنے اہتمام میں قائم کئے جائیں جن میں نئی نسل کے قلوب و اذہان میں ایمان کی تخم ریزی و آبیاری اور اخلاقی و عملی تربیت کا بندوبست کیا جائے۔

وسائل دعوت کے ضمن میں کوئی تعین غیر ضروری ہے۔ حسب صلاحیت و استعداد انفرادی و نجی گفتگو، خطاب ہائے عام، خطاب جمعہ اور دروس قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کے تمام جدید طریقوں کو اختیار کیا جا سکتا ہے!

قرارداد کا تیسرا اہم نکتہ ''عامۃ الناس کو دین کی دعوت و تبلیغ'' کی اس ذمہ داری سے بحث کرتا

ہے جو ''امتِ مسلمہ پر بحیثیتِ مجموعی عائد ہوتی ہے'' ہمارے نزدیک انذار و تبشیر، دعوت و تبلیغ اور شہادتِ حق علی الناس کی جو ذمہ داریاں انبیائے کرام علیہم السلام پر عائد ہوا کرتی تھیں، وہ اب حضور نبی کریم ﷺ پر نبوت و رسالت کے ختم ہو جانے کے بعد آپ کی اُمت پر بحیثیتِ مجموعی عائد ہوتی ہیں۔ اوّل اوّل اُمت نے ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کے نظام کے تحت اپنی اس ذمہ داری کو اجتماعی حیثیت سے ادا کیا، اس کے خاتمے کے بعد بھی ایک عرصے تک مسلمان حکومتیں اِس فرضِ منصبی کو ادا کرتی رہیں۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اتقیاء و صلحاء ذاتی طور پر دُور دراز علاقوں میں پہنچ کر دین کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ ادھر عرصے سے یہ سلسلہ بھی تقریباً ختم ہو چکا ہے اور اُمتِ مسلمہ بحیثیتِ مجموعی ''کتمانِ حق'' کے جرم کی مرتکب ہو رہی ہے اور صورتِ حال یہ ہے کہ اُمت کی تمام اجتماعی سرگرمیاں صرف اپنے دفاع اور دنیوی ترقی و استحکام تک محدود ہیں۔ کچھ تھوڑا بہت دینی رنگ کسی اجتماعی سرگرمی میں ہے بھی تو وہ محض اُمّت کی داخلی اصلاح کی حد تک ہے۔ ہمارے نزدیک یہ صورتِ حال سخت تشویشناک ہے اور اس سے نہ صرف یہ کہ اُخروی بازپُرس کا اندیشہ ہے، بلکہ ہماری رائے میں ہماری دنیوی نکبت و ذلّت کا اصل سبب بھی یہی ہے!

اس ضمن میں ہمارے نزدیک اس وقت کرنے کا اہم ترین کام یہ ہے کہ ایک طرف ادیانِ باطلہ کے مزعومہ عقائد کا مؤثر و مدلل ابطال کیا جائے اور دوسری طرف مغربی فلسفہ و فکر اور اس کے لائے ہوئے زندقہ والحاد اور مادہ پرستی کے سیلاب کا رُخ موڑنے کی کوشش کی جائے اور حکمتِ قرآنی کی روشنی میں ایک ایسی زبردست جوابی علمی تحریک برپا کی جائے جو توحید، معاد اور رسالت کے بنیادی حقائق کی حقانیت کو بھی مبرہن کر دے اور انسانی زندگی کے لئے دین کی رہنمائی و ہدایت کو بھی مدلل و مفصل واضح کر دے۔ ہمارے نزدیک اسلام کے حلقے میں نئی اقوام کا داخلہ، اور جسدِ دین میں نئے خون کی پیدائش ہی نہیں، خود اسلام کے موجود الوقت حلقہ بگوشوں میں حرارتِ ایمانی کی تازگی اور دین و شریعت کی عملی پابندی اسی کام کے ایک موثر حد تک تکمیل پذیر ہونے پر موقوف ہے، اس لئے کہ دورِ جدید کے گمراہ کن افکار و نظریات کے سیلاب میں خود مسلمانوں کے ذہین اور تعلیم یافتہ طبقے کی ایک بڑی تعداد اس طرح بہہ نکلی ہے کہ ان کا ایمان بالکل بے جان اور دین سے ان کا تعلق محض برائے نام رہ گیا ہے اور اسی بنا پر دین میں نِت نئے فتنے اُٹھ رہے ہیں اور ضلالت و گمراہی نت نئی صورتوں میں ظہور پذیر ہو رہی ہے۔

اس سلسلے میں انفرادی کوششیں تو اب بھی جیسی کچھ بھی عملاً ممکن ہیں جاری ہیں اور آئندہ بھی جاری رہیں گی۔ضرورت اس کی داعی ہے جیسے بھی ممکن ہو وسائل فراہم کئے جائیں اور ایک ایسے باقاعدہ ادارے کا قیامِ عمل میں لایا جائے جو حکمتِ قرآنی اور علمِ دینی کی نشرواشاعت کا کام بھی کرے اور ایسے نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کا بھی مناسب اور مؤثر بندوبست کرے جو عربی زبان، قرآن حکیم اور شریعتِ اسلامی کا گہرا علم حاصل کر کے اسلامی اعتقادات کی حقانیت کو بھی ثابت کریں اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے جو ہدایات اسلام نے دی ہیں انہیں بھی ایسے انداز میں پیش کریں جو موجودہ اذہان کو اپیل کر سکے۔

آخر میں اس امر کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ پیشِ نظر تنظیم ہرگز ''الجماعت'' کے حکم میں نہ ہوگی۔الجماعۃ کا مقام ہماری دانست میں اُمتِ مسلمہ کو بحیثیتِ مجموعی حاصل ہے۔پیشِ نظر اجتماعیت کی حیثیت مسلمانوں کی ایک ایسی تنظیم کی ہوگی جس میں وہ لوگ شریک ہوں گے جو خود اصلاحِ نفس اور تعمیرِ سیرت کے خواہش مند ہوں اور ان جملہ انفرادی واجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا چاہیں جو دین کی جانب سے ان پر عائد ہوتی ہیں تاکہ ایک طرف اُن کا باہمی تعاون ایک دوسرے کے لئے سہارا بن سکے اور دوسری طرف اصلاحِ معاشرہ کے لئے ایک مؤثر قوت فراہم ہو جائے--- دین کی خدمت نہایت وسیع وعظیم کام ہے اور اس کے گوشے بے شمار ہیں۔ہم ان تمام جماعتوں اور اداروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کسی بھی گوشے میں دین کی خدمت کا کام کر رہے ہیں اور انشاءاللہ ان کے ساتھ ہمارا رویہ تعاون وتائید ہی کا ہوگا--- اپنے فہم وفکر کے مطابق ہم بھی دین کی خدمت کی ایک ادنیٰ کوشش کے لئے جمع ہو رہے ہیں اور یہ توقع کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ دین کے تمام خادم ہمیں اپنے رفیقِ راہ گردانیں گے--- اس تصریح کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ ہم واقعۃً تمام دینی عناصر خصوصاً علمائے کرام کے تعاون کی شدید احتیاج محسوس کرتے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ☆

تقریر--- مولانا امین احسن اصلاحیؒ

خطبۂ مسنونہ کے بعدؒ

بھائیو اور دوستو!

ایک طویل مدت کے بعد ہم خیال و ہم مقصد دوستوں کی صحبت میسر آئی ہے تو معلوم نہیں دل کے کتنے گوشے ہیں جن کے دریچے کھل گئے ہیں اور کتنے سوئے ہوئے خیالات ہیں جو جاگ پڑے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان ساری باتوں کو ایک صحبت میں کہہ ڈالنا ممکن نہیں ہے۔ یہ تو جب بھی کہی جائیں گی مختلف قسطوں ہی میں کہی جائیں گی۔ اس وقت تو صورتِ حال یہ ہے کہ سرا نہیں مل رہا ہے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے، کیا بات کہی جائے کیا نہ کہی جائے اور شروع کر کے بات کہاں ختم کی جائے۔ اِس اُلجھن کی وجہ سے آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں گفتگو صرف اس قرارداد کی وضاحت تک محدود رکھوں جو اپنے پورے مالہٗ اور ماعلیہ کے ساتھ آپ کے سامنے آ چکی ہے۔

اس قرارداد کی وضاحت کرنے میں اِس وجہ سے نہیں اٹھا کہ اِس میں کوئی ابہام و اجمال ہے۔ یہ اپنے مقصد و مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ جس طرح میں نے اس کو سمجھ لیا ہے اسی طرح آپ نے بھی اس کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ میری اس وضاحت کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس میں جو نصبُ العین اور جو طریقۂ کار اپنانے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے اس کے بعض دلائل آپ کے سامنے عرض کروں تا کہ اس کی پوری اہمیت آپ کے سامنے آ جائے۔

ہم نے اس قرارداد میں اللہ کا نام لے کر ایک ایسی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کیا ہے: ''جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے میں ہماری مدد کرے!'' --- قرارداد کا یہ جملہ دو اہم حقیقتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ایک اس حقیقت کی طرف کہ آپ تنظیم کو بجائے خود غایت و مقصد نہیں سمجھتے بلکہ اس کو صرف دین کی عائد کردہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں اپنے لئے ممدّ و معاون سمجھتے ہیں۔ دوسرے اس بات کی طرف کہ آپ اپنا نصب العین دین کو سمجھتے ہیں اور اس دین کو اپنی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں پر حاوی مانتے ہیں۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے وہ درحقیقت ایک بڑے خطرے سے آگاہی ہے۔ وہ خطرہ یہ ہے

کہ جماعتیں اور تنظیمیں قائم تو ہوئی ہیں اصلاً کسی اعلیٰ اور برتر نصب العین کے لئے، لیکن قائم ہو جانے کے بعد آہستہ آہستہ وہ خود نصب العین اور مقصد بن جاتی ہیں، اور اصل نصب العین غائب ہو جاتا ہے۔ آپ کو اس خطرے سے ہر قدم پر ہوشیار رہنا ہے۔ اس چیز نے نہ صرف جماعتوں اور تنظیموں کو تباہ کیا ہے، بلکہ ملتوں اور اُمتوں کو بھی بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اِس تغیر کا نتیجہ صرف یہی نہی ہوتا کہ اصل مقصد غائب ہو جاتا ہے بلکہ مقصد وسیلہ اور ذریعہ کا ایک ادنیٰ خادم اور چاکر بن کے رہ جاتا ہے۔ پھر تنظیم مقصد کی خدمت نہیں کرتی بلکہ مقصد کو اپنی خدمت اور اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتی ہے۔ مذہب کے نام پر قائم ہونے والی جماعتوں کے لئے یہ چیز خاص طور پر خطرناک ہے، اس لیے کہ جب اس طرح کی کوئی جماعت خود اپنے وجود اور اُس کے قیام و بقا کو مقصود بنا لیتی ہے تو وہ مذہب کی بھی جن چیزوں کو اپنے اِس مقصد کی راہ میں مزاحم پاتی ہے، اُن کو بدل کر اپنے جماعتی اغراض کے سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔ مذاہب کی تاریخ ایک ساتھ شہادت دیتی ہے کہ اس چیز نے بے شمار تحریفات کی راہیں کھولی ہیں اور اس سے بڑے فتنے ظہور میں آئے ہیں۔ اس خطرے کے پیشِ نظر اس قرارداد میں اس امر کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ تنظیم بجائے خود غایت و مقصد نہ بننے پائے بلکہ وہ اصل مقصد کے وسیلہ و ذریعہ کی حد تک محدود رہے۔ قرارداد کے اس پہلو پر بہت سی باتیں کہنی ہیں جو آگے کے مراحل میں بتدریج آپ کے سامنے آئیں گی۔ اس کے لئے لازماً اس کے تنظیمی ڈھانچہ میں ایسی حد بندیاں کرنی پڑیں گی جو اس کو بے راہ روی اور گمراہی سے محفوظ رکھیں۔

جہاں تک دوسری چیز یعنی دین ہی کو نصب العین بنانے کا تعلق ہے یہ کم از کم ہمارے اور آپ کے لئے محتاجِ دلیل نہیں۔ ہم خدا کے فضل سے مسلمان ہیں اور ہمارا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ انسانیت کی اصل ترقی و فلاح مذہب کے ساتھ وابستہ ہے۔ مذہب کے بغیر انسان بس ایک ترقی یافتہ حیوان ہے، جیسا کہ نظریۂ ارتقاء کے قائلین کہتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ایک حیوانِ ناطق جیسا کہ ارسطو نے انسان کی تعریف کی ہے۔ ہم ان دونوں میں سے کسی تعریف کو بھی انسان کی صحیح تعریف نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک انسان ایک رُوحِ یزدانی کا حامل ہے جیسا کہ قرآن نے: ''وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِيْ'' کے الفاظ سے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہی رُوحِ یزدانی ہے جو انسان کا شرفِ خصوصی ہے اور اسی کی بدولت انسان مسجودِ ملائک بنا ہے۔ یہی رُوحِ ملکوتی اگر انسان کی رُوحِ بہیمی پر غالب رہے تو انسان حقیقی انسان ورنہ وہ بس دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور ہے۔ اس رُوحِ ملکوتی کے رُوحِ بہیمی پر

غالب رہنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے ارادے کی باگ خدا کی شریعت کے ہاتھ میں ہو۔ اگر انسان کا ارادہ شریعت کے ہاتھ میں نہ ہو اور اس کی عقل خدا کی وحی سے رہنمائی حاصل نہ کرے تو جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ کپڑوں میں ملبوس ایک جانور ہے۔ یہ جانور گدھا ہوسکتا ہے، کتا بھی ہوسکتا ہے اور بندر اور خنزیر اور ایک خوفناک درندہ بھی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے شریعت سے بے قید انسان کو مذکورہ تمام جانوروں سے تشبیہ دی ہے۔ یہ تشبیہ محض برائے تشبیہ نہیں ہے بلکہ اظہارِ حقیقت ہے۔ اگر ہمارے پاس حقیقت کو دیکھنے والی آنکھیں ہوتیں تو اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ ہمارے متمدّن شہروں میں کپڑوں میں ملبوس کتنے چوپائے اور درندے انسانوں کے بھیس میں پھر رہے ہیں۔ اور اس صفحۂ ارضی پر قوموں کی قومیں ہیں جو متمدن کہلانے کے باوجود اپنی سرشست کے اعتبار سے درندوں سے زیادہ سفاک اور خونخوار بن گئی ہیں۔

ہمارے لئے شریعت کے انتخاب کا معاملہ بھی کوئی پیچیدہ معاملہ نہیں ہے۔ ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلام تمام دنیا کا مشترک دین ہے اور قرآن خدا کی آخری اور کامل کتاب، اور محمد رسول اللہ ﷺ خدا کے آخری رسول ہیں۔ اس وجہ سے یہ عین ہمارے عقیدے کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی زندگی اسلام کے احکام و ہدایت کے تحت گزاریں اور اسی کی دعوت دوسروں کو بھی دیں۔

یہ دوسروں کو دعوت دینا بھی عین ہماری فطرتِ بشری کا اقتضاء اور ہماری اپنی اصلاح اور ترقی کا لازمہ ہے۔ آپ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ انسان تنہا نہیں پایا جاتا، وہ ایک مدنی الطبع ہستی ہے۔ وہ کسی خاندان کے فرد، کسی قبیلہ کے رکن، کسی شہر کے شہری اور کسی ملک کے باشندے کی حیثیت سے پایا جاتا ہے اور اپنی فطری صلاحیتوں کے پروان چڑھنے کے لئے وہ ان سب باتوں کا محتاج ہے۔ اسی بنا پر انسان کو Social Animal کہا گیا ہے۔ جس طرح مچھلی پانی سے مستغنی نہیں ہوسکتی، اسی طرح انسان معاشرے سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ اگر انسان معاشرہ سے بے تعلق ہو کر اپنی صلاحیتوں کو صحیح طور پر اُجاگر کرسکتا تو اسلام رہبانیت کی ممانعت نہ کرتا۔ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے نبات میں سے Creepers سے مشابہ ہے۔ جس طرح انگور کی بیل صحیح طور پر اسی طرح پروان چڑھتی ہے جب اس کو کوئی سہارا ملے۔ بغیر اس سہارے کے وہ سکڑ کر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح انسان بھی صحیح طور پر اسی طرح پروان چڑھتا ہے جب اس کو معاشرے کا سہارا ملے، بغیر اس سہارے کے اس کی صلاحیتیں سکڑ کے رہ جاتی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ضروری ہے کہ یہ سہارا اس کے روحانی تقاضوں کے موافق ہو۔ جس طرح انگور کی بیل اس سہارے کے اثرات میں سے حصہ لیتی ہے جس پر وہ چڑھتی ہے، اسی طرح انسان اس معاشرے کے خیر وشر سے متاثر ہوتا ہے، جس میں زندگی گزارتا ہے۔ انگور کی بیل کو نیم پر چڑھا دیجئے تو اس کے پھل کڑوے کسیلے ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح انسان اگر بُرے معاشرے میں زندگی گزارے تو وہ بُرا بن سکتا ہے۔

انسان کی اس فطرت نے اس کے لئے ایک سخت مشکل پیدا کر دی ہے۔ ایک طرف تو اس کی فطرت کی رُو سے یہ واجب ہے کہ وہ اپنے لئے سازگار معاشرہ تلاش کرے اور اگر معاشرہ سازگار نہ ہو تو اپنے روحانی واخلاقی تقاضوں کے لئے پورے اخلاص کے ساتھ اس کو سازگا بنانے کی جدوجہد کرے۔ اگر کوئی شخص یہ جدوجہد نہ کرے تو اس کی اخلاقی ورُوحانی موت یقینی ہے۔ اگرچہ کوئی شخص کسی دوسرے کی اصلاح پر اختیار نہیں رکھتا، دوسرے کی اصلاح اللہ کی توفیق پر منحصر ہے، لیکن ہر شخص خود اپنی اصلاح کے لئے اس جدوجہد پر اپنے امکان اور اپنی صلاحیتوں کی حد تک مامور ہے۔

اس وجہ سے ہمارے پیغمبر ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے اُس پر واجب ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح کرے، اگر اس کی قدرت رکھتا ہو۔ اگر ہاتھ سے اس کی اصلاح کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کی اصلاح کی کوشش کرے، اگر اس کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو ادنیٰ درجہ کا ایمان یہ ہے کہ اس کو دل سے بُرا جانے (یعنی اس میں کسی نوعیت سے بھی تعاون نہ کرے!) اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

معاشرہ سے متعلق افراد کی ذمہ داریوں کو واضح کرنے کے لئے حضور ﷺ نے معاشرہ اور افراد کو ایک کشتی کے مسافر سے تشبیہ دی ہے۔ ایک کشتی میں کچھ لوگ عرشے پر سفر کرتے ہیں اور کچھ لوگ اس کے نیچے کے حصے میں۔ فرض کیجئے نیچے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں پانی لینے کے لئے اُوپر جانے کی مشقت اُٹھانی پڑتی ہے، کیوں نہ ہم اپنے حصے میں کشتی کے پیندے میں سوراخ کرلیں اور اوپر والے یہ خیال کریں کہ وہ اپنے حصے کی کشتی میں سوراخ کر رہے ہیں، ان کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں بلکہ سوراخ کرنے کے لئے ان کو آزاد چھوڑ دیں تو سوراخ ہو جانے کے بعد کشتی جو ڈوبے گی تو اُوپر والوں اور نیچے والوں سب کو لے کر ڈوبے گی۔ یہی حال معاشرے کا ہے، اس میں اچھے بھی ہوتے ہیں، بُرے بھی۔ اگر اچھے لوگ معاشرہ کے خیر وشر سے بے تعلق ہو جاتے ہیں تو بُروں

کی برائی سے جو آفت ظہور میں آتی ہے اس میں اچھے اور بُرے دونوں ہی حصہ پاتے ہیں۔

حدیثوں میں ایک بستی کا ماجرا بھی بیان ہوا ہے، جس سے یہ حقیقت مزید واضح ہوتی ہے۔ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کے متعلق فرشتہ کو حکم دیا کہ جا کر اُس کو اُلٹ دو۔ فرشتہ نے عرض کی کہ باری تعالیٰ اس میں تو تیرا ایک ایسا بندہ بھی ہے جو برابر تیری عبادت میں لگا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کے سمیت بستی کو اُلٹ دو۔ اس لئے کہ اُس کا چہرہ کبھی میرے دین کی بے حرمتی پر غیرت سے تمتمایا نہیں۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ہمارے لئے اپنے معاشرے کے خیر و شر سے بے تعلق رہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، نہ ہماری فطرت اس بے تعلقی کی روادار ہے۔ نہ ہمارا مذہب اِس کی اجازت دیتا ہے۔ دوسروں کی اصلاح سے قطع نظر ہم خود اپنی اصلاح و فلاح کے لئے اِس بات کے محتاج ہیں کہ اپنے معاشرے کو اپنے رُوحانی و اخلاقی تقاضوں کے لئے سازگار بنانے کی کوشش کریں۔ اِس کوشش سے دوسروں کی اصلاح ہو یا نہ ہو، لیکن ہماری اصلاح ہوگی۔ اِس سے ہماری اپنی صلاحیتیں پروان چڑھیں گی اور ہماری اپنی فطرت کے مضمرات بروئے کار آئیں گے۔ جو شخص یہ کام کرتا ہے وہ خود اپنا فرض انجام دیتا ہے اور دوسروں سے زیادہ وہ خود اپنے اُوپر احسان کرتا ہے۔ اس وجہ سے اگر کوئی شخص یہ فرض انجام دیتا ہے تو اُس کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو معاشرہ کا محسن سمجھنے لگے بلکہ وہ یہ سمجھے کہ اُس نے اپنا ہی فرض انجام دیا ہے۔ جس طرح ہم نماز پڑھتے ہیں تو کسی پر احسان نہیں کرتے بلکہ خود اپنے اُوپر احسان کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم معاشرہ کی کسی بُرائی کی اصلاح کرتے ہیں تو کسی پر احسان نہیں کرتے بلکہ صرف اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ دین میں دوسروں کے نیک و بد سے متعلق ہم پر جو ذمہ داری عائد کی گئی ہے وہ ہمارے ذاتی فرض ہی کی حیثیت سے عائد کی گئی ہے۔

زیرِ بحث قرارداد میں یہ تصور اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے اور اس کے دو بڑے اہم فائدے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ کوئی شخص دعوت و اصلاح کا کوئی کام کرتے ہوئے یہ نہیں سمجھے گا کہ وہ کسی دوسرے کا کام کر رہا ہے، بلکہ وہ یہی سمجھے گا کہ اپنا ہی کام کر رہا ہے۔ دوسرا یہ کہ کوئی شخص دوسروں کی اصلاح میں اتنا مستغرق نہیں ہوگا کہ وہ خود اپنی اصلاح سے غافل اور بے پروا ہو جائے۔ یاد رکھئے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دوسروں کی اصلاح کی کوشش اصلاً خود اپنی ہی اصلاح کی کوشش کا ایک حصہ ہے جو شخص دوسرے کی اصلاح میں رات دن سرگرم رہتا ہے لیکن اسے خود اپنی اصلاح کی فکر نہیں

ہے، وہ محض نمائشی مصلح ہے۔ جو خود بھٹک رہا ہو وہ دوسروں کی رہبری نہیں کرسکتا۔ انگور کی وہ بیل سوکھ جاتی ہے جس کی اپنی جڑ اُکھڑی ہوئی ہو، اگر چہ اس کو کتنے ہی خوبصورت سہارے پر چڑھا دیجئے۔ اس زمانے میں چونکہ زیادہ تر مدعیانِ اصلاح ایسے ہی ہیں جنہیں خود اپنے دین و ایمان کا کچھ ہوش نہیں لیکن دوسروں میں دین کی سوغات بانٹنے کے لئے خشکی وتری کا سفر کرتے پھرتے ہیں، اس وجہ سے ضروری ہے کہ اصل نقطہ پر لوگوں کی توجہ مرکوز کرائی جائے۔ چنانچہ قرارداد میں اِس حقیقت کو یوں واضح کیا گیا ہے کہ: ''ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اُسی کی اخلاقی ورُحانی تکمیل اور فلاح ونجات دین کا اصل موضوع ہے اور پیشِ نظر اجتماعیت اصلاً اسی لئے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے۔''

اس تصور کا قدرتی مطالبہ یہ ہے کہ اس تنظیم کا ڈھانچہ ایسا بنایا جائے کہ وہ اپنے اعضاء وارکان کی اصلاح وتربیت کا ایک جامع ادارہ بن جائے۔ اس عزم کا اظہار قرارداد میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

> ''لہٰذا پیشِ نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہئے کہ اُس میں فرد کی دینی و اخلاقی تربیت کا کماحقہٗ لحاظ رکھا جائے اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے کہ اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جلا حاصل ہو' ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے' ان کے عقائد کی تصحیح وتطہیر ہو' عبادت اور اتباعِ سنت سے اُن کا شغف اور ذوق وشوق بڑھتا چلا جائے' عملی زندگی میں حرام وحلال کے بارے میں اُن کی حِس تیز اور اُن کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی برتقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت واشاعت اور اس کی نُصرت واقامت کے لئے اُن کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے۔''

اِن تمام مقاصد کے حُصول کے لئے تنظیم کیا وسائل وذرائع اختیار کرے گی؟ اس کا جواب دینا بروقت میرے لئے مشکل ہے۔ اِس کا جواب بہت کچھ منحصر ہے اس بات پر کہ اس تنظیم کو کن صلاحیتوں کے افراد حاصل ہوتے ہیں اور وہ اپنی مجموعی کوشش سے کیا اسباب ووسائل فراہم کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ افراد اور وسائل کی وسعت کے ساتھ ساتھ امکانات کا جائزہ لینا اور ان کے مطابق قدم اٹھانا تنظیم کے اربابِ حل وعقد کا کام ہے لیکن اتنی بات بدیہی ہے کہ اس مقصد کے بروئے کار لانے میں اس امر کی پوری کوشش کی جائے گی کہ جو قدم بھی اُٹھے اسوۂ انبیاء کی روشنی میں اُٹھے اور جماعت کی تربیت اس نہج پر ہو جس کی طرف کتاب وسنت میں رہنمائی کی گئی ہے۔

ہم اپنی تربیت کے لئے سب سے پہلے توصحیح علم کے محتاج ہیں۔صحیح علم سے مراد دین کا علم ہے۔ اس زمانے میں دین کا علم عنقا ہو رہا ہے،اس کے حصول کے لئے وسائل وذرائع بھی روز بروز کم سے کم تر ہوتے جارہے ہیں اورلوگوں کے اندراس کی رغبت بھی بالکل ختم ہوتی جارہی ہے۔اگر دین کا علم ہی مٹ گیا تو پھر دین کے باقی رہنے کا کیا امکان ہے؟ یہ امر بھی بدیہی ہے کہ اِس زمانے میں لوگ ہر چیز کی دلیل وحجت کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ مجرد یہ بات لوگوں کو اپیل نہیں کرتی کہ فلاں بات دین کی بات ہے۔ دین پر آج جو اعتراضات ہو رہے ہیں ،کل کے اعتراضات سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ اعتراضات جدید مغربی فکر وفلسفہ کی پیداوار ہیں اوران کو زورِقوت کے ساتھ پھیلانے والے خود ہمارے اندر پیدا ہو گئے ہیں۔ جب تک ان اعتراضات وشبہات کا مؤثر ازالہ نہ ہواس وقت تک ممکن نہیں ہے کہ آپ دین کی کوئی مفید خدمت انجام دے سکیں۔افسوس ہے کہ اس خدمت کی صلاحیت رکھنے والے آج ہمارے اندر اگر مفقود نہیں تو اتنے کم ہیں کہ وہ دین کے محاذ کو کسی طرح بھی سنبھال نہیں سکتے۔اس وجہ سے وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایسے حاملانِ دین پیدا کرنے کی مؤثر جدجہد کی جائے جو جدید علوم وافکار سے بھی کماحقہٗ آگاہ ہوں اور کتاب وسنت کے دلائل و براہین پر بھی وہ براہِ راست نظر رکھتے ہوں۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہمارا دین دنیا میں بے دلیل نہیں آیا ہے۔وہ بہتر سے بہتر فطری وعقلی دلائل سے مسلح ہو کر آیا ہے، جو ہر دور کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی ہیں، بشرطیکہ ان کو اُجاگر کرنے والے اور اُن کو دنیا کے سامنے حالات کے مطابق پیش کرنے والے موجود ہوں۔ دوستو! یہ کام کوئی آسان کام نہیں ہے۔اس قسم کے افراد صرف اُردو میں لکھی ہوئی چند کتابیں پڑھ لینے سے نہیں پیدا ہوں گے، بلکہ اس کے لئے کتاب وسنت اور علومِ اسلامیہ سے براہِ راست گہری واقفیت ضروری ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی صلاحیت ہم میں سے ہر شخص اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتا۔لیکن معتدبہ تعداد ہمارے اندر جب تک ایسے لوگوں کی نہ ہو گی ہم ان ذمہ داریوں سے کماحقہ عہدہ برآ نہ ہو سکیں گے جو دین سے متعلق اس زمانے میں ہم پر عائد ہوتی ہیں۔

جہاں تک عامۃ المسلمین کو دین کی دعوت دینے کا تعلق ہے اِس کے بارے میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اِس زمانے میں مجرد تذکیر کافی نہیں ہے، بلکہ وسیع پیمانے پر تعلیم وتفہیم کی ضرورت ہے۔ یہ صورت نہیں ہے کہ لوگ دین کی باتیں بھولے ہوئے ہیں، اگر انہیں یاد دِلا دی جائیں تو وہ ان کو اختیار کر لیں گے، بلکہ اشاعتِ باطل کے وسیع ذرائع نے اِس زمانے میں عام اذہان کے اندر بھی

دین اور دینی احکام سے متعلق بے شمار غلط فہمیاں بھی پیدا کر دی ہیں جن کے دُور کرنے کا سامان کرنا ان لوگوں پر واجب ہے جو آج ملک کے عوام کی اس پہلو سے کوئی خدمت کرنا چاہتے ہوں۔ آج اخبارات گھر گھر پہنچ رہے ہیں۔ ریڈیو کھیتوں اور کھلیانوں تک موجود ہے۔ اس وجہ سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ زندگی کے جدید شیطانی نظریات سے ہمارے عوام بے خبر ہیں یا وہ ان سے بالکل بے تعلق ہیں۔ ان سے تاثر کے معاملے میں شہری اور دیہاتی آبادی میں کچھ فرق ہونا تو ایک قدرتی امر ہے لیکن دیہاتی آبادی کو ان فتنوں سے بالکل الگ تھلگ خیال کرنا صحیح نہیں ہے۔ اِس وجہ سے ان کے اندر کام کرنے کے وہ طریقے اختیار کرنے ہوں گے جو موجودہ حالات میں اُن کے لئے مؤثر اور مفید ہوں۔

جہاں تک ملک کے اربابِ اقتدار کا تعلق ہے اُن کے بارے میں بھی ہمارے ہاں سخت افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو اُن کی اصلاح کے معاملے میں بالکل بے تعلق ہیں، انہیں اُن کے خیر و شر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو ان کے شر کو بھی خیر ہی کہنا پسند کرتے ہیں۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو اُن کے خیر کو بھی شر قرار دیتے ہیں اور ہر حالت میں اُن کی مخالفت کرنا اُن کے ہاں جزوِ ایمان ہے۔

آپ کی یہ قرارداد اِن تینوں طریقوں کو غلط قرار دیتی ہے اور دین کی روشنی میں ایک چوتھا طریقہ آپ کے سامنے پیش کرتی ہے۔ جہاں تک پہلے طریقے یعنی لاتعلقی کے رویہ کا تعلق ہے اس کے بارے میں تفصیل کے ساتھ میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ کوئی پرایا جھگڑا نہیں ہے جس سے علیحدہ رہنے میں آدمی کے لئے سعادت ہو۔ بلکہ ہم میں سے ہر شخص کے اپنے دین و ایمان کا معاملہ ہے۔ میں پیغمبر ﷺ کی واضح تعلیمات کی روشنی میں بتا چکا ہوں کہ جو شخص معاشرہ کے خیر و شر سے بے پرواہ ہے وہ خود اپنے دین و ایمان سے بے پرواہ ہے اور اُس کی یہ بے پروائی اُس کی ساری دینداری غارت کر کے رکھ دے گی۔ ہم جس کشتی پر سوار ہیں اپنے امکان کی حد تک کسی کو اس کے پیندے میں سوارخ کرتے ایک تماشائی کی طرح نہیں دیکھ سکتے۔

دوسرے گروہ کا رویہ بھی بالکل غلط ہے۔ جو چیز غلط ہے اگر وہ اربابِ اقتدار کی طرف سے ظہور میں آئے تو اُس کی غلطی اور بھی سنگین ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس کے اثرات بہت دوررس ہوں گے۔ اگر کوئی شخص اس غلطی کو ثواب قرار دے تو یہ اُس پر خاموش رہنے سے بھی بڑا جرم ہے۔ یہ رویہ اگر خوف یا طمع کی بنا پر اختیار کیا جائے تو اسلام میں صریح نفاق ہے، جو ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا

اور اگر یہ اس بنیاد پر اختیار کیا جائے کہ اس سے حکومت کو ضعف پہنچتا ہے تو یہ بھی غلط ہے اول تو حکومت کو ضعف پہنچ سکتا ہے تو غلط چیز سے نہ کہ صحیح چیز سے، ثانیاً حکومت بجائے خود مقصد و غایت نہیں ہے، بلکہ اسلام میں وہ اللہ کے قانونِ عدل وقسط کا ذریعہ ہے۔ اس وجہ سے حکومت کی مصلحت کے لئے بھی کسی شر کو خیر قرار دینا اپنے دین وایمان پر کلہاڑی مارنا ہے۔

تیسرے گروہ کا رویہ بھی بالکل غلط ہے۔ اربابِ اختیار کی ہر بات کو ہدفِ تنقید بنا لینا یہاں تک کہ اُن کے خیر کو بھی شر قرار دینا اور اُس کی مخالفت میں اِس حد تک بڑھ جانا کہ دوسروں کی بُرائیاں بھی اُن کے کھاتے میں ڈال دینا نہ عقل ومنطق کی رُو سے جائز ہے، نہ اسلام کی رُو سے۔ یہ اقتدار کی ہوس میں اندھے ہو جانے کی علامت ہے، اور اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی صحیح بات بھی اربابِ اقتدار کو اپیل نہیں کرتی۔ جن کی ذہنیت یہ بن جاتی ہے وہ خیر خواہی کے جذبے سے بالکل خالی ہو جاتے ہیں۔ درانحالیکہ یہ جذبہ دعوتِ دین کی اصل روح ہے۔ اگر انسان خیر خواہی کے جذبے سے خالی ہو تو اُس کی ہر بات نفرت اور عناد کی تخم ریزی کرتی ہے اور اگر وہ اس کے ساتھ دین کا نام لیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دین کو بھی لوگوں کی نگاہوں میں ایک نفرت انگیز چیز بنانا چاہتا ہے۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں دین کو جو نقصان پہنچا ہے، وہ دین کے کھلے ہوئے دشمنوں کے ہاتھوں بھی نہیں پہنچا ہے۔ اس لئے کہ یہ لوگ اپنی ایک نفسیاتی جنگ میں دین کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اس طرح بلاوجہ دین کو ان تمام لوگوں کے سامنے ایک حریف بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں، جن سے ان کی لڑائی ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اس طرح کے لوگ انسانیت اور خلق کی محبت سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دل سے اس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ ملک میں زلزلے آئیں، قحط پڑیں، سیلاب آئیں، وبائیں پھیلیں تا کہ یہ ان سب چیزوں کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہرا کر اپنے اقتدار کے لئے راہ ہموار کریں۔ ایسے بے درد اور سنگ دل لوگوں سے یہ توقع رکھنا کہ یہ دین کی کوئی خدمت انجام دے سکیں گے، محض خام خیالی ہے۔

آپ نے جو قرارداد پاس کی ہے اُس میں آپ نے ان تمام طریقوں سے الگ اپنے لئے ''الدین النصیحة'' کی راہ اختیار کی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ لوگوں کے خیر وشر سے بے نیاز نہیں ہو سکتے، اس لئے کہ یہ خیر خواہی کے خلاف ہے۔ اسی طرح آپ کسی کے شر کو خیر بھی نہیں کہہ سکتے، اس لئے کہ یہ بھی حق اور خیر خواہی کے خلاف ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس آپ کسی کی مخالفت کے جوش

میں اس کی نیکی کو بدی نہیں ٹھہرا سکتے، اس لئے یہ بھی سچائی اور خیر خواہی کے خلاف ہے۔سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ دین کو ہوسِ اقتدار کی جنگ میں ایک ہتھیار کے طور پر کبھی استعمال نہیں کریں گے بلکہ جس کے سامنے بھی اس کو پیش کریں گے، اللہ کے دین کی حیثیت سے پیش کریں گے، کہ اسی میں اُس کی بھی بھلائی اور اسی میں آپ کی بھی بھلائی ہے۔ یہی حضرات انبیاء علیہم السلام کا طریق کار رہے اور یہی آپ کو اختیار کرنا ہے۔

رفیقو! میں سمجھتا ہوں کہ ایک چیز کی وضاحت کرنے میں آپ کا بہت سا وقت میں نے لیا۔اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور اپنے لیے اور آپ کے لئے دعا کرتا ہوں کہ ہم نے جو کچھ طے کیا ہے، اس پر عمل کرنے کی توفیق پائیں۔

اَقُولُ قَوْلِی ھٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ!

تقریر--- مولانا عبدالغفار حسنؒ

حمد وثناء کے بعد------- رفقائے محترم!

صبح کے درسِ قرآن، پھر قرار داد اور اس کی توضیح اور سب سے بڑھ کر مولانا اصلاحی کی تقریر سے معاملے کے اکثر پہلو اچھی طرح واضح ہو چکے ہیں اور اب میری تقریر کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی، تاہم جو خدمت میرے سپرد ہے میں اس کی انجام دہی میں بعض باتیں آپ حضرات کے سامنے رکھتا ہوں۔ تکرار سے بھی کم از کم تذکیر کا فائدہ تو حاصل ہو ہی جائے گا۔

ایک نئی دینی جماعت کے قیام کے فیصلے پر سب سے پہلے جو سوال ذہنوں میں پیدا ہونا لازمی ہے وہ یہ ہے کہ آخر ایک نئی جماعت کی ضرورت کیا ہے؟ اوّلاً کیا انفرادی طور پر کام کرنا کافی نہیں ہے؟ ثانیاً اگر اجتماعیت لازمی ہے تو بھی ڈیڑھ اینٹ کی ایک نئی مسجد الگ بنانے کی کیا حاجت ہے؟ بہت سی دینی تنظیمیں اور جماعتیں موجود ہیں، کیوں نہ ان میں سے کسی کے ساتھ شامل ہو کر کام کیا جائے؟

جہاں تک اجتماعیت کی ضرورت واہمیت کا تعلق ہے اس پر مولانا اصلاحی بہت مفصل روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہ بدیہی بات ہے کہ بہت سے لوگوں کے علیحدہ علیحدہ کام کرنے اور ان سب کے مل کر اجتماعی طور پر کام کرنے میں نتائج کے اعتبار سے زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اجتماعیت میں ہر فرد ایک دوسرے کا سہارا اور ایک دوسرے کی کمی پورا کرنے والا ہوتا ہے جس سے کام میں عظیم برکت ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ نے مختلف لوگوں کو مختلف صلاحیتیں دی ہیں۔ کسی کو بولنے کی صلاحیت دی ہی، کسی کو لکھنے کی، کسی کو بھاگ دوڑ کی قوت دی ہے، کسی کو غور وفکر اور تدبر وتفکر کی اسی طرح کسی کو علومِ دینی سے سرفراز فرمایا ہے اور کسی کو معلوماتِ دنیوی سے بہرہ ور فرمایا ہے۔ کسی کو فہمِ قرآن کے بحرِ عمیق میں غوطے لگانے کی صلاحیت دی ہے تو کسی کو علومِ حدیث کی وسعتوں میں پیرا کی کی صلاحیت سے نوازا ہے۔

کسی کو قدیم کی واقفیت عطا فرمائی ہے تو کسی کو جدید سے رُوشناس کیا ہے مختلف صلاحیتوں اور قوتوں سے مسلح افراد کے مجتمع اور متحد ہو کر کام کرنے سے ہی اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے کہ کوئی جامع اور ہمہ گیر نوعیت کا کام سرانجام پا سکے پھر دین ومذہب کے مخالف اور لادینیت کے علمبرداروں کو

دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح منظّم ہو کر کام کر رہے ہیں اور ان کے مختلف گروہ اور جتھے مختلف اطراف سے پوری تنظیم اور اجتماعیت کے ساتھ دینی قوتوں پر یلغار کر رہے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اجتماعیت کا مقابلہ انفرادیت سے نہیں کیا جاسکتا اس کے لئے اجتماعیت ہی کی ضرورت ہے۔ بنابریں دینی قوتوں کا منظّم و مجتمع ہونا ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

بلاشبہ جماعت سازی سے کچھ اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں مثلاً ایک یہ کہ اس سے جماعتی وگروہی عصبیت، پھر تعصب اور بالآخر تحزّب وتفرق کی لعنت وجود میں آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جماعتیں بالعموم شخصیتوں کے گرد گھومتی ہیں اور ان سے شخصیت پرستی کی مہلک بیماری پیدا ہوتی ہے۔ تیسرے یہ کہ خود جماعتیں عموماً داخلی انتشار کا شکار ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات اس سے انتہائی کریہہ صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔

اس سلسلے میں اوّلین بات تو یہ ہے کہ ہر چیز کے مجموعی فائدے یا نقصان کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔ بہت سے اچھے کاموں میں کوئی پہلو بُرائی کا ہوسکتا ہے اور بہت سی برائیوں میں کوئی پہلو اچھائی کا ہونا ممکن ہے۔ قرآن مجید نے خود شراب اور جوئے کے بارے میں بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ ان میں منفعت بھی ممکن ہے لیکن وَاِثۡمُهُمَاۤ اَكۡبَرُ مِنۡ نَّفۡعِهِمَا ''ان کا شران کی منفعت سے زیادہ ہے'' اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز میں خیر کا پہلو غالب ہو اس کو اختیار کرنا چاہئے اور اس کے شر سے بچاؤ کی ہر ممکن تدبیر کرنی چاہئے۔

'شخصیت پرستی' کی لعنت کے پیدا ہونے کے امکانات وہاں زیادہ ہوتے ہیں جہاں کسی ایک داعی کی دعوت پر لوگ جمع ہوں اور اسی کے خیالات ونظریات وتصورات اور اسی کے فہم وفکر کو اس اجتماعیت میں مرکز ومحور کی حیثیت حاصل ہو جائے۔ اس کے برعکس اگر ابتداء سے بہت سے لوگ باہمی مشاورت سے اپنے مقصد اور اس کے حصول کے طریق کو طے کریں اور مسلسل ''اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ'' کی قرآنی ہدایت پر عمل پیرا رہیں تو ان شاءاللہ اس لعنت کا سدّ باب ہو جائے گا۔

''تحزّب وتفرق'' سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دین کی خدمت کے لئے جمع ہونے والے لوگ ہمیشہ اِنَّنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ ہی کو اپنا واقعی شعار بنائیں اور اپنے آپ کو اُمتِ مسلمہ ہی کا ایک حصہ تصور کریں۔ چنانچہ نہ ان میں کوئی غرور و گھمنڈ پیدا ہو نہ اپنے ''چیزے دگر'' ہونے کا احساس پیدا ہونے پائے اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے کسی اعتبار سے بہتر و برتر تصور کریں۔

یہاں یہ حقیقت بھی نگاہ میں رہنی چاہئے کہ تحزّب وتفرق محض جماعت سازی ہی سے پیدا نہیں

ہوتے بلکہ کوئی ادارہ محض درس گاہ یا دارالعلوم بھی ان کا سبب بن سکتا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ بنا ہے، اور اس کی مثالیں خود ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جو درسگاہ نئی قائم ہوتی ہے وہ بالعموم کسی ایک خصوصیت کی حامل ہوتی ہے۔ نتیجتاً اس سے فارغ ہونے والے نوجوانوں کا مزاج ایک خاص رنگ میں ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے اور مرورِ ایام کے ساتھ اس کے فارغین ومتوسلین میں گروہی و حزبی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب نہ تو یہ صحیح ہے کہ ان خدشات کی بنا پر درس گاہیں اور دارالعلوم قائم کرنے بند کر دیئے جائیں اور نہ یہ صحیح ہے کہ دینی مقاصد کے حصول کے لئے ادارے یا جماعتیں قائم کرنا ممنوع قرار دے دیا جائے۔ اس کے برعکس دارالعلوموں اور اداروں کے قیام کے ساتھ حتی الامکان ایسی احتیاطی تدابیر اختیار کی جانی چاہیں کہ ان کے ذریعے اُمت میں تفرقہ وانتشار پیدا نہ ہو۔ اس سلسلے میں جس قدر میں نے غور کیا ہے میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک تو جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے لوگوں میں کچھ ''چیزے دگر'' ہونے کے احساس کو پیدا ہونے سے روکا جائے اور ''اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ'' کی قرآنی ہدایات کو ہمیشہ مستحضر رکھا جائے اور دوسرے یہ احتیاط کی جائے کہ عملاً جمعہ و جماعت اور ربط وضبط اور رشتوں ناطوں کے معاملات کو صرف ہم خیال لوگوں کے حلقے میں محدود کرنے کا رجحان نہ پیدا ہو--- ان تدابیر پر اگر عمل کیا جائے تو میری رائے میں کوئی دینی جماعت فرقے میں تبدیل نہیں ہوگی--- واللہ اعلم!

تیسرا اندیشہ جماعتوں کے 'داخلی انتشار' کا ہے تو اگرچہ ماضی کے کچھ تلخ تجربات کی روشنی میں واقعتاً اس اندیشے سے طبیعت میں بہت زیادہ توحّش پیدا ہوتا ہے تاہم یہ حقیقت بادنیٰ تامل سامنے آجاتی ہے کہ محض اس اندیشے کی بنا پر اجتماعی جدوجہد سے باز رہنا ہرگز ایک معقول بات نہیں ہے۔ اختلاف اس عالمِ واقعہ کی ایک عظیم (اگرچہ تلخ) حقیقت ہے'--- لَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّکَ، تحریکیں اُٹھتی ہیں اور بہت کچھ مفید کام کرتی ہیں پھر ان میں داخلی انتشار ونما ہو جاتا ہے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ آپ اپنے خنجر سے خودکشی کر لیتی ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ ان کا کام نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے۔ ان کے اثرات ان کے بہت بعد تک بھی باقی رہتے ہیں--- لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ خلوص اور للّٰہیت کے ساتھ کام شروع کیا جائے۔ اختلافات کے حل کے لئے صحت مند راستے حتی الامکان کھلے رکھے جائیں۔ اس کے بعد بھی کبھی ناگوار صورتِ حال پیدا ہو تو اس کا سامنا کیا جائے۔

اب دوسرے سوال کو لیجئے--- یعنی یہ کہ آخر ایک نئی جماعت کا قیام ہی کیوں ضروری ہے؟ کیوں نہ موجود الوقت دینی جماعتوں میں سے کسی کے ساتھ مل کر کام کیا جائے؟

اس سوال کا سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ جس طرح ملک میں بہت سی درس گاہوں اور دارالعلوموں کے وجود سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی نئی درس گاہ قائم نہ کی جائے۔اسی طرح بہت سی دینی جماعتوں کا وجود کسی نئی جماعت کے قیام کے منافی نہیں جیسے کسی نئے دارالعلوم کے مؤسسین کے بارے میں لازماً یہ نہیں سمجھا جاتا کہ ان کی رائے بقیہ درس گاہوں کے بارے میں بہت بُری ہے،اس طرح ایک نئی دینی جماعت کے مؤسسین کے بارے میں یہ سمجھنا کہ یہ لازماً دوسری دینی جماعتوں کے بارے میں بہت بُری یا حقارت آمیز رائے رکھتے ہیں،درست نہیں ہے۔

مزید وضاحت کے لئے عرض ہے کہ اس وقت جو جماعتیں ملک میں بالفعل موجود ہیں ہمارے نقطۂ نظر سے ان کی دو قسمیں ہیں۔ایک تو وہ ہیں جن سے ہمیں کلّی اختلاف ہے یعنی ان کے طریقِ کار اور ان کے مزاج اور ذہن کو ہم درست نہیں سمجھتے۔ایسی جماعتوں میں مدغم ہونے یا ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا--- دوسری جماعتیں ایسی ہیں جو ہماری رائے میں بعض کام بہت اچھے سرانجام دے رہی ہیں لیکن ان کے کاموں میں کچھ خلا ہے اور دین کے بعض تقاضے اس کے ذریعے پورے نہیں ہو رہے ہیں۔--- ایسی جماعتوں کے ساتھ دو طرح کا معاملہ نظری اعتبار سے ممکن ہے۔ایک یہ کہ ان کے ساتھ شامل ہو کر کام کیا جائے اور ان کے اندر رہ کر زور ڈالا جائے کہ دین کے تقاضوں کو بھی پورا کیا جائے۔یہ طریق بظاہر بڑا معقول اور مستحسن نظر آتا ہے لیکن عملاً اپنے اندر بہت سی پیچیدگیاں رکھتا ہے۔ہر جماعت کے مؤسسین کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے اور ان کے ذہن کی ایک خاص ساخت ہوتی ہے جسے بآسانی بدلا نہیں جاسکتا،اور اگر بدلنے کی کوشش کی جائے تو اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوسکتا کہ خواہ مخواہ کی کھینچ تان اور بدمزگی پیدا ہو اور ہاتھ کچھ نہ آئے۔ظاہر بات ہے کہ اگر ان کے نزدیک کوئی دوسرا پہلو اہم تر ہے تو وہ آپ کی وجہ سے کسی اور پہلو پر کیوں زیادہ زور دیں۔لہذا عملاً دوسرا طریق ہی ممکن العمل بھی ہے اور بہتر بھی یعنی یہ کہ دوسرے لوگ ایک علیحدہ اجتماعیت قائم کریں اور اپنے ذہن و فکر اور اپنی صوابدید کے مطابق کام کریں--- اب اگر خلوص اور للّٰہیت موجود ہے تو یہ دونوں کام ایک دوسرے کے معاون اور ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرنے والے بن جائیں گے اور اگر اخلاص کی دولت ہی سے تہی دامنی ہو تو پھر بھی زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا جیسا تصادم اندر تھا ویسا ہی باہر بھی ہوگا۔اس صورت میں بھی علیحدہ جماعت سازی پہلی صورت کے مقابلے

میں زیادہ نقصان دہ تو کسی طرح نہیں ہوسکتی---!

اب میں آپ کے سامنے اس نئی دینی تنظیم کے کچھ خصائص پیش کروں گا، جس کے قیام کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ان کا تذکرہ قرارداد میں بھی ہے اور ان کی توضیحات میں بھی۔ پھر مولانا اصلاحی بھی اپنی تقریر میں ان میں سے بعض کی وضاحت کر چکے ہیں۔ میں ان کو سلسلہ وار پیش کرتا ہوں تاکہ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کم از کم تذکیر ہو جائے:

پہلی خصوصیت ہماری پیشِ نظر تنظیم کی یہ ہے کہ اس میں نصب العین کے مقام پر صرف نجات اور رضائے الٰہی کے حصول کو رکھا گیا ہے اور اس میں ایسی کوئی تفریق نہیں رکھی گئی کہ دنیا میں ہمارا مقصود یہ ہے اور آخرت میں یہ!--- دنیا دارالعمل ہے اور آخرت دارِ جزا۔ دنیا میں انسان دین و شریعت کے جملہ تقاضوں کو اُخروی جزا ہی کے لئے پورا کرتا ہے۔ لہٰذا ہر آن اور ہر لمحہ ہمارا نصب العین ایک ہی ہے اور وہ ہے آخرت کی کامیابی!! اور اس کے لئے دین کے جملہ انفرادی و اجتماعی تقاضوں کو اسی ترتیب و تدریج کے ساتھ پورا کرنا ضروری ہے جو خود نظام دین میں متعین ہے! ان میں سے کسی ایک تقاضے کو اہمیت دے کر 'نصب العین' کے مقام پر لے آنا ہرگز صحیح نہیں!

دوسری خصوصیت ہماری اس تنظیم کی ہوگی کہ ہماری دعوت صرف اللہ اور اس کے دین کی طرف ہوگی، نہ کسی خاص شخصیت جماعت کی طرف ہوگی، نہ کسی خاص مسلک یا فقہی مذہب کی طرف!

اسی بنا پر اس اجتماعیت کی تیسری خصوصیت یہ ہوگی کہ یہ نہ کسی فرد یا گروہ کی حلیف ہوگی نہ حریف۔ اس میں حُبّ اور بغض اور محبت و نفرت کا معیار صرف اللہ اور اس کا دین ہوں گے اور یہ ''كُوْنُوا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ'' کے قرآنی حکم پر عمل پیرا ہونے کی مقدور بھر سعی کرے گی اور حتی الامکان کوشش کرے گی کہ ذاتی یا گروہی عصبیت یا تعصب کی بنا پر عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ ﴿لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ --- چنانچہ ہمارے لئے کسی حزبِ اختلاف کا تصور خارج از بحث ہوگا--- مغربی جمہوریت کے پیدا کردہ ان تصورات سے عدل و انصاف کے تقاضے پامال ہو جاتے ہیں اور انسان اپنی جماعت کے بُرے سے بُرے کام کی حمایت اور حزبِ مخالف کے اچھے سے اچھے کام کی مخالفت پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پیشِ نظر اسلامی تنظیم انشاء اللہ ﴿تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ کے قرآنی احکامات پر عمل پیرا ہوگی۔

چوتھی خصوصیت ہماری اس اسلامی تنظیم کی یہ ہوگی کہ یہ طبقاتی تصور اوراس سے پیدا شدہ تنازع للبقا کے بجائے وحدتِ الٰہ وآدم اورتوافق یا تعاون للبقا کے تصور کا اجاگر کرنے کی کوشش کرے گی۔

پانچویں خصوصیت دینی مسائل اور ان سے متعلق اختلاف مذاہب و مسالک کے متعلق ہے۔ ہمارے نزدیک جملہ دینی مسائل تین طرح کے ہیں۔ایک وہ جو اساسی اور بنیادی بھی ہیں اور متفق علیہ بھی، دوسرے وہ جو متفق علیہ تو ہیں لیکن اساسی نہیں ہیں۔اور تیسرے وہ مسائل ہیں جن میں سلف اور خیر القرون ہی سے اختلاف چلا آ رہا ہے۔ ہماری یہ تنظیم ان شاء اللہ اپنی اصل توجہ کا مرکز ومحور پہلی قسم کے مسائل ہی کو بنائے گی۔اس لئے بھی کہ فی الواقع وہی اساسی اور بنیادی ہیں اوراس لئے بھی کہ موجودہ دَور کے فتنوں کی زِد دراصل ان ہی پر پڑ رہی ہے، یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسالت، اور ایمان بالآخرت ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں لہٰذا اس وقت اصل ضرورت ان کے استحکام کی ہے، اور ان کے معاملے میں کسی قسم کی رواداری اور مداہنت کا کوئی امکان نہیں ہے۔دعوت میں نرمی اور حکمتِ تبلیغ بالکل دوسری چیز ہے اور مداہنت فی الدین بالکل دوسری، ان معاملات میں مصلحت کی بنا پر رواداری ممکن نہیں ہے--- البتہ تیسری قسم کے مسائل میں تشدد اور غلو کسی طرح جائز نہیں ہے۔ان میں بھی مذاکرہ اور باہمی تبادلہ خیال ہوسکتا ہے لیکن کسی ایک رائے یا مسلک کو بالجبر دوسروں پر ٹھونسنا کسی صورت میں درست نہیں۔ہم اپنی اجتماعیت میں ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں گے جس میں ان اختلافی مسائل کے بارے میں انتہائی رواداری اور فراخ دلی پائی جائے۔

چھٹی خصوصیت جو قرارداد میں صراحت کے ساتھ مذکور ہو چکی ہے یہ ہے کہ اس میں ’’ اَلْاَھَمُّ فَالْاَھَمُّ ‘‘ کا اصول پیشِ نظر رکھا جائے گا اور تبلیغ ودعوت میں تدریج ملحوظ رہے گی--- یہ تمام معاملات احادیثِ نبوی ﷺ میں بصراحت مذکور ہیں۔

ساتویں خصوصیت اس اجتماعیت کی جیسا کہ قرارداد سے واضح ہے یہ ہوگی کہ اس کا دائرہ کار صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ غیر مسلم بھی اس کے مخاطب ہوں گے۔مسلمانوں کی خامیوں کی اصلاح بھی ہمارے فرائضِ دینی میں شامل ہے اور غیر مسلموں تک اسلام کی تبلیغ اوران پر رسالتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی جانب سے اتمامِ حجت بھی ہماری دینی ذمہ داریوں میں سے ہے ہماری یہ اسلامی تنظیم ان شاء اللہ اس ضمن میں بھی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کوشاں ہوگی۔

پیشِ نظر تنظیم کی متذکرہ بالا خصوصیات تو وہ ہیں جو ہمارے مابین متفق علیہ ہیں اور ہماری قرارداد

میں صراحۃً یا دلالۃً مذکور ہیں۔ اب میں بعض ایسی خصوصیات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو میری ذاتی رائے میں ہمیں اختیار کرنی چاہئیں۔ ان میں اختلاف کی گنجائش تو ہے لیکن مجھے امید ہے کہ ان میں سے اکثر کو آپ حضرات اپنے دل ہی کی آواز محسوس کریں گے۔

ان میں سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ہمیں اذکار و اوراد کے معاملے میں یہ اُصول متعین کر لینا چاہئے کہ ہم اوراد و وظائف اور اذکار و ادعیہ میں سے صرف ان کو اختیار کریں جو اللہ کی کتاب یا رسول اللہ ﷺ کی سنت سے ماخوذ ہوں۔ ان کا اولین فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہم خدا اور رسول ﷺ کے ساتھ جڑے رہیں گے اور اس سے یقیناً ایک عظیم روحانی فائدہ ہوگا، اس کے ساتھ ہی اس سے افتراق و انتشار میں بھی کمی ہوگی۔ مختلف لوگ اپنے ذوق کے اعتبار سے مختلف اذکار اختیار کر لیں تو رفتہ رفتہ یہی ان کی مابہ الامتیاز خصوصیت بن جاتے ہیں اور اس سے ایک علیحدگی کا احساس پیدا ہو سکتا ہے، لہٰذا اس اعتبار سے بھی عافیت اسی میں ہے کہ صرف مسنون اور ماثور ادعیہ و اذکار پر اکتفا کیا جائے۔

دوسری یہ کہ مثبت اور منفی دونوں کام سامنے رکھے جائیں۔ دین میں معروف کے امر کے ساتھ منکر کی نہی کا بھی حکم دیا گیا ہے اور احقاقِ حق کے ساتھ ابطالِ باطل کو بھی لازم ٹھہرایا گیا ہے، آج کل جو عام خیال پھیل گیا ہے کہ صرف مثبت کام کرنا چاہئے منفی کام نہیں کرنا چاہئے تو یہ میری ذاتی رائے میں از رُوئے دین درست نہیں ہے--- دعوت کا اچھے سے اچھا اسلوب اختیار کرنا اور حکمتِ تبلیغ کو پیشِ نظر رکھنا بالکل دوسری بات ہے اور انکارِ منکر اور ابطالِ باطل سے قطعاً صرفِ نظر کر کے صرف 'مثبت' باتوں کو پیش کرتے رہنا بالکل دوسری چیز ہے اور دینی غیرت و حمیت کا لازمی تقاضا میرے نزدیک یہ ہے کہ خلافِ دین و شرع امور پر برملا تنقید کی جائے، چاہے اس کا ہدف اصحابِ اقتدار بنتے ہوں چاہے عوام۔ اس معاملے میں یہ پہلو بھی لائقِ توجہ ہے کہ آج کل حکومت کی خلافِ مذہب باتوں پر تنقید کرنے والے تو پھر بھی مل جاتے ہیں، عوام کو ان کی خلافِ دین باتوں پر ٹوکنے والا کوئی نہیں رہا، جبکہ میری ذاتی رائے میں آج کے زمانے میں عوام کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کبھی سلاطین و امراء کو حاصل تھی اور اس اعتبار سے ان کی نظری و عملی گمراہیوں اور ضلالتوں پر تنقید بھی "افضل الجهاد" کے حکم میں داخل ہوگئی ہے۔

تیسرے یہ کہ جاہلیتِ قدیمہ اور جاہلیتِ جدیدہ دونوں کا ابطال کیا جائے۔ یہ تو ہو سکتا ہے بلکہ غالباً یہی ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ جاہلیتِ قدیمہ کی بیخ کنی کی صلاحیت و قدرت سے مسلح ہوں اور کچھ دوسرے لوگ جاہلیت جدیدہ کے استیصال کی قدرت و طاقت رکھیں۔ چنانچہ انہیں اپنے اپنے محاذوں پر کام کرنا ہوگا لیکن یہ

ضروری ہے کہ یہ دونوں محاذ پیشِ نظر رہیں اور کسی سے صرفِ نظر نہ ہونے پائے۔

چوتھی کوشش پیشِ نظر تنظیمِ اسلامی میں اس امر کی ہونی چاہئے کہ نہ تو نری عقلیت پر انحصار کیا جائے اور نہ ہی نری جذباتیت پر دار و مدار ہو بلکہ عقل اور جذبے دونوں کو مناسب مقام پر رکھ کر کام کیا جائے جو بات کہی جائے وہ صرف عقلی ہی نہ ہو بلکہ دِل سے بھی نکلے تاکہ اس کے مخاطب اہلِ عقل بھی ہوں اور صاحبانِ دل بھی اور دعوت خود اہلِ عقل کے بھی دل میں گھر کر جائے!

پانچویں لازمی چیز جس کا پورا اہتمام ہماری اس تنظیم میں کیا جانا چاہئے یہ ہے کہ اس میں تنقید پر کوئی پہرا نہ لگایا جائے اور ایسی کوئی پابندی نہ لگائی جائے جس سے لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں۔ تنقید کے صحیح اسلامی آداب کی پابندی تو یقیناً لازم ہے لیکن تنقید کے دروازوں کو بند کر دینا پیشِ نظر تنظیم کی پیشگی ہلاکت کا سامان ہوگا۔ اس تنظیم کے اربابِ حل وعقد کا تنقید کو برداشت کرنے کی ہمت و صلاحیت سے مسلح ہونا ضروری ہے--- اس کے ساتھ ہی یہ بھی لازمی ہے کہ پیشِ نظر تنظیم کا نظام شورائی ہو اور قرآن حکیم کی اس ہدایت کہ: ''وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ'' کا جیتا جاگتا نمونہ ہو۔

چھٹی خصوصیت ہماری اجتماعیت کی یہ ہونی چاہئے کہ اس میں زہدِ خشک اور تفریحِ بے قید کے مابین درمیانی کیفیت پیدا ہو اور نہ تو عَبُوۡسًا قَمۡطَرِيۡرًا کا نقشہ پیدا ہو جائے، نہ دوسری انتہا ہو کہ ہر وقت ہنسی دل لگی اور تفریح کا ماحول طاری رہے۔

اسی طرح 'رہبانیت' اور 'تنعُّم' کے مابین درمیانی کیفیت کا پیدا کرنا بھی لازمی ہے۔ دین میں نہ قطعی ترکِ لذات کی ترغیب ہے اور نہ عیش پرستی کی گنجائش ہے۔ اللہ کی نعمتوں سے جائز طریقے سے متمتع ہونے کو بُرا سمجھنا بھی دین کی رُوح کے منافی ہے اور عیش کوشی بھی از روئے دین ممنوع ہے۔

ساتویں ضروری چیز جو قرارداد کی توضیح میں بہت وضاحت کے ساتھ آچکی یہ ہے کہ انتظامی اور تنظیمی امور میں دلچسپی کے ساتھ اسی درجہ کا گہرا شغف تعبدی امور میں ہونا لازمی ہے ورنہ بالکل یک رُخی شخصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کی بدولت دینی تنظیموں میں بہت سی خرابیاں رُونما ہو جاتی ہیں۔ پیشِ نظر تنظیم میں اِن شاءاللہ اس امر کی خصوصی نگہداشت کی جائے گی۔

آٹھویں اور آخری ضروری چیز یہ ہے کہ اپنے زمانے کے مخصوص فتنوں کا صحیح فہم اور ان کی اہمیت کا صحیح شعور حاصل کیا جائے۔ اس معاملے میں دین کے خادموں کو بالکل ماہر تشخیص طبیب کے مانند ہونا چاہئے تاکہ وہ اپنے اپنے زمانے کی اصل اور بنیادی بیماریوں کی صحیح صحیح تشخیص کر سکیں۔ بصورت دیگر یہ

ہوسکتا ہے اور بسا اوقات ہوتا ہے کہ ساری جدوجہد علامات کے خلاف ہوتی رہتی ہے اور بیماری کی اصل جڑ جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگاہِ حقیقت بین نے بالکل صحیح اندازہ کرلیا تھا کہ منعِ زکوٰۃ وغیرہ جیسے بظاہر 'فروعی' معاملات کی تہہ میں اصل مرض کون سا کام کر رہا ہے۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی نگاہِ دُوررس نے بھی اپنے وقت کے فتنے کا صحیح اندازہ کرلیا تھا پھر ان کے بعد بھی تمام مجددین اپنے اپنے دَور کے فتنوں کی اہمیت کا اندازہ کر کے ان کے سدّ باب کی سعی کرتے رہے، **فجزاھم اللّٰہ خیر الجزاءِ عن جمیع المسلمین** اپنے وقت کے امراض کی صحیح تشخیص کے لئے بڑی گہری بصیرت کی ضرورت ہے اور یہ چیز درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف ہی سے ہوتی ہے۔ تاہم اپنے مقدور بھر اس امر کی سعی ضروری ہے کہ کسی ایک ہی پٹی ہوئی راہ پر چلتے رہنے کے بجائے اس پر مسلسل غور وفکر اور تفکر و تدبر کیا جاتا رہے کہ ہمارے زمانے کے اصل فتنے کون سے ہیں اور ان کے سدّ باب کے لئے صحیح راہ کون سی ہے۔

آخر میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر کے اپنی معروضات کو ختم کرتا ہوں کہ جو کام کرنے کا عزم ہم نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے کیا ہے وہ بیک وقت آسان بھی ہے اور مشکل بھی، آسان اس اعتبار سے کہ یہ ہمارے دین کا تقاضا، ہماری فطرت کی پکار اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے پروردگار کی جانب سے عائد کردہ فرض ہے۔ لہٰذا اس کی ادائیگی کی سعی و جہد سے دلوں کو راحت اور قلوب کو اطمینان وسکون حاصل ہوگا--- اور مشکل اس اعتبار سے کہ بسا اوقات اس راہ کی مسلسل جدوجہد کا کوئی محسوس نتیجہ برآمد ہوتا نظر نہیں آتا اور انسان کو کمال صبر واستقامت کے ساتھ اپنی محنت کے نتائج وثمرات سے بالکل بے نیاز ہو کر کام کئے جانا پڑتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ ''اے علی! اگر اللہ تیرے ذریعے کسی ایک انسان کو بھی ہدایت کی راہ پر لے آئے تو یہ تیرے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے''! بس یہی اس راہ کے ہر مسافر کا ماٹو (Motto) ہونا چاہئے اور اگر اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ ایک فرد بشر کو بھی سیدھی راہ پر لے آئے تو اسے چاہئے کہ اس بات کو واقعتاً ایک دولتِ بے بہا اور نعمتِ غیر مترقبہ تصور کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ہمارے قلب و نظر کی کیفیت فی الواقع یہ نہ ہو جائے تو اس راہ میں ثابت قدم رہنا محال ہے۔

آخر میں مَیں اپنے اور آپ سب کے لئے اللہ تعالیٰ سے ہدایت واستقامت اور عفو ومغفرت کی دعا کرتا ہوں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ☆

مولانا اصلاحیؒ کا الوداعی خطاب

عزیز ساتھیو!

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آپ نے ایک جماعتی نظم کے قیام کی قرارداد پر اتفاق کر لیا۔ میں اس پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کام کے لئے عزم و ہمت عطا فرمائے، اور ہر قدم پر ہماری دست گیری اور رہنمائی فرمائے---- میں اس موقع پر آپ کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ ہر چند اس کی ضرورت اور اہمیت مجھ پر واضح تھی، لیکن میں دو سبب سے اس قسم کی ذمہ داری سے گریز کرتا رہا۔ ایک تو یہ کہ اب میرے قویٰ ضعیف ہو رہے ہیں، کوئی بھاری بوجھ اُٹھانا میرے لئے ممکن نہیں رہا۔ دوسرا یہ کہ زندگی کے اِس آخری دور کے لئے اپنے ذوق کے مناسب جو کام میں نے تجویز کر لیا تھا، اب وقت و فرصت کا لمحہ لمحہ اس پر صرف کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ دوستوں کے شدید اصرار بلکہ دباؤ کے باوجود میں خود اس کے لئے پہل کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ دوستوں نے جب کبھی اس فریضہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی، میں ان کے دلائل کا تو انکار نہ کر سکا، لیکن اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں پر نگاہ کر کے اُن کی بات کو ٹالتا ہی رہا۔ میں یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ اگر چہ میرے اوقات تمام تر دینی و علمی کاموں ہی میں بسر ہو رہے ہیں، تاہم معاشرے سے متعلق مجھ پر جو فریضہ عائد ہوتا ہے اُس میں مجھ سے کوتاہی ہو رہی ہے، جس کے سبب نہ صرف میری بعض صلاحیتیں سکڑ رہی ہیں، بلکہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اس پر مجھ سے مواخذہ ہو۔ ان تمام احساسات کے باوجود میں اپنے آپ کو معذور سمجھتا رہا، جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو معذور سمجھنے میں بڑا فیاض ہوتا ہے۔

بہر حال اب میں پورے شرحِ صدر کے ساتھ اس کام میں شریک ہوتا ہوں اور اُن تمام دوستوں کا دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے اس عظیم فرض کی اہمیت کو سمجھا اور ہم سب کو اس کے سمجھانے کا اہتمام کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

میرے ذمہ اس وقت آپ تمام شرکائے مجلس کو بعض ضروری ہدایات دینے کا کام سپرد کیا گیا

ہے۔ یہ ہدایات ان کاموں سے متعلق ہیں جو آپ کو یہاں سے رخصت ہونے کے بعد کرنے ہیں، براہ کرم اِن کونوٹ کر لیجئے۔

جماعتی تنظیم سے متعلق اس وقت آپ کو پہلا کام یہ کرنا ہے کہ تنظیم کے نظام و دستور سے متعلق آپ کے سامنے جو تجویزیں ہیں وہ مقامی رفقاء سے مشورہ کے بعد قلم بند کر کے شیخ سلطان احمد صاحب کے پاس بھیج دیجئے تاکہ مجلسِ مشاورت اُن سے فائدہ اٹھا سکے--- حتی الوسع اس بات کی کوشش کیجئے کہ تجاویز کے بارے میں اگر اختلاف رائے ہو تو وہ غور و بحث سے مقامی رفقاء ہی کے اندر طے ہو جائے، تاکہ آگے کا کام آسان ہو جائے۔ اگر غور و بحث کے بعد بھی کسی امر میں اختلاف باقی رہ جائے تو اس کو نوٹ کر دیا جائے۔

اپنی اور اپنے دوسرے بھائیوں کی اصلاح و تربیت سے متعلق جو کام آپ کو کرنے ہیں ان کے بارے میں مفصل ہدایات تو افرادی قوت کا جائزہ لینے کے بعد ہی دی جا سکیں گی لیکن چند کام ایسے ابتدائی اور بدیہی نوعیت کے ہیں کہ ان کا اہتمام بلا تاخیر آپ کو کرنا چاہیئے۔

پہلا کام نماز کا اہتمام ہے۔ نماز ہمارے دین میں ایمان کا اوّلین تقاضا ہے۔ قرآن و حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ اسلامی تنظیم کی شیرازہ بندی اسی چیز سے ہوتی ہے، اور انبیاء علیہم السلام نے اصلاح و تربیت کا پہلا قدم اسی سے اٹھایا ہے۔ آپ بھی اس کی پابندی کے لئے مضبوط عہد کیجئے اور اپنے عزیزوں، قریبوں، دوستوں، پڑوسیوں اور محلّہ داروں کو بھی دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ اس کی تلقین کیجئے۔ نماز کے اہتمام میں یہ بات بھی داخل ہے کہ حتی الوسع محلّہ کی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کیجئے۔ بغیر کسی معقول عذر کے اس میں کوتاہی نہ کیجئے اور دوسروں کو بھی نماز با جماعت کی عظمت و اہمیت سمجھانے کی کوشش کیجئے!!

دوسرا کام یہ ہے کہ اپنے دینی علم میں اضافہ کا اہتمام کیجئے۔ جن مقامات پر یہ ممکن ہو کہ کسی ذی علم کی رہنمائی میں قرآن مجید کا اجتماعی مطالعہ کیا جا سکے، وہاں حلقہ تدبرِ قرآن قائم کیجئے اور ہفتہ میں کم از کم ایک دن اس کام کے لئے خاص کیجئے کہ کچھ وقت قرآن کے فکر و مطالعہ میں بسر ہو۔ اس کے ساتھ اگر حدیث کی ایسی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا جائے جو اخلاقی احادیث پر مشتمل ہیں مثلاً ریاض الصالحین وغیرہ تو اس سے مزید خیر و برکت ہوگی۔ اگر کسی ذی علم کی رہنمائی حاصل نہ ہو تو عام حلقہ مطالعۂ اسلامی قائم کیجئے اور منتخب اسلامی کُتب کا التزام سے مطالعہ کیجئے۔ اس قسم کے حلقہ میں اپنے اُن دینی بھائیوں

کو بھی شرکت کی دعوت دیجئے جن کے اندر دین اور علمِ دین کی رغبت محسوس کریں۔

آپ لوگوں میں سے جن لوگوں نے جدید تعلیم پائی ہو، اُن کو میں یہ مشورہ بھی دُوں گا کہ وہ عربی زبان سیکھنے کی کوشش کریں، تاکہ وہ قرآن و حدیث سے براہ راست استفادہ کر سکیں۔ بظاہر یہ کام مشکل نظر آتا ہے لیکن شوق اور طلب سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ اپنے اپنے شہروں میں جس عالم سے بھی اس کام میں آپ کو مدد ملنے کی توقع ہو اس سے استفادہ کیجئے۔ ہم خود بھی حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس مسئلہ پر غور کریں گے کہ آسان طریقہ سے آپ کو عربی سکھانے کی کیا شکل اختیار کی جا سکتی ہے۔ لاہور میں اس سلسلہ میں ہم نے جو تجربے کئے ہیں، ہم ان سے بھی آپ کو آگاہ کریں گے تاکہ جن مقامات پر اس نہج پر درس جاری ہو سکے وہاں اس نہج پر درس کئے جائیں۔

تیسرا کام یہ ہے کہ اپنے اپنے مقامات پر اپنے ہم خیال اور رفیق تلاش کیجئے جن کے تعاون سے پیشِ نظر مقصد کو تقویت حاصل ہو۔ جو اس جدوجہد میں آپ کے لئے سہارا بن سکیں، جو آپ کی اصلاح کریں، اور جن کی آپ اصلاح کریں۔ جماعتی زندگی کی یہی خیر و برکت ہے جو انفرادی زندگی میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ یہ زمانہ بہت بُرا ہے لیکن اِس بُرے زمانے میں بھی اچھی رُوحیں اور نیک نفوس موجود ہیں، ضرورت ٹٹولنے اور جستجو کی ہے۔ جب آپ جستجو کریں گے تو اللہ کے بے شمار بندے ایسے مل جائیں گے جو آپ کی رفاقت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ کتنے نفوس ہوتے ہیں جن کے اندر دینی حِس موجود ہوتی ہے، لیکن کوئی اُس کو اُکسانے والا نہیں ہوتا، اس وجہ سے وہ دبی ہوئی رہتی ہے۔ آپ ایسے نفوس تلاش کیجئے، اُن تک پہنچئے، اُن سے تبادلۂ خیالات کیجئے، اور اس کام میں اُن کو تعاون کی دعوت دیجئے۔

آپ کی اجتماعی طاقت جتنی ہی بڑھتی جائے گی اتنی ہی ان کاموں کی انجام دہی آپ کے لئے آسان ہوتی جائے گی۔ جو افراد اور معاشرہ کی اصلاح سے متعلق آپ پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

یہ چند ابتدائی کام ہیں جو اس قرارداد کی روشنی میں، جو آپ نے پاس کی ہے، فی الفور شروع کئے جا سکتے ہیں۔ آگے اللہ مزید کاموں کی راہیں کھولے گا، اگر ہمارے اندر اس کے دین کی خدمت کے لئے اخلاص ہو گا۔ اب دُعا کیجئے کہ ہمیں اس کام کے لئے سچا عزم حاصل ہو اور ہر قدم پر توفیقِ الٰہی ہماری رہنمائی فرمائے۔

تائید و تبصرہ

۱۔ مولانا عبدُالماجِدُ دَریابادیُ مرحوم

ایک نیا اصلاحی ادارہ

''لاہور کے ایک معزز دینی ماہنامہ 'میثاق' سے یہ معلوم کر کے دِلی خوشی ہوئی کہ وہاں چند ذی فہم و بصیرت مخلصوں کی سعی و اہتمام سے ایک نئے دینی ادارہ کی بنیاد بالکل صحیح اُصول پر پڑ رہی ہے۔ یہ حضرات زیادہ تر جماعت اسلامی سے نکلے ہوئے ارکان ہیں اور یقین ہے کہ یہ ان شاء اللہ ان غلطیوں سے محفوظ رہیں گے، جن کا خوب تجربہ انہیں جماعت مذکور میں شامل رہ کر ہو چکا ہے۔ادارہ کے ایک بانی مولانا امین احسن اصلاحی کی یہ بات آب زر سے لکھنے کے قابل ہے:

> ''جماعتیں اور تنظیمیں قائم تو ہوتی ہیں اصلاً کسی اعلیٰ و برتر نصب العین کے لئے لیکن قائم ہو جانے کے بعد وہ رفتہ رفتہ از خود نصب العین اور مقصد بن جاتی ہیں اور اصل نصب العین غائب ہو جاتا ہے!''

یہ 'صدق' کے مسلک کی **صدفی صد ترجمانی ہے**۔مولانا اصلاحی کی تقریر کا یہ ٹکڑا بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے:

> ''ارباب اقتدار کی ہر بات کو ہدفِ تنقید بنا لینا، یہاں تک کہ اُن کے خیر کو بھی شر قرار دے لینا، اور اُس کی مخالفت میں اِس حد تک بڑھ جانا کہ دوسروں کی بُرائیاں بھی اُن کے کھاتے میں ڈال دینا نہ عقل و منطق کی رُو سے جائز ہے، اور نہ اسلام کی رُو سے۔ یہ اقتدار کی ہوس میں اندھے ہو جانے کی علامت ہے!''

اور پاکستان کی (ہندوستان کی نہیں) جماعتِ اسلامی کو شدید ترین نقصان شاید اسی چیز نے پہنچایا ہے۔اللہ ہم کو پچھلی غلطیوں سے سبق لینے کی توفیق دے اور راہِ اصلاح و ہدایت پر مستقیم رکھے۔''

خدمتِ دین کی گنجائشیں

پاکستان کے دینی ماہنامہ 'میثاق' لاہور سے نئی دینی و اجتماعی تنظیم کے سلسلے میں:

''آخر میں اس امر کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ پیشِ نظر تنظیم ہرگز ''الجماعت'' کے حکم میں داخل نہ ہوگی۔ ''الجماعت'' کا مقام ہماری دانست میں اُمت مسلمہ کو بحیثیت مجموعی حاصل ہے۔ دین کی خدمت ایک نہایت وسیع وعریض کام ہے اور اس کے گوشے بے شمار ہیں۔ ہم ان تمام جماعتوں اور اداروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کسی بھی گوشے میں دین کی خدمت کا کام کر رہی ہیں اور اِن شاء اللہ اُن کے ساتھ ہمارا رویہ تعاون و تائید ہی کا ہوگا!''

بات اصلاً بہت موٹی اور بالکل صاف و واضح ہے، لیکن اس زمانے میں بہت بڑی بات ہے۔ دین و اُمّت کی خدمت کے اتنے پہلو ہیں اور خدمت کے لئے گنجائش اتنی ہے کہ اگر نفسانیت کو چھوڑ کر تھوڑے سے بھی عزم و حوصلہ کے ساتھ خدمت کا ارادہ ہو تو خلوص اور فہمِ سلیم سے کام لینے والا ہر فردِ اُمت اس کے اندر کھپ سکتا ہے اور باہمی مناقشہ سے جواب تک بڑا سنگِ راہ بنا ہوا ہے' نجات پا کر ہر گروہ اپنے مذاق و استعداد کے لحاظ سے سچا خادمِ دین بن سکتا ہے!'' (میثاق۔ لاہور' جنوری ۶۸ء بحوالہ ''صدقِ جدید'' ۱۷ نومبر ۶۷ء)

۲۔ مولانا عبدُالباریؒ ندوی مرحوم

فرنگی ساخت کی جماعت سازی اور اُس کی فتنہ سامانی!

''تازہ میثاق میں زیادہ تر پرانی جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے حضرات جو ایک نئی جماعت بنا رہے ہیں اور جس کا ہمارے حضرت صاحبِ 'صدق' نے بھی خیر مقدم کیا ہے، اس کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ آپ کی تقریر کی جس بات کی صاحبِ صدق نے داد دی ہے، میں بھی اُسے ہی سب سے زیادہ قابلِ داد اور آبِ زر کیا، آبِ جواہر سے لکھنے کے قابل پاتا ہوں۔ میں تو فرنگی ساخت کی جماعت سازیوں کے عین خمیر ہی میں اس فساد کو داخل جانتا ہوں اور علی الاعلان کہا کرتا ہوں کہ یہ افتراق سازی کی بنیاد ہوتی ہے۔ انبیاء کا طریق یہ ہے کہ صاحبِ دعوت و عزیمت اپنی دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے اور بلا کسی مصنوعی جماعت سازی کے جو لوگ برضا و رغبت اِس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں، بس وہی ''حزبُ اللہ'' بن جاتے ہیں اور قواعد و ضوابط اور کثرتِ رائے وغیرہ کی بحث کے بغیر جب تک وہ داعی کے ساتھ چلتے رہتے ہیں تبھی خیریت رہتی ہے۔ باقی جہاں اقلیت و اکثریت وغیرہ کی رائے شماری اور صدر و سیکرٹری اور چندہ بازی وغیرہ کے جدید فرنگی طریقے داخل ہوئے، بس پھوٹ یقینی ہے کہ ایسی صورت میں جیسا آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے (بالکل نفسیاتی طور پر) جماعت مقصود بن جاتی ہے اور اصل مقصود غائب ہوتے ہوتے بمنزلۂ صفر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جب تک غیر معمولی

اخلاص وللّٰہیّت کم وبیش تمام افرادِ جماعت میں نہ ہوں، جماعتی عصبیت ورقابت اس جماعت سازی کا لازمہ ہے۔ مجھے تو ہمیشہ الٰہ آباد کے عارفِ اکبر کا یہ عارفانہ شعر برابر یاد آتا رہتا ہے، جس کے ذریعے اِس طرز کی جماعت سازیوں کے آغاز ہی میں انہوں نے آگاہ فرمادیا تھا: ؎

کریما بہ بخشائے برحالِ بندہ
کہ ہستم اسیرِ کمیٹی و چندہ!

اور یہ سراپا ناکارہ..... اور........ کے حضرات سے یہی عرض کرتا رہتا ہے کہ اپنی جماعتوں کو توڑ دیں کہ اُن میں سے انجام کسی ایک کا بھی بخیر نہ ہوا تو بالآخر صدارت کو دو صدروں میں تقسیم کرنا پڑا!‘‘

(مولانا اصلاحیؒ کے نام ایک خط سے ماخوذ)

بابِ چہارم

رودادِ منتقلیٔ امارت

۱۶ر ستمبر ۲۰۰۲ء کو بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے تنظیم اسلامی کی امارت سے اپنی پیرانہ سالی اور بعض عوارض کی وجہ سے استعفاء دیا اور اُن کی جگہ محترم جناب حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ منصب امارت پر فائز ہوئے، جنہیں اس سے قبل ایک وسیع مشاورت کے بعد آئندہ کے لئے جانشین مقرر کیا جا چکا تھا۔ گویا اس طرح تنظیم اسلامی کی تاریخ کے دورِ ثانی کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ اس اہمیت کے پیش نظر امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید صاحب کی بطور امیر نامزدگی کی روداد خود بانی محترمؒ کے قلم سے یہاں پیش کی جا رہی ہے۔ یہ تحریر محترم ڈاکٹر صاحبؒ کے ذاتی کوائف پر مبنی کتاب ''حساب کم وبیش'' سے مأخوذ ہے۔ (مرتب)

روداد منتقلیٔ امارت

عزیزم حافظ عاکف سعید سلمہٗ کی بطور امیر تنظیم اسلامی نامزدگی کوئی اچانک پیش آنے والا حادثہ یعنی "BOLT FROM THE BLUE" نہیں تھا بلکہ اس ''قطرے کو گہر ہونے تک'' پورے چار سال کا عرصہ لگا۔ جس کے دوران ''وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ ''(اور اپنے کام آپس کے مشورے سے کرتے ہیں) کے جملہ تقاضے ادا کئے گئے! اس سلسلے میں حسب ذیل نکات پیش نظر رہنے چاہئیں:

(۱) تنظیم کے دستور العمل میں اوّل یوم سے یہ طے ہے کہ:

''امیر تنظیم کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ کسی مجبوری یا معذوری کی بناء پر اپنے منصب سے دست بردار ہونے کی صورت میں اپنا جانشین نامزد کریں۔ بصورتِ دیگر ان کی وفات پر نئے امیر تنظیم کا انتخاب مرکزی مجلس مشاورت سات دن کے اندر اتفاق رائے یا اختلاف کی صورت میں کثرت رائے سے کرے گی......''

(۲) تاہم اس سلسلے میں ''مشاورت'' کا سلسلہ ۹۴ء سے شروع ہوا جبکہ مرکزی مجلس مشاورت کے اجلاس منعقدہ ۷۔۸ رفروری میں اس موضوع پر بحث ہوئی کہ آیا میں اپنے بعد کے لئے اپنا جانشین نامزد کر دوں! (جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا تھا) یا اسے رفقاء پر چھوڑ دوں کہ وہ خود اپنی صوابدید سے فیصلہ کریں (جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے کیا تھا!) طویل بحث مباحثے کے بعد رائے شماری ہوئی تو جدید اصطلاح میں HUNG PARLIAMENT والی صورت حال پیدا ہوگئی کہ ۱۳؍ارکان کی رائے نامزدگی کے حق میں تھی اور اتنے ہی ارکان معاملے کو OPEN رکھنے کے حق میں تھے ــــــ (بعد ازاں ۸۔۹؍جون کی مشاورت میں ایک اور معزز رکن شوریٰ نے نوٹ کرایا کہ ان کی رائے گنتی میں آنے سے رہ گئی تھی ــــــ ان کی رائے بھی OPEN رکھنے کے حق میں ہے۔ گویا اب معاملہ 13vs 14 کا ہوگیا' لیکن ظاہر ہے کہ یہ بھی کوئی فیصلہ کن صورت نہیں تھی!)

(۳) چنانچہ تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع' منعقدہ اکتوبر ۱۹۹۴ء کے موقع پر میں نے اعلان کیا تھا کہ میرے بعد تنظیم کی امارت کے مسئلے کے ضمن میں جو دو متبادل صورتیں ہمارے نظام العمل میں درج ہیں ان میں سے کسی ایک کے بارے میں حتمی فیصلے کے لئے رفقاء سے مشورے کے لئے تنظیم کے ملتزم رفقاء کا ایک کُل تنظیم خصوصی اجتماع اپریل ۱۹۹۵ء میں منعقد ہوگا۔

(۴) چنانچہ تنظیم اسلامی کا آل پاکستان اجتماع ملتزم رفقاء ۲ تا ۴/اپریل ۹۵ء لاہور میں منعقد ہوا۔ اس میں مشورہ طلب امور کے تعین کے لئے میں نے ایک مکتوب جملہ ملتزم رفقاء کو ۲۱/مارچ ۹۵ء کو ارسال کیا' جس میں وضاحت کی کہ:

چند روز قبل جبکہ بفضلہٖ تعالیٰ امید واثق ہوگئی کہ یہ اجتماع حسبِ منشا منعقد ہو ہی جائے گا تو میرے ذہن نے اس سے بھرپور استفادہ کے لئے ترتیب مباحث پر غور کیا تو میں حسب ذیل نتائج تک پہنچا ہوں:

میرے بعد کے دور کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے ہوئے سب سے پہلے ہمیں نظام بیعت پر بھرپور نظر ثانی کر لینی چاہیئے۔ تاکہ (i) اگر کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہو تو اس کا فیصلہ کر لیا جائے۔ ورنہ (ii) اگر بعض حضرات کے ذہنوں میں کوئی اشکال ہو تو وہ رفع ہو جائے۔ اور ہم اسے زیادہ نئے اور زیادہ بھرپور انشراح صدر کے ساتھ جاری رکھ سکیں۔

اس ضمن میں حسب ذیل دو باتیں میری جانب سے پیش نظر رہیں:

ایک یہ کہ اگرچہ میرے نزدیک اقامت دین کی جدوجہد کے لئے قائم ہونے والی جماعت کے لئے واحد منصوص' مسنون اور ماثور اساس صرف شخصی بیعت ہی کی ہے' تاہم میں ہمیشہ سے یہ کہتا رہا ہوں کہ مغربی طرز کی دستوری تنظیم کو بھی میں حرام یا ممنوع نہیں بلکہ ''مباح'' سمجھتا ہوں۔

دوسرے یہ کہ نظام بیعت کے لئے کتاب وسنت اور سیرت وتاریخ سے مطابقت پر مستزاد جو عقلی استدلال ہے اس کا بھی ایک جز تو مستقل اور ابدی ہے یعنی یہ کہ انقلابی جدوجہد کے آخری یعنی اقدامی مرحلے کے لئے اس طرز کا نظم قطعاً ناگزیر ہے اور اس کے لئے مناسب یہی ہے کہ طبائع کو پہلے ہی سے اس کا خوگر بنا دیا جائے ...... لیکن ایک جز وصرف داعیٔ اوّل اور مؤسس تنظیم کی ذات سے متعلق ہوتا ہے' یعنی یہ کہ کسی بھی دعوت وتحریک کا داعی ہی اس کے جملہ مضمرات اور مقدرات کو بہتر طور پر جانتا ہے اور چونکہ تنظیم اور جماعت کی پوری تعمیر میں ایک ایک اینٹ اسی کے ہاتھ کی رکھی ہوئی ہوتی ہے لہٰذا اس کی ذات میں ''اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ '' (بھلا جس نے پیدا کیا وہ بے خبر ہے؟) کا عکس اور ''صَاحِبُ الْبَیْتِ اَدْرٰی بِمَا فِیْھَا '' (گھر کا مالک زیادہ جانتا ہے کہ جو کچھ گھر میں ہے) کی کیفیت موجود ہوتی ہے' لیکن یہ دلیل اس کے بعد کسی دوسرے شخص کے حق میں موجود نہیں ہوتی' اس لئے کہ وہ سب لوگ جو اس داعی کی دعوت پر جمع ہوتے ہیں

اس اعتبار سے کم وبیش مساوی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ (یہی وجہ ہے کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور میں بھی میں نے اپنے لئے تو ''حق استرداد'' (VETO) رکھا تھا' لیکن میرے بعد کسی صدر انجمن کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا۔)

بنابریں اس مسئلے پر غور کر لینے میں ہرگز کوئی حرج نہیں ہے!......!

لیکن اگر نئے انشراح صدر کے ساتھ بیعت ہی کے نظام کو جاری رکھنے کا فیصلہ ہو تو پھر مجھے ذاتی طور پر دو مشورے درکار ہوں گے:

ایک یہ کہ آیا میں نظام العمل کے مطابق اپنا جانشین نامزد کر دوں یا اسے مجلس مشاورت ہی کے لئے رہنے دوں؟

اس معاملے میں چونکہ آخری اور حتمی فیصلہ رفقاء کی آراء کو ''گننے'' اور ''تولنے'' کے بعد خود مجھ ہی کو کرنا ہے لہٰذا اس کا بھی امکان ہے کہ میرا ذہن اجتماع کے دوران ہی یکسو اور کسی ایک رائے پر جازم ہو جائے اور میں اس کا اعلان بھی کر دوں......اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے حتمی رائے قائم کرنے میں مزید وقت درکار ہو۔

اس پہلی بات کے ضمن میں ضمنی مشورہ یہ بھی درکار ہوگا کہ نامزدگی کی صورت میں اس کا اعلان اپنی زندگی ہی میں کر دوں یا اسے وصیت کی صورت میں لکھ کر رکھ دوں۔ (مؤخر الذکر صورت میں اس کا امکان رہے گا کہ میں اپنی ''وصیت'' پر نظر ثانی بھی کرتا رہوں!)

فقط والسلام

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

۲۱ مارچ ۱۹۹۵ء

(۵) ان مسائل پر کھلی بحث وتمحیص کے بعد استصواب رائے سے حسب ذیل نتائج سامنے آئے:

(i) اجتماع کے اس سیشن میں موجود ۳۱۰ رفقاء میں سے بہت بھاری اکثریت' یعنی ۲۸۴ رفقاء نے اوّل الذکر کے حق میں فیصلہ دیا۔ صرف ۱۹ رفقاء کی رائے یہ سامنے آئی کہ آئندہ تنظیم کو بیعت کی بجائے کسی دستوری نظم پر استوار کیا جانا چاہئے' جبکہ ۷ رفقاء نے کسی رائے تک نہ پہنچنے کے باعث سوال نامہ خالی واپس لوٹایا۔

(ii) اجتماع کے دوسرے سیشن میں شریک ۳۱۳ رفقاء میں سے بھی ایک عظیم اکثریت' یعنی ۲۸۴ رفقاء نے پہلے سوال کے جواب میں یہ رائے ظاہر کی کہ مجھے اپنا جانشین اپنی زندگی ہی میں نامزد کر دینا چاہئے۔ ۲۷ رفقاء نے اس کے خلاف رائے دی' جبکہ ۵ رفقاء نے کسی رائے تک پہنچنے سے عجز کا اظہار کیا۔ یہاں بھی گویا نوے فیصد سے زائد رفقاء ایک رائے پر متفق نظر آتے ہیں۔

(iii) تاہم اس مسئلے سے متعلق دوسرے سوال کے جواب میں رفقاء واضح طور پر دو حصوں میں بٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۶۷ رفقاء کی رائے یہ تھی کہ اپنے جانشین کا اعلان مجھے اپنی زندگی ہی میں کر دینا چاہئے۔ اس کے مقابلے میں ۱۰۷ رفقاء نے یہ رائے ظاہر کی کہ جانشین کے نام کا اعلان کرنے کی بجائے اس کے بارے میں اپنے فیصلے کو وصیت کی شکل میں محفوظ کر دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ ۳۹ رفقاء اس معاملے میں کسی بھی رائے یا نتیجے تک پہنچنے سے قاصر رہے۔

(iv) اس سوال کے جواب میں کہ ''آپ کی رائے میں جانشینی کے سب سے زیادہ اہل کون ہیں؟'' رفقاء نے اپنے اپنے ذہن کے مطابق نام تجویز کئے۔ یہاں ہم ان چار رفقاء کے نام درج کر رہے ہیں جن کے حق میں سب سے زیادہ رفقاء نے رائے ظاہر کی ہے۔ ان چار رفقاء کے نام حروف تہجی کی ترتیب کے لحاظ سے یہ ہیں: رحمت اللہ بٹر صاحب' ڈاکٹر عبدالخالق صاحب' ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب اور مختار حسین فاروقی صاحب۔

(۶) اجلاس مشاورت ۱۲۔۱۳/اگست ۱۹۹۵ء میں مَیں نے اعلان کر دیا کہ (i) میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اپنا جانشین نامزد کروں گا ــــــ اور (ii) اسے ایک وصیت کی شکل میں لکھ کر لاہور میں موجود تنظیم اور انجمن دونوں کے سینئر ترین رفیق سید سراج الحق صاحب کے سپرد کر دوں گا ــــــ اور پھر اجلاس مشاورت ۲۹۔۳۰/نومبر ۹۵ء میں مَیں نے شوریٰ کو بتا دیا کہ میں نے اپنے فیصلے پر عمل کر لیا ہے اور اپنے جانشین کو نامزد کر کے وصیت کی شکل میں تحریر سید سراج الحق صاحب کے پاس رکھوا دی ہے۔

(۷) تاہم ایک خلش میرے دل میں باقی رہی کہ ۲ تا ۴/اپریل ۹۵ء کے اجتماع ملتزم رفقاء میں ایک تو نامزدگی کے اعلان یا وصیت کے بارے میں رفقاء کی آراء میں نمایاں تقسیم تھی' اور دوسرے یہ کہ جانشین کے لئے رفقاء سے جو نام مانگے گئے تھے اس کے ضمن میں کوئی واضح طریق کار اختیار نہیں کیا گیا تھا ــــــ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ تنظیم کے ملتزم رفقاء کا ایک مزید چھ روزہ تربیتی و استصوابی اجتماع منعقد کیا جائے ــــــ میری اس رائے کو تنظیم کی مجلس عاملہ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۹/مئی ۹۷ء میں منظور کر کے حسب ذیل فیصلے کئے: (ماخوذ از رجسٹر کارروائی)

☆ جانشین کو نامزد کرنے کا فیصلہ خود امیر محترم کو کرنا ہے۔

☆ نامزد جانشین کا اعلان کرنے یا وصیت کی صورت میں محفوظ کرنے کے بارے میں اب بھی ان کو یہ پسند ہے کہ اعلان نہ کیا جائے۔ تاہم ملتزم رفقاء کے اجتماع میں بعض رفقاء کی آراء سن کر وہ یہ چاہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں تمام ملتزم رفقاء کی رائے دوبارہ حاصل کی جائے۔

☆ قبل ازیں اس سلسلہ میں ملتزم رفقاء سے جورائے لی گئی تھی وہ اچانک تھی لہٰذا دوبارہ رائے حاصل کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

☆ اس کے باوجود فیصلہ ان کی آراء کی بنیاد پر نہیں ہوگا' بلکہ اس کے حوالے سے امیر محترم کو اپنی رائے کو استوار کرنے میں مدد ملے گی۔

اس کا طریق کار یہ ہوگا کہ:

☆ اولاً تین' چار رفقاء جو صاحب علم بھی ہوں اور انتظامی امور (Management) سے بھی واقف ہوں وہ یہ بیان کریں کہ جانشین کے لئے کیا ترجیحات ہونی چاہئیں اور ان میں کیا ترتیب ہوگی۔

☆ امیر محترم اس گفتگو کو مکمل کریں گے۔

☆ اس کے بعد تمام ملتزم رفقاء سے جانشین کے بارے میں رائے لی جائے گی۔

☆ ان آراء کے نتیجہ میں چوٹی کے پانچ رسات رفقاء (یا مزید اگر امیر محترم خود چاہیں) کو اس موضوع پر اظہارِ خیال کا موقع دیا جائے کہ اگر یہ ذمہ داری ان پر ڈال دی جائے تو ان کی ترجیحات کیا ہوں گی۔ (اس سلسلہ میں امیر محترم کچھ سوالات بنالیں گے جن کا جواب ان سے مطلوب ہوگا۔ رفقاء بھی سوالات کرسکیں گے۔)

☆ اس کے بعد ملتزم رفقاء سے دوبارہ آراء حاصل کی جائیں گی اور ان کے جائزہ کے بعد امیر محترم فیصلہ کریں گے۔

الحمدللہ کہ یہ چھ روزہ اجتماع پروگرام کے مطابق ۲۶ راکتوبر تا یکم نومبر ۱۹۹۷ء منعقد ہوا' جس میں ۴۵۰ ملتزم رفقاء نے شرکت کی اور اس کے دوران اقامت دین کی جدوجہد کے عظیم مقصد کے لئے جمع ہونے والے لوگوں کی ''اجتماعیت'' کے جو حسین مناظر دیکھنے میں آئے ان سے میری طبیعت میں اس وقت بھی بہت انشراح وانبساط پیدا ہوا تھا اور اس کا کیف وسرور مجھے آج تک بھی یاد ہے —— اور اس میں مجھے ایک کروڑ میں ایک کی نسبت ہی سے سہی لیکن اس احساس کا عکس محسوس ہوا تھا جس کے تحت نبی اکرم ﷺ نے جب اپنے مرضِ وفات کی شدت میں ذرا سی کمی پر اپنے حجرۂ مبارک کا پردہ اٹھا کر مسجد میں ہونے والی نماز باجماعت کا منظر دیکھا تو آپ ﷺ کے چہرے پر بشاشت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ظاہر ہوئی تھی!

اس کے افتتاحی اجلاس میں مَیں نے اپنے خطاب کے آغاز میں جو الفاظ کہے تھے وہ اس اجتماع کی

روداد کے مرتب (رفیق محترم نعیم اختر عدنان) کے مطابق یہ تھے (ماخوذ از 'ندائے خلافت' ۱۹ نومبر ۱۹۹۷ء)
''تلاوت قرآن مجید کے بعد امیر قافلہ و داعی تحریک خلافت' امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے اپنے افتتاحی خطاب کا آغاز سورۂ مریم کی ابتدائی آیات کی تلاوت سے کیا۔ امیر محترم مدظلہ نے فرمایا کہ ''تنظیم اسلامی کی ساڑھے بائیس سالہ تاریخ میں چھ روزہ اجتماع کے انعقاد کا یہ تیسرا موقع ہے۔ پہلا چھ روزہ تنظیمی اجتماع اگست ۱۹۷۷ء میں منعقد ہوا تھا جس میں دیگر امور کے علاوہ تنظیم اسلامی کی قرارداد تاسیس میں انقلابی رنگ کی کمی کی تلافی اور اقامت دین کی فرضیت پر زوردار خطاب ہوا تھا۔ اسی اجتماع میں ''بیعت'' کی منصوص و ماثور اور مسنون اساس کو اختیار کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا گیا۔ دوسرا چھ روزہ اجتماع ''فرائض دینی کے جامع تصور'' کے حوالے سے ۱۹۸۵ء میں منعقد ہوا تھا' جب کہ اب یہ تیسرا چھ روزہ اجتماع منعقد ہو رہا ہے تو اس موقع پر تنظیم اسلامی کے داعی' مؤسس اور تاحیات امیر کو اپنے جانشین کی تعیین کا مشکل ترین مرحلہ در پیش ہے۔ اس حوالے سے ندائے خلافت کی ۸ر اکتوبر کی اشاعت کے ذریعے تمام تفصیلات سے آپ حضرات آگاہ ہو چکے ہوں گے۔ میں اپنے گھٹنوں کے آپریشن سے پہلے جانشین کے تعین کے نازک اور اہم مرحلے کے ضمن میں ضروری مشاورت کا مرحلہ مکمل کرنا چاہتا ہوں''۔

چنانچہ اس شش روزہ اجتماع میں دروس قرآن' اور تنظیم کے لٹریچر میں سے اہم حصوں کے اجتماعی مطالعے پر مستزاد ایک تو ''تنظیم اسلامی کی کامیابیاں اور ناکامیاں'' کے موضوع پر رفقاء کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی جس کے ضمن میں پندرہ رفقاء نے اظہار خیال کیا۔ مزید برآں چونکہ یہ اجلاس اپریل ۱۹۹۵ء کے اجتماع ہی کے تسلسل کی حیثیت رکھتا تھا لہٰذا اس کی پوری کارروائی بھی پڑھ کر سنائی گئی اور اس سلسلے میں جو تقریر میں نے اپریل ۹۷ء میں اجلاس مجلس شوریٰ میں کی تھی اس کا آڈیو کیسٹ بھی سنوایا گیا۔

اصل قابل غور مسئلے یعنی جانشین کے تعین کے ضمن میں اولاً تنظیم کے بزرگ اور سینئر رفقاء نے ''جانشین کے مطلوبہ اوصاف'' کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ جن میں مولانا سید مظفر حسین ندوی (مرحوم)' شیخ جمیل الرحمٰن (مرحوم)' سید سراج الحق (مرحوم)' جناب قمر سعید قریشی' چوہدری غلام محمد (مرحوم)' جناب الطاف حسین' میجر (ر) فتح محمد، جناب سید نسیم الدین اور جناب اشرف وصی شامل تھے ——— ان کے علاوہ غلام محمد سومرو صاحب کو چونکہ اچانک واپس سکھر جانا پڑا تھا اس لئے ان کی تحریر ان کے چھوٹے بھائی احمد صادق سومرو نے پڑھ کر سنائی!

اس کے بعد استصواب رائے کے لئے ۳۰ر اکتوبر کی صبح جملہ رفقاء کو دو دو پرچیاں دے دی گئیں۔

ایک پر یہ رائے مطلوب تھی کہ جانشین کے تقرر کا اعلان بھی کر دیا جائے یا اسے وصیت ہی کے طور پر رہنے دیا جائے۔ اور دوسری پرچی میں ہر رفیق کو اپنی ترجیح کے مطابق جانشین کے لئے تین تین نام تجویز کرنے تھے۔ یہ پرچیاں اجلاس ہی میں واپس وصول کر لی گئیں' جو سید سراج الحق صاحب کے حوالے کر دی گئیں کہ وہ ان کو پراسیس کر لیں ـــــ چنانچہ شام کے اجلاس میں ایک تو سید صاحب کے آراء کے جائزے کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ جانشین کے تقرر کے ساتھ اس کا اعلان عام بھی کر دیا جانا چاہئے۔ یہ رائے شرکاءِ اجتماع کی نوے فیصد کی آراء پر مبنی تھی۔ اور مجوزہ جانشین کے نام کے سلسلے میں ترجیح اول' ترجیح دوم اور ترجیح سوم کے ناموں کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لینے اور پھر ان کو consolidate کرنے کے نتیجے میں چھ رفقاء کے نام ٹاپ پر آئے' جو حروفِ تہجی کی ترتیب کے مطابق حسبِ ذیل ہیں:

۱) ناظم شعبہ تربیت' جناب رحمت اللہ بٹر ۲) نائب امیر' ڈاکٹر عبدالخالق

۳) ناظم اعلیٰ' جناب عبدالرزاق ۴) امیر حلقہ بیرون پاکستان' ڈاکٹر عبدالسمیع

۵) ناظم نشر واشاعت' حافظ عاکف سعید ۶) امیر حلقہ پنجاب جنوبی' جناب مختار حسین فاروقی

اس کے بعد پہلے سے اعلان شدہ پروگرام کے مطابق ان حضرات کے اظہارِ خیال کا مرحلہ آیا۔ چنانچہ اس کے لئے پہلے تو ان سب حضرات کو ''آڈیٹوریم بدر'' کر دیا گیا ـــ پھر ان میں سے ایک ایک کو اندر بلا کر خطاب کی دعوت دی گئی ـــــ تاکہ ہر شخص دوسروں کے بیان سے لاعلم رہتے ہوئے اپنی خالص ذاتی رائے بیان کرے!

اس مرحلے کی تکمیل کے بعد اب جملہ رفقاء کو آخری اور حتمی طور پر صرف ایک ایک نام تجویز کرنے کے لئے رائے دہی کی پرچیاں دے دی گئیں کہ رات کے دوران اچھی طرح غور و فکر اور استخارہ کر کے نام تجویز کریں اور اگلی صبح (یعنی ۳۱/ اکتوبر کو) نمازِ فجر کے وقت انہیں معین مقامات پر پہنچا دیں! جو بحمداللہ' بخیر و خوبی ہو گیا' اور رفقاء کی آراء موصول ہو گئیں!

اب ظاہر ہے کہ یہ ساری exercise کسی ''انتخاب'' کے سلسلے کی نہیں تھی بلکہ خود مجھے آخری اور حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لئے ''مشورے'' کے لئے تھی۔ چنانچہ اس ضمن میں مَیں نے اجتماع کے آخری اجلاس منعقدہ یکم نومبر ۱۹۹۷ء کو صبح گیارہ بجے اپنے اختتامی خطاب میں عرض کیا:

''اپریل ۱۹۹۷ء کے اجتماع سے پہلے تک ایک رفیق کے بارے میں میرا ذہن یکسو ہو گیا تھا اور اس کی میں نے باقاعدہ وصیت بھی لکھ دی تھی' مگر اپریل ۹۷ء میں بعض بزرگ رفقاء کی جانب سے ایک رائے میرے

سامنے آئی جس کی بنا پر میں مزید غور وفکر کے لئے مجبور ہو گیا۔ چنانچہ اس رائے کے بعد میرے سامنے ایک اور نام بھی آیا اور پھر کئی دوسرے نام بھی ذہن میں آئے۔ اس اجتماع کے دوران بھی میں جانشین کے حوالے سے متردّد رہا ہوں اور اب تک متردّد ہوں۔ اب تک کسی نام پر میں یکسو نہیں ہو سکا۔ اس حوالے سے اس مشاورتی سلسلے کو ابھی اور وسعت دوں گا۔ جانشین کے بارے میں رفقاء کی آراء جناب سید سراج الحق کے حوالے کر دی ہیں جو انہیں ''پروسیس'' کر رہے ہیں۔ خود مجھے بھی اس حوالے سے مزید غور وفکر کی ضرورت ہے' جبکہ رمضان المبارک کے آخری ہفتے میں مجھے فیصلہ کرنا ہے۔ تاہم جانشین کی تقرری کے حوالے سے جو رفقاء مجھے کوئی خصوصی مشورہ دینا چاہیں وہ بذریعہ خط یہ مشورہ مجھے پہنچا سکتے ہیں''۔

واضح رہے کہ اپریل ۱۹۹۷ء تک میرے ذہن میں عزیزم عاکف سعید سلمہٗ کا نام کبھی نہیں آیا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو اس کا سب سے بڑا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آں عزیز گلے اور کان کی ایک تکلیف میں عرصے سے مبتلا ہیں جس سے بسا اوقات تقریر اور خطاب میں شدید رکاوٹ ہوتی ہے' اور کافی علاج معالجہ اور ایکسپرٹ آراء کے حصول کے باوجود کوئی صورت شفا کی نظر نہیں آئی۔ اسی طرح ۱۹۹۵ء کے مشاورتی اجتماع میں جب اچانک رفقاء سے جانشین کے لئے رائے دینے کو کہا گیا تو اس میں بھی ٹاپ کے چار لوگوں میں ان کا نام نہیں تھا۔ اس کی وجہ بھی بہت واضح تھی یعنی یہ کہ آں عزیز فیلڈ ورک میں کبھی آئے ہی نہیں تھے اور ان کا سارا وقت تنظیم کے لٹریچر کی تدوین واشاعت اور تین تین جرائد کی ادارت میں صرف ہوتا تھا اور یہ جملہ کام ''پس پردہ'' ہوتے تھے' لہٰذا رفقاءِ تنظیم کے سامنے وہ کبھی نمایاں ہو کر آئے ہی نہیں تھے۔

اپریل ۱۹۹۷ء کے اجتماع کے بعد میرے سامنے دو نہایت سینئر اور معمر رفقاء کی جانب سے پورے شدّ ومدّ کے ساتھ عزیزم عاکف کے لئے رائے آئی۔ ان میں سے ایک صوبہ سرحد کے سینئر ترین رفیق اور پاکستان کے انتہائی شمالی علاقے دیر سے تعلق رکھنے والے برادرم محمد فہیم صاحب تھے ـــــــ اور دوسرے پاکستان کے انتہائی جنوب یعنی کراچی سے تعلق رکھنے والے' تنظیم کے معمر ترین رفیق اور میرے ''بزرگ'' شیخ جمیل الرحمٰن (مرحوم) تھے ـــــــ برادرم قمر سعید قریشی صاحب جو انجمن کے مؤسسین میں بھی شامل ہیں ـــــــ اور تنظیم کے بھی تاسیسی ارکان میں سے ہیں' ان کا کہنا ہے کہ ان دونوں حضرات سے بھی قبل انہوں نے آں عزیز کا نام تجویز کیا تھا۔ لیکن نہ معلوم کیوں یہ مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا ـــــــ بلکہ ان کے یاد دلانے پر بھی یاد نہیں آیا! پھر ایک موقع پر شیخ جمیل الرحمٰن صاحب (مرحوم) اور جناب عبداللطیف عقیلی صاحب (جو کراچی کی انجمن اور تنظیم دونوں کے فعال رکن ہیں) میرے پاس آئے اور انہوں نے عزیزم

عاکف کے لئے دلائل دینے شروع کئے تو میں نے موجود الوقت ماحول میں بیٹے کی نامزدگی سے اعتراضات کا جو طوفان اُٹھ سکتا تھا اس کے پیش نظر کہا: ''آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ سب کچھ اپنی جگہ! لیکن وہ میرا بیٹا ہے!!'' ـــــــ اس پر جناب عقیلی صاحب نے فرمایا: ''ڈاکٹر صاحب! بیٹا ہونا کوئی ڈس کوالیفیکیشن (Disqualification) تو نہیں ہے!'' جس پر میں لاجواب ہو کر رہ گیا ـــ لیکن اس سب کے باوجود میں مذبذب اور متردّد ہی رہا۔ چنانچہ ۹۷ء کے اجتماعِ ملتزم رفقاء کے بعد جو پہلا اجلاس مرکزی مجلس مشاورت کا ہوا اس موقع پر میں نے جملہ اراکین مشاورت سے علیحدگی میں مشورہ بھی طلب کیا اور ان کے مشوروں پر ردّ و قدح بھی کی اور جرح و تعدیل بھی! ـــ ۹۷ء کے شش روزہ اجتماع کے دوران آنے والی آراء کو پراسیس کرنے اور پھر اس کے بعد کی گفتگوؤں کے نتیجے میں میرا ذہن تو عزیزم عاکف کی طرف منتقل ہو گیا تھا بلکہ ان کے اوصاف کے ضمن میں جو کچھ سینئر رفقاء کی جانب سے سننے میں آیا اس پر خود مجھے حیرت ہوئی کہ میرے ذہن میں ان کا نام اب تک کیوں نہیں آیا تھا' لیکن متذکرہ بالا اندیشے کے پیش نظر میری کیفیت وہی تھی جو سورۃ احزاب میں حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح کے ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان ہوئی ہے ــــ!

بہرحال رمضان مبارک کے دوران مسلسل غور و فکر اور استخارہ کے جواب میں میرا ذہن الفاظ قرآنی: ''وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ '' (اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ خدا ہی اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو) پر جم گیا ـــ چنانچہ میں نے اجلاس مشاورت منعقدہ ۱۴۔۱۵/ اپریل ۱۹۹۸ء میں اعلان کر دیا کہ میرے بعد امیر تنظیم عزیزم عاکف سعید سلمہ ہوں گے۔ البتہ ابھی ان کی حیثیت ''زیر تربیت'' کی رہے گی ـــ اور تنظیم کا موجودہ نظم علیٰ حالہٖ برقرار رہے گا!

الغرض! یہ ہے مختصر داستان اس طویل سلسلۂ مشاورت کی جس کے نتیجے میں امیر تنظیم اسلامی کی حیثیت سے میرے جانشین کے طور پر عزیزم عاکف سعید صاحب کا تقرر ہوا!

عزیزم عاکف سعید کی جانشینی کے فیصلہ کا خیر مقدم تنظیم اسلامی کے رفقاء کے حلقے میں عمومی خوشدلی کے ساتھ ہوا۔ صرف اکّا دکّا رفقاء نے اسی عام تصور کے تحت جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے' شدت تاثر میں تنظیم سے علیحدگی اختیار کر لی ــــــ بہرحال میں اپنی جگہ پوری طرح مطمئن ہو کر ایک SENSE OF RELIEF کی سی کیفیت کے ساتھ گھٹنوں کے بڑے اپریشن کے لئے امریکہ روانہ ہو گیا' جہاں تین ماہ

کے لگ بھگ قیام رہا۔ اس عرصے کے دوران عزیزم عاکف نے ہی قائم مقام امیر کے فرائض سرانجام دیئے۔ اور واپسی پر جو حالات معلوم ہوئے ان سے اپنے فیصلہ پر بحمداللہ مزید انشراح ہوا۔ اس کے بعد بھی میرے اسفار کے دوران یہی عمل جاری رہا۔

بعدازاں جب میں نے ستمبر ۲۰۰۲ء میں منعقد ہونے والی شوریٰ کے اجلاس میں تنظیم کی امارت سے سبکدوش ہونے کا اعلان کیا تو میں نے سب سے پہلے خود عزیزم حافظ عاکف سعید سلمہٗ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ اور پھر تنظیم کی مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ کے پچاس کے لگ بھگ ارکان نے بھی بیعت کرلی (سوائے دو حضرات کے)— اور اس طرح تنظیم کی قیادت نہایت ہموار طریقے پر اگلی نسل کو منتقل ہوگئی۔

اب میں اپنی آنکھوں کے سامنے تنظیم کی آئندہ قیادت کو کام کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں- جس سے اطمینان حاصل ہو رہا ہے کہ ان شاء اللہ تنظیم اسی نہج پر کام کرتی رہے گی۔ اور جس طرح جانشین کے فیصلے کے بعد میں پورے اطمینان کے ساتھ بڑے اپریشن کے لئے امریکہ روانہ ہوا تھا' ان شاء اللہ اسی طرح کے اطمینان کے ساتھ اپنی عمر بھر کی کمائی کو اپنی نگاہوں کے سامنے پھلتے پھولتے دیکھ کر عالم آخرت کے سفر پر روانہ ہوسکوں گا! اللّٰھم آمین![1]

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

۳ دسمبر ۲۰۰۳ء

(۱) الحمدللہ! جیسے بانیٔ محترمؒ نے تحریر فرمایا تھا ایسا ہی ہوا اور 13-14 اپریل 2010ء کی درمیانی شب یہ عظیم داعیٔ انقلابِ اسلامی اپنی نصف صدی پر مشتمل مساعی کو آگے بڑھانے کے لئے آئندہ نسل کے حوالے کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

حصہ سوم

تنظیم اسلامی کی

فکر اور طریق کار

زیر نظر کتاب کا حصہ سوم تین ابواب پر مشتمل ہے

باب اوّل فرائضِ دینی کا جامع تصوّر

باب دوم رسولِ انقلاب کا طریقہ انقلاب

باب سوم اسلامی نظم جماعت میں بیعت کی اہمیت

بابِ اوّل

فرائضِ دینی کا جامع تصوّر

مختصر تحریر اور مفصّل تقریر

حصّہ سوم

تنظیم اسلامی کی فکر اور طریق کار

بابِ اوّل

فرائضِ دینی کا جامع تصوّر

مختصر تحریر اور مفصّل تقریر

یہ باب دراصل اس امر کی وضاحت پر مشتمل ہے کہ تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے بندگانِ خدا کو کس بات کی دعوت دی جارہی ہے۔ ظاہر ہے ایک جملے میں اگر بیان کیا جائے تو یہ دعوت رضائے الٰہی اور اُخروی نجات کے حصول کے لئے جدوجہد کی دعوت ہے۔ البتہ رضائے الٰہی کے حصول کے کچھ ذرائع قرآن وسنت کی رُو سے ہمارے سامنے آتے ہیں، ان کے مابین کیا ربط وتعلق ہے اوران سب کو اگر مربوط انداز میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اُس کا خاکہ کیا ہوگا؟؟؟ اسی کی تفصیل آپ زیرِ نظر باب میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

یہ باب دراصل دو حصوں پر منقسم ہے۔ حصہ الف میں ''فرائضِ دینی کے جامع تصور'' کو بانی محترمؒ کی مختصر مگر حد درجے جامع تحریر کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔ دراصل یہ تحریر بانی محترمؒ کی مفصل تالیف ''جماعتِ شیخ الہندؒ اور تنظیم اسلامی'' سے ماخوذ ہے۔ اس مختصر مگر جامع تحریر کا تعارف بانی محترمؒ نے ایک اشاعت کے موقع پر خود قلمبند فرمایا تھا جسے ہم یہاں نقل کر رہے ہیں:

''یہ راقم الحروف کے عمر بھر کے مطالعۂ قرآن وحدیث اور سنت وسیرتِ

رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے خلاصے اور لب لباب کی حیثیت رکھتا ہے اور اس اعتبار سے بلاشبہ تنظیم کے اساسی دینی فکر کا جزو لاینفک ہے۔ راقم نے اپنے تصورات کے سلسلے میں علماء کرام سے استصواب اور اُن کی آراء سے رفقاءِ تنظیم کو براہ راست آگاہ کرنے کے لئے یہ اہتمام کیا کہ ۱۹۸۵ء کو تنظیم کا سالانہ اجتماع بھی ۲۳ تا ۲۸ مارچ مسلسل چھ دن جاری رہا اور انہی ایام میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے سالانہ محاضراتِ قرآنی بھی منعقد کر لئے گئے۔ چنانچہ مسجد جامع القرآن، قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور میں صبح کے اوقات میں تنظیم کے سالانہ اجتماع کی کارروائی جاری رہتی تھی اور شام کو تین ساڑھے تین گھنٹے کا اجلاس محاضرات کا ہوتا تھا۔ جن کا موضوع میری یہی تحریر تھی جس پر تقریباً یک صد علماء کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تھی ----- جن میں سے پچیس حضرات نے باضابطہ شرکت فرما کر بالمشافہ خطاب فرمایا اور تقریباً اتنے ہی حضرات نے اپنی آراء تحریری صورت میں ارسال کر دیں۔ چنانچہ روزانہ اوسطاً چار حضرات کا خطاب ہوا جن میں سے بعض نے میرے خیالات کی کامل تصویب فرمائی، بعض نے جزوی اتفاق کا اظہار فرمایا بعض نے شدید تنقید کی، یہاں تک کہ بعض نے فقرے بھی چست کئے اور مذاق اُڑایا----- الحمدللہ کہ تنظیم کے لگ بھگ ساڑھے تین سو رفقاء نے جملہ تقاریر کو پورے سکون واطمینان اور کامل توجہ وانہماک کے ساتھ سنا۔ جس سے بحمداللہ اُن کے اعتماد ہی میں اضافہ ہوا----- اور کسی ایک کے دل میں بھی فرائضِ دینی کے اس جامع تصور کے بارے میں کوئی اشتباہ پیدا نہ ہوا۔ ذاتی طور پر راقم کو ان محاضرات سے دو فائدے حاصل ہوئے، ایک تو رواروی میں لکھی ہوئی عبارت میں بعض الفاظ کے بے محل استعمال سے جو مغالطے

پیدا ہوئے اُن کی اصلاح کی صورت پیدا ہوگئی اور دوسرے یہ کہ راقم کو اپنے فکر کی مجموعی تصویب مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، مولانا مفتی سیاح الدین کا کا خیلؒ، مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا سید مظفر حسین ندویؒ اور ڈاکٹر بشیر احمد صدیقیؒ ایسے اصحاب علم وفضل سے حاصل ہوئی----- جس سے ۔ متفق گردید رائے بوعلی با رائے من! کے مصداق خود راقم کے اعتماد میں اضافہ ہوا۔ **فجزاھم اللہ عنی وعن جمیع رفقاء التنظیم خیر الجزاء۔ آمین"**

اس باب کا حصہ ب بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے ۱۹۸۳ء کے ایک خطاب پر مشتمل ہے۔ پس منظر کچھ یوں ہے کہ ۱۹۸۳ء کے اوائل میں شہر کراچی کی جامع مسجد ناظم آباد، بلاک ۴، نزد ہادی مارکیٹ میں درس قرآن کا پانچ روزہ پروگرام ترتیب دیا گیا تھا جس میں بانیٔ محترمؒ نے قرآن حکیم کی دو سورتوں (سورۃ الحدید اور سورۃ الصّف) کا درس ان پانچ دنوں میں مکمل کیا۔ درس کی تکمیل کے متصلاً بعد جمعہ کا دن تھا چنانچہ محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے خطابِ جمعہ میں نہایت عام فہم اور مؤثر انداز میں ''دینی فرائض کا جامع تصور'' کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ جسے اولاً ہمارے بزرگ محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحبؒ نے ٹیپ کی ریل سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا اور کتابچہ کی صورت میں طبع کروایا۔ بعد ازاں مرکزی انجمن خدام القرآن کے مدیر شعبۂ مطبوعات محترم حافظ خالد محمود خضر صاحب نے اس کے حسنِ ظاہری ومعنوی میں مزید اضافہ کر کے نظر ثانی شدہ ایڈیشن شائع کیا-- الحمد للہ-- اس خطاب کے ستّر ہزار سے زائد نسخے طبع ہو کر بندگانِ خدا تک پہنچ چکے ہیں اور بجا طور پر اسے تنظیم اسلامی کے لٹریچر کا رکنِ رکین قرار دیا جا سکتا ہے۔ زیر نظر تالیف میں اس خطاب کی افادیت اور قوت ابلاغ کی بنا پر اسے شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس باب کے حصہ الف اور حصہ ب کے مابین اجمال اور تفصیل کی نسبت پائی جاتی ہے۔ (مرتب)

دینی فرائض کا جامع تصور

فرائض دینی کا جامع تصور

(حصہ الف۔ مختصر تحریر)

☆ تمہید: علم اور عمل

انسانی شخصیت کے دو رُخ ہیں: ایک علم دوسرا عمل---- اسلام میں علمِ صحیح کا مظہرِ اتم 'ایمان' ہے جبکہ عملِ صحیح کی اساس تصورِ فرائض پر قائم ہے۔ 'ایمان' انسان کو علمِ حقیقت ہی عطا نہیں فرماتا صحیح محرک عمل بھی دیتا ہے، اس اعتبار سے اوّلین اہمیت اسی کی ہے، چنانچہ ایمان کی ماہیت، اس کی تفاصیل، اس کے درجات، اس کے حصول کے ذرائع اور اس کے لوازم وثمرات اہم ترین موضوعات ہیں لیکن موجودہ محاضرات میں اصل بحث ان پر نہیں بلکہ 'تصورِ فرائضِ دینی' پر ہے!

☆ تین اساسی فرائض

ایک مسلمان کے 'اساسی دینی فرائض' تین ہیں:

(۱) ایک یہ کہ وہ خود صحیح معنی میں اللہ کا بندہ بنے!

☆ اس کے لئے چار اساسی اصطلاحات ہیں: اسلام، اطاعتِ خدا و رسول، تقویٰ اور عبادت۔

☆ یہ کیفیات انسان میں ہمہ تن، ہمہ وقت اور ہمہ وجوہ مطلوب ہیں نہ کہ جز وقتی---- اِلّا یہ کہ کبھی غفلت کے باعث یا جذبات کی رَو میں بہہ کر یا ماحول کے اثرات سے مغلوب ہو کر کوئی غلط حرکت سرزد ہو جائے، تو اس پر فوری توبہ اللہ کے یہاں مقبول ہو گی۔ (النساء: ۱۷)

اس کے برعکس اگر جان بوجھ کر کوئی بھی بڑا گناہ مستقل طور پر اختیار کر لیا گیا اور اس پر اصرار رہا تو اس سے نہ صرف تمام نیکیوں کے ضائع چلے جانے یعنی حبطِ اعمال کا اندیشہ ہے بلکہ اس کا بھی خطرہ ہے کہ "**المعاصی بریدُ الکفر**" کے مطابق ایمان بالکل زائل ہو جائے اور انسان **خلود فی النار** کا مستحق ہو جائے۔ اِلّا یہ کہ حقیقی اور واقعی 'اضطرار' موجود ہو۔!!

(۲) دُوسرے یہ کہ دوسروں کو حتی المقدور اسلام کی تبلیغ کرے اور دین کی دعوت دے!

☆ اس کے لئے یوں تو بے شمار اصطلاحات ہیں جیسے انذار، تبشیر، تذکیر، وعظ، نصیحت، وصیت، تعلیم، تبیین، تلقین، وغیرہ۔ لیکن اہم تر اصطلاحات چار ہی ہیں (۱) تبلیغ (۲) دعوت (۳) امر بالمعروف ونہی عن المنکر (۴) شہادت علی الناس

☆ یہ خود انسان کی اپنی شرافت ومروت کا تقاضا بھی ہے اور ابنائے نوع کی ہمدردی وخیر خواہی کا تقاضا بھی، لیکن سب سے بڑھ کر یہ سید المرسلین محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختمِ نبوت کا منطقی نتیجہ ہے کہ اب تا قیامِ قیامت تمام انسانوں پر اللہ اور اس کے رسولؐ کی جانب سے اتمامِ حجت یعنی ''شہادت علی الناس'' کی ذمہ داری بحیثیتِ مجموعی اُمّت محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کے کندھوں پر ہے!

(۳) تیسرے یہ کہ وہ اللہ کے کلمے کی سربلندی اور اس تعالیٰ کے دینِ حق کے بالفعل قیام اور غلبے کے لئے تن، من، دھن سے کوشاں ہو۔

☆ اس کیلئے قرآن حکیم کی پانچ اساسی اصطلاحات ہیں: تکبیرِ رب، اقامتِ دین، ''اِظْهَارُ دِيْنِ الْحَقِّ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ'' ''لِيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ'' اور ''لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ''۔

☆ حدیث نبویؐ میں ایک چھٹی اصطلاح وارد ہوئی ہے: ''لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا'' ------اور

☆ تین عام فہم تعبیرات ہیں: قیامِ حکومتِ الٰہیہ، نفاذِ نظامِ اسلامی، اور اسلامی انقلاب!

متذکرہ بالا تین فرائض کی باہمی نسبت اور اُن کا ایمان اور ارکانِ اسلام کے ساتھ ربط وتعلق ایک ایسی سہ منزلہ عمارت کی مثال سے خوب واضح ہو جاتا ہے جس کی----- (i) ایک زیرزمین بنیاد ہے جو نظر نہیں آتی لیکن پوری عمارت کی مضبوطی اور پائیداری کا دار ومدار اسی پر ہے۔ (ii) اسی بنیاد کا ایک حصہ زمین سے باہر ہے جو نظر آتا ہے جسے عرفِ عام میں 'کرسی' اور انگریزی میں Plinth کہتے ہیں۔ (iii) پہلی منزل پر صرف چار ستون ہیں، دیواریں تعمیر نہیں کی گئیں، ظاہر ہے کہ اُوپر کی پوری تعمیر کا وزن ان ہی کے ذریعے بنیاد تک پہنچتا ہے۔ (iv) ستونوں پر پہلی چھت قائم ہے۔ (v) دوسری چھت بھی اگرچہ ان ستونوں ہی پر قائم ہے لیکن دیواروں کی تعمیر کے باعث ستون نظر نہیں آتے۔ (v) اس کے اُوپر تیسری اور آخری چھت ہے اور اُس کا بھی معاملہ یہی ہے-----!

اس مثال میں: (ا) زیرِ زمین بنیاد----- ایمان کا ''تصدیقٌ بالقلب'' والا حصہ یعنی یقینِ قلبی ہے!

-----(ب) بنیاد کا نظر آنے والا حصہ ----- ''اقرارٌ باللّسان'' ----- یعنی کلمہ شہادت! (ج) چار ستون چار عبادات کی نمائندگی کرتے ہیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ (د) پہلی چھت اسلام، اطاعت، تقویٰ اور عبادت کی نمائندگی کرتی ہے (ھ) دوسری چھت ----- تبلیغ، دعوت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شہادت علی الناس سے عبارت ہے ____ اور (و) تیسری اور آخری چھت تکبیرِ رب، اقامتِ دین، اظہارِ دین، اعلاء کلمۃ اللہ یا قیامِ حکومتِ الٰہیہ کی مظہر ہے-----! واللہ اعلم!!

☆ تین لوازم

اِن تین اساسی فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تین لوازم لابُدَّ منہ ہیں:

(ا) دوامِ 'جہاد فی سبیل اللہ' جس کا ظہور:

☆ فریضۂ اوّل کے ضمن میں (i) نفسِ امّارہ (ii) شیطانِ لعین اور اس کی ذریتِ صلبی و معنوی اور (iii) بگڑے ہوئے معاشرے کے غلط رجحانات اور دباؤ----- کے خلاف جدّ و جہد اور زور لگانے کی صورت میں ہوتا ہے اور حدیث نبویؐ کی رُو سے یہی 'افضل الجہاد' ہے۔

☆ فریضۂ ثانی کے ضمن میں دعوت و تبلیغ کے لئے جان و مال کھپانے کی صورت میں ہوتا ہے، اور

☆ فریضۂ ثالث کے ضمن میں سر دھڑ کی بازی لگانے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر باطل کی قوتوں سے 'بالفعل' اور 'بالید' پنجہ آزمائی کی صورت میں ہوتا ہے جس کے لئے تن، من، دھن لگا دینے کا عزم، حتیٰ کہ جان دے دینے کی 'آرزو' کا ہونا لازمی ہے!

گویا جہاد کی پہلی منزل مجاہدہ مع النفس اور آخری منزل قتال فی سبیل اللہ!

واضح رہے کہ اسی کا 'منفی پہلو' ہجرت ہے، چنانچہ اس کی بھی پہلی منزل ''اَنْ تھْجُرَ مَا کَرِہَ رَبُّکَ'' ہے اور آخری یہ کہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں وقت آنے پر گھر بار، مال و منال اور اہل و عیال کو چھوڑ کر نکل جایا جائے!

جہاد کی پہلی دو منزلوں کے لئے آلہ و ہتھیار قرآن مجید ہے یعنی 'جہاد بالقرآن' چنانچہ مجاہدہ مع النفس' کا مؤثر ترین ذریعہ ہے قرآن کے ساتھ قیام اللیل یا تہجد! اور دعوت و تبلیغ کا پورا عمل بھی قرآن حکیم ہی کی اساس پر اُسی کے ذریعے ہونا چاہئے!!

تیسری اور آخری منزل پر عہدِ حاضر میں 'جہاد بالید' کی موزوں ترین صورت فواحش و منکرات کے خلاف پرامن مظاہرے ہیں، لیکن اس میں نوبت فقہاء کرام کی طے کردہ شرائط کے تحت قتال یعنی جہاد

بالسیف تک بھی آ سکتی ہے۔

(۲) لُزومِ اجتماعیت، جس کا تقاضا:

☆ فریضۂ اوّل کے ضمن میں صرف صحبتِ صالح (بفحوائے: ''كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ'') سے پورا ہوسکتا ہے۔

☆ اسی طرح فریضۂ ثانی کے ضمن میں درسگاہوں، اداروں، انجمنوں اور سوسائٹیوں سے پورا ہوسکتا ہے!

☆ اسی طرح فریضۂ ثالث کے ضمن میں 'سمع و طاعت فی المعروف' کے ٹھیٹھ اسلامی اور عسکری اصول پر مبنی جماعت کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا (اور یہی مراد ہے آنحضور ﷺ کے ان الفاظِ مبارکہ سے کہ:

''اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ.'' (رواہ احمد والترمذی عن الحارث الاشعریؓ)

(۳) بیعت ----- جو -----

☆ پہلے دو فرائض کے ضمن میں 'بیعتِ سلوک وارشاد' کی صورت میں کفایت کرتی ہے لیکن:

☆ فریضۂ ثالث کے ضمن میں 'بیعت سمع و طاعت فی المعروف' کی صورت لازمی ولابدی ہے! چنانچہ اُسی کی جانب اشارہ ہے مسلمؒ کی روایت (عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما) میں جس میں آنحضور ﷺ کے یہ الفاظ مبارکہ وارد ہوئے ہیں کہ ''مَنْ مَّاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً'' اس لئے کہ نارمل حالات میں تو دو ہی صورتیں ممکن ہیں:

(i) اگر کم سے کم شرائط و معیارات پر اُترنے والا صحیح اسلامی نظامِ حکومت قائم ہے تو اُس کے سربراہ سے بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف ہوگی ----- اور (ii) اگر ایسا نہیں ہے تو صحیح اسلامی حکومت کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعت کے امیر کے ہاتھ پر بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف ہوگی ----- تیسری ممکنہ صورت صرف ایسے عظیم اور شدید فتنے ہی کی ہوسکتی ہے جس میں حدیث نبوی ﷺ میں وارد الفاظ کے مطابق سویا ہوا شخص جاگنے والے سے بہتر ہو، بیٹھا ہوا شخص کھڑے ہونے والے سے بہتر ہو اور کھڑا رہنے والا شخص چلنے والے سے بہتر ہو! ----- **اعاذنا اللہ مِنْ ذلك**

☆ نتیجہ

(۱) انجمن خدام القرآن کا مقصد ہے 'جہاد بالقرآن' یہی وجہ ہے کہ ۷۲ء میں اس کے قیام کے وقت اس کے جو'اغراض ومقاصد' معین ہوئے وہ یہ تھے (i) عربی زبانی کی تعلیم وترویج (ii) قرآن مجید کے مطالعہ کی عام ترغیب وتشویق (iii) علومِ قرآنی کی عمومی نشرواشاعت (iv) ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم وتربیت جو'تعلیم وتعلم قرآن' کو مقصدِ زندگی بنالیں----- اور (v) ایک ایسی قرآن اکیڈمی کا قیام جوقرآن حکیم کے فلسفہ وحکمت کووقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کر سکے،اور

(۲) تنظیم اسلامی ہے 'جملہ دینی فرائض' کی انجام دہی بالخصوص اقامتِ دین یا اسلامی انقلاب کے لئے 'بیعت ہجرت وجہاد فی سبیل اللہ وسمع وطاعت فی المعروف' پرمبنی خالص دینی جماعت!!

—

فرائض دینی کا جامع تصور

(حصہ ب۔ مفصل تقریر)

تمہید

سب سے پہلے مناسب ہوگا کہ اس موضوع یعنی ''دینی فرائض کا جامع تصور'' کی اہمیت کو سمجھ لیا جائے۔ دیکھئے اگر کسی شخص کو ملازم رکھا جائے اور اسے اس کی ذمہ داریاں اور فرائض معین طور پر گن کر بتا دیے جائیں کہ مثلاً یہ دس کام یا فرائض (duties) ہیں جو آپ کو انجام دینے ہیں تو اب اگر بالفرض وہ شخص ان میں سے چار فرائض سرے سے بھول جائے اور اسے چھ ہی یاد رہیں، تو اس کے باوجود کہ وہ شخص پورے خلوص اور امکانی حد تک محنت سے ان چھ کاموں کو انجام دینے کی سعی کرے اور اس میں کامیاب بھی ہو، لیکن جو چار فرائض اسے یاد ہی نہیں رہے تو ظاہر ہے کہ وہ ان کو بجا نہیں لا سکتا، اور کوئی عجب نہیں کہ یہی اہم ترین فرائض ہوں۔ اس لیے میں اِن شاء اللہ کوشش کروں گا کہ دینی فرائض کا ایک جامع ترین تصور آپ کے سامنے پیش کروں۔

انسانی عمل کے دو محرکات

انسان کے عمل میں دو علیحدہ علیحدہ چیزیں محرک کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ ایک نیت و ارادہ اور دوسری فرائض کا صحیح شعور اور تصور۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کو اس کی توحید کے اثبات اور شرک کے اجتناب کے ساتھ مانا ہے۔ جناب حضرت محمد ﷺ پر ہمارا ایمان ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر یہ کہ بعث بعد الموت اور محاسبۂ اُخروی پر بھی ہمارا کامل یقین ہے۔ تو اس ایمان و تسلیم اور ایقان و تصدیق کا لازمی اور منطقی تقاضا یہ ہوگا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا جو حکم ملے وہ سر آنکھوں پر۔ اس کی بڑی اہمیت ہے، اس لیے کہ اگر یہ نیت اور ارادہ ہی نہ ہو تو آگے قدم اُٹھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ گویا اعمالِ انسانیہ میں ''ارادہ'' کو بنیادی مقام حاصل ہوتا ہے۔

آپ کو شاید معلوم ہو کہ اسی لفظ ارادہ سے اسم فاعل ''مرید'' بنتا ہے۔ ہمارے یہاں تزکیۂ نفس کا جو نظام عرصۂ دراز سے چلا آ رہا ہے اس کا نقطۂ آغاز ہی یہ لفظ ''مرید'' ہے۔ ''مرید'' سے مراد وہ فرد ہے جو اس بات کا ارادہ کر لے کہ وہ دین پر چلے گا۔ اس مقصد کے لیے وہ کسی ایسے شخص سے اپنا تعلق جوڑتا ہے جس پر اسے اعتماد

ہو کہ یہ شخص مخلص ہے‘ دکاندار نہیں ہے۔ مزید برآں یہ اطمینان بھی ہو کہ یہ دین کو جاننے والا اور بذاتِ خود پابندِ شریعت اور متقی شخص ہے‘ اور یہ کہ اس کی صحبت میں اس کو دین پر چلنے میں تقویت حاصل ہوگی۔ ارادہ تو اس کا اپنا ہوتا ہے‘ لیکن اس کے لیے تقویت بھی ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے وہ کسی متقی و دین دار عالم کو اپنا مرشد تسلیم کر کے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے‘ یعنی بیعت کر کے یہ قول وقرار اور عہد کرتا ہے کہ وہ اپنے اس مرشد کی ہدایات پر عمل پیرا ہوگا اور دین پر چلے گا۔ اس تشریح سے معلوم ہوا کہ ''مرید'' وہ شخص ہے جو دین پر کاربند ہونے کے ارادے سے کسی صاحب حال سے تعلق استوار کرے۔ اور جس سے تعلق قائم کیا جائے وہ مزکی و مربی اور مرشد کہلاتا ہے‘ جس کے لیے فی الوقت ہمارے ہاں عام طور پر لفظ ''پیر'' مروّج ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم نے اپنی بےعملیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے جہاں دین کی بہت سی باتوں اور بہت سے کاموں کو بدنام کر رکھا ہے‘ وہاں پیری مریدی کے سلسلے کو بھی سخت بدنام کیا ہے۔ پھر واقعتاً یہ سلسلہ ہمارے معاشرے میں خالص دکانداری اور محض رسم بن کر رہ گیا ہے۔ اِلّا ماشاءاللہ!

حاصل گفتگو یہ نکلا کہ پہلی ضروری چیز اپنا ارادہ ہے‘ لیکن اتنی ہی ضروری چیز یہ ہے کہ یہ صحیح تصور بھی موجود ہو کہ دین کے حقیقی فرائض کیا ہیں! اگر فرائض کا تصور محدود یا ناقص ہوگا تو جو چیزیں کسی کو معلوم ہیں ان پر تو وہ عمل کرلے گا لیکن جو چیزیں اسے معلوم ہی نہیں ہیں‘ ان پر ارادے کے باوجود وہ عمل کیسے کر سکے گا؟ چنانچہ میں آج کی اس صحبت میں اس دوسری بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے دینی فرائض کا صحیح اور جامع تصور کیا ہے‘ تاکہ پورے دین کا مکمل نقشہ ہمارے سامنے موجود ہو اور ہم صحیح طور پر اپنا جائزہ لے سکیں کہ دین کے کتنے حصے پر ہم عمل پیرا ہیں اور کتنی چیزوں پر عمل نہیں کر رہے! اور کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ جن چیزوں پر عمل ہم نے چھوڑ رکھا ہے وہی چیزیں دینی لحاظ سے اہم ترین ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مغز سرے سے موجود ہی نہ ہو اور ہم صرف چھلکا پکڑے بیٹھے ہوں! شاید آپ نے یہ لطیفہ سنا ہو کہ جب پہلے پہل چائے یورپ گئی تو وہاں لوگ یہ کرتے تھے کہ چائے ابال کر پانی پھینک دیتے تھے اور پتی کھاتے تھے۔ تو کہیں ہمارا حال یہ تو نہیں ہے کہ دین کی اصل ذمہ داریوں اور دین کے اصل فرائض سے صرفِ نظر ہو رہا ہو‘ وہ سرے سے ہماری نگاہوں کے سامنے ہی نہ ہوں اور ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ ہم دیندار ہیں اور پورے دین پر عمل پیرا ہیں! اس کا ازالہ اگر ہوگا تو اسی طرح کہ ہمارے سامنے دین کا پورا خاکہ اور دینی فرائض کا جامع تصور موجود ہو۔

میرا تصورِ فرائضِ دینی

قرآن مجید اور سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے محدود معروضی مطالعے سے اس ضمن میں مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جو فہم حاصل ہوا ہے اور جس پر میں اپنی استعداد کے مطابق اور امکان بھر عمل پیرا ہوں، میں وہی آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ یہ کوئی دعویٰ نہیں، کوئی تعلّی اور ادعاء نہیں، صرف اظہارِ واقعہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میرے مطالعے اور فہم میں بھی کوئی کمی، نقص اور تقصیر ہو۔ کوئی بات آج میرے علم میں نہ ہو، کل آ جائے۔ جب بھی وہ علم میں آئے گی اِن شاء اللہ العزیز اسے بھی بیان کردوں گا۔ لیکن آج کی تاریخ تک قرآن حکیم، سنت و سیرت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور سیر صحابہؓ کے مطالعے سے اور اس اُمت کی پوری تاریخ پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد دینی فرائض کا جو صحیح و جامع تصور میرے سامنے آیا ہے، اس کو میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

فرائضِ دینی اور اِن کے لوازم

اس ضمن میں تین باتیں تو بنیادی و اساسی ہیں اور تین ہی ان کے لوازم ہیں۔ یہ کُل چھ باتیں ہوں گی۔ تین بنیادی و اساسی باتوں کے متعلق میں چاہتا ہوں کہ ابتداءً بھاری بھرکم اصطلاحات سے ہٹ کر ان کو عام فہم انداز میں آپ کے سامنے پیش کروں۔ اس میں شک نہیں کہ اصطلاحات کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور ہر علم اور ہر فن کا اصل اور حقیقی فہم انہی اصطلاحات کے حوالے سے حاصل ہوتا ہے۔ آپ فزکس نہیں سمجھ سکتے جب تک آپ کی گرفت میں اس کی بنیادی اصطلاحات (basic terminologies) نہ آ جائیں۔ اسی طرح ہمارے دین کی بھی اصطلاحات ہیں جن کا سمجھنا ضروری ہے۔ لیکن میں چاہوں گا کہ پہلے ان اصطلاحات سے ذرا ہٹ کر بات اصولاً سمجھ لی جائے۔

ان تین بنیادی و اساسی باتوں میں سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم خود دین پر عمل پیرا ہوں، اس پر کاربند ہوں۔ دوسری بات یہ کہ ہم دین کو پھیلائیں۔ اور تیسری یہ کہ ہم دین کو قائم کریں۔ یہ ہیں تین بنیادی و اساسی باتیں۔ اب ان تینوں کو علیحدہ علیحدہ بھی سمجھ لیجیے۔

پہلا فریضہ ---- دین پر کاربند ہونا

پہلی بات کے لیے اب دینی اصطلاحات نوٹ کیجیے۔ تھوڑے سے فرق سے اس کے لیے چار اصطلاحات ہیں: اسلام، اطاعت، تقویٰ اور عبادت۔

(۱) **اسلام**: سب سے پہلی اصطلاح خود ''اسلام'' ہے۔ اسلام کا معنی ہے گردن نہادن، سرِتسلیم خم

کر دینا۔ انگریزی زبان میں اس کی تعبیر یوں ہوگی کہ to give up resistance اور to surrender۔ مفہوم یہ ہوا کہ سر جھکاؤ' سرِ تسلیم خم کرو اور جو بھی حکم ملے اسے بلا چون و چرا قبول کرو۔ اس رویے کا نام ہے اسلام----- اور اس ''اسلام'' کے لیے قرآن کا تقاضا یہ ہے:

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً﴾ (البقرۃ: ٢٠٨)

''اے ایمان لانے والو! تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔''

اس میں داخلہ جزوی طور پر نہیں ہو سکتا کہ کچھ احکام پر تو سرِ تسلیم خم ہے اور کچھ احکام پر عمل کرنے سے انکار و اعراض' سرتابی اور سرکشی! اس کا نام اسلام نہیں ہے۔ یہاں تو اصول یہ ہے کہ ماننا ہے تو پورا مانو' ورنہ چھوڑو اور دفع ہو جاؤ۔ (Take it all or leave it all) یہاں بیچ بیچ کی بات نہیں چلے گی۔

(٢) **اطاعت** : یہ اسی طرزِ عمل کے لیے دوسری اصطلاح ہے۔ اب معاملہ ذرا آگے بڑھ گیا ہے۔ لفظ اسلام میں تو مقاومت و مخالفت (resistance) ترک کر کے خود کو حوالے (surrender) کر دینے کا مفہوم تھا' جبکہ اطاعت کا لفظ ''طوع'' سے بنا ہے' جس کا معنی ہے دلی آمادگی۔ اردو میں ہم ''بطوعِ خاطر'' کے الفاظ بولتے اور لکھتے ہیں۔ گویا دلی آمادگی کے ساتھ فرماں برداری قبول کر لینے کے رویے کا نام اطاعت ہے۔ اور اس کے لیے اصول یہ ہے:

﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۲﴾﴾ (التغابن)

''اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی' اور اگر تم روگردانی کرتے ہو تو جان لو کہ ہمارے رسول پر سوائے واضح طور پر (ہدایات و تعلیماتِ ربّانی) پہنچانے کے اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔''

یہاں بھی وہی انداز ہے جو میں اسلام کے ضمن میں عرض کر چکا ہوں' یعنی یہاں بھی ''all or none law'' کارفرما ہے۔ ہمارے نبیؐ کے ذمہ پہنچانا تھا' سو انہوں نے پہنچا دیا' اب تم اپنا رُخ کسی اور طرف کرنا چاہتے ہو' اس دعوت سے اعراض اختیار کرنا چاہتے ہو تو تم اپنی اس سرتابی و سرکشی کے خود ذمہ دار ہو گے۔ تو اسلام اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً کے تقاضے اور اطاعت کے مطالبے کے ساتھ مطلوب ہے۔ پھر یہ اطاعت بھی ہمہ تن اور ہمہ جہت درکار ہو گی۔ یہاں بھی یہ نہیں ہو گا کہ کچھ حکم مانیں گے اور کچھ حکم نہیں مانیں گے۔

(٣) **تقویٰ** : اس ضمن میں یہ تیسری اصطلاح ہے۔ اسلام اور اطاعت انسان کے مثبت رویے اور طرزِ عمل کے مظاہر ہیں۔ ان ہی کو منفی اسلوب سے بیان کیا جائے گا تو وہ ہوگا ''تقویٰ''۔ اس کا مفہوم ہے اللہ

تعالیٰ کے احکام کو توڑنے سے بچنا‘اس کی نافرمانی سے احتراز کرنا‘اس کی ناراضی کا خوف رکھنا‘اس کی سزا سے ڈرنا‘اس سے بچنے کی کوشش کرنا۔اس کے لیے تراجم میں ’’پرہیزگاری‘‘ کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے اور ’’ڈرنا‘‘ بھی‘لیکن کسی اصطلاح کے ایک لفظ میں ترجمہ سے اس کا صحیح اور مکمل مفہوم ادا نہیں ہوتا۔سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا:

﴿یٰۤاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾﴾

’’اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے‘اور تم کو ہرگز موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔‘‘

سورۂ آل عمران کی اس آیت مبارکہ میں سلبی رویہ ’’تقویٰ‘‘ اور مثبت رویہ ’’اسلام‘‘ دونوں کا ذکر نہایت جامعیت کے ساتھ آیا ہے۔

(۴) **عبادت:** اس ضمن میں یہ چوتھی اصطلاح ہمہ گیر اور جامع ترین بلکہ اصل اصطلاح ہے۔ یہاں بات اور آگے بڑھی۔ دینی اعتبار سے لفظ عبادت کا اصطلاحی مفہوم ہوگا ’’کسی کی محبت سے سرشار ہو کر ہمہ تن‘ہمہ وجوہ اور ہمہ وقت اس کی بندگی میں اپنے آپ کو دے دینا۔‘‘ قرآن حکیم میں انسان کی تخلیق کا مقصد ہی اللہ کی عبادت قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ الذاریات میں الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾

’’میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔‘‘

گویا انسان کا مقصدِ حیات ہی بندگی ہے‘غایتِ تخلیق ہی بندگی ہے۔

’’عبادت‘‘ کے مفاہیم و معانی اور مقتضیات و مقدرات پر اس سے قبل بارہا گفتگو ہوئی ہے‘آج ان سب کو جامعیت کے ساتھ آپ کے سامنے بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔عربی کے لفظ عبادت کا مفہوم فارسی کے دو الفاظ کو‘جو اردو میں بھی مستعمل ہیں‘جمع کر کے ادا کیا جا سکتا ہے۔ وہ دو الفاظ ہیں بندگی اور پرستش۔ بندگی میں اطاعت کا پہلو ہے اور پرستش میں محبت کا! بندہ کے معنی ہیں غلام —— اور غلام ہمہ وقت اور ہمہ تن غلام ہوتا ہے۔ غلامی اور ملازمت میں یہی تو فرق ہے کہ ملازمت کسی معین کام کے لیے ہوتی ہے۔ مثلاً جو شخص جھاڑو دینے پر ملازم ہے وہ جھاڑو ہی دے گا‘ کوئی اور کام تو نہیں کرے گا۔ اسی طرح جو باورچی کی حیثیت سے ملازم ہے وہ آپ کے گھر کا فرش تو صاف نہیں کرے گا۔ پھر ملازمت معین وقت کے لیے ہوتی ہے۔ ملازم سے یہ طے کیا جاتا ہے کہ اسے چار گھنٹے کام کرنا ہے یا چھ یا آٹھ گھنٹے۔ اس کے بعد وہ

آپ کا ملازم نہیں۔ لیکن غلامی یا بندگی ہمہ وقت اور ہمہ تن ہوتی ہے۔ شیخ سعدیؒ نے بہت خوبصورتی سے شعر کے پیرائے میں اس مفہوم کی ترجمانی کی ہے کہ : ؎

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

پس ذہن میں رکھئے کہ بندگی کے معنی ہیں ہمہ وقت' ہمہ تن اور ہمہ وجوہ اطاعت۔ لیکن محض بندگی یا غلامی ''عبادت'' نہیں ہے جب تک کہ اس میں پرستش شامل نہ ہو۔ پرستش میں محبت کا جذبہ ہوتا ہے۔ زر پرست وہ ہے جس کو مال سے انتہائی محبت ہو۔ وطن پرست' قوم پرست اور شہرت پرست جیسے الفاظ ہمارے ہاں کثرت سے مستعمل ہیں۔ پرستش اور پرستاری ہمارے جانے پہچانے الفاظ ہیں۔ ''پرستار'' ہم بولتے ہیں ''انتہائی محبت کرنے والے'' کے معنی و مفہوم میں۔ چنانچہ عبادت کا مفہوم ہو گا اللہ کی بندگی اور اس کی پرستش۔

جزوی اطاعت قابل قبول نہیں: یہ چار اصطلاحات ہیں جن سے دین کا پہلا اور بنیادی تقاضا ہمارے سامنے آتا ہے۔ لیکن اس ضمن میں اصل شے سمجھنے کی یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے کو اللہ کی اطاعت کے دائرے میں لانے کا نام بندگی ہے۔ اسلام میں جزوی اطاعت کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے' اس کا مطالبہ کلی اطاعت ہے ـــــ اس ضمن میں ایک آیت میں آپ کو سنا چکا ہوں' یعنی: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً﴾۔ ایک دوسری آیت اور ملاحظہ کیجیے جس سے یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس آیت میں خطاب یہود سے ہے' لیکن یہ بات جان لیجیے کہ اللہ کی سنت تبدیل نہیں ہوتی۔ یہود کو قرآن نے اُمت مسلمہ کے لیے نشانِ عبرت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اگر اُمت مسلمہ بھی یہ روش اختیار کرتی ہے جس کا تذکرہ اس آیت میں یہود کے حوالے سے کیا گیا ہے تو پھر ان کے لیے بھی وہی سزا ہو گی جس کے مستحق یہود قرار دیے گئے تھے۔ فرمایا:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰۤى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾﴾ (البقرۃ)

''کیا تم (ہماری) کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کا انکار کرتے ہو؟ پس تم میں سے جو کوئی بھی یہ حرکت کرے گا اس کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا میں اسے ذلیل و خوار کر دیا جائے' اور قیامت کے دن انہیں شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے گا' اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔''

یہ وعید اس لیے ہے کہ یہ طرزِ عمل کہ کچھ باتوں کو ماننا اور کچھ کو نہ ماننا' اس کے ڈانڈے درحقیقت منافقت سے جڑ جاتے ہیں۔ یہ دو عملی ہے' دو رنگی ہے' یہ دو رُخا کردار ہے' جبکہ اللہ کو یک رنگی درکار ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿صِبْغَةَ اللهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً﴾ (البقرة:۱۳۸) ''(ہم نے تو) اللہ کا رنگ (اختیار کرلیا ہے)' اور اللہ کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہوسکتا ہے؟'' پس دورنگی منافقت ہے اور منافقت وہ روگ ہے جس کے بارے میں قرآن حکیم نے صراحت کی ہے کہ:

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾﴾ (النساء)

''یقیناً منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں رہیں گے' اور وہ اپنے لیے کوئی مددگار نہیں پائیں گے۔''

جن حضرات کو بھی قرآن مجید سے تھوڑا بہت شغف ہے' وہ اس بات کو جانتے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کا غضب کافروں پر اتنا نہیں بھڑکتا جتنا منافقوں پر بھڑکتا ہے۔ سورۃ الصّف میں ہم نے ان دو آیات کا مطالعہ بھی کیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲﴾ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۳﴾﴾

''اے اہل ایمان! وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ یہ بات اللہ کے نزدیک سخت بیزاری پیدا کرنے والی ہے کہ تم جو کہو اس کو کرو نہیں!''

ہم اپنے آپ کو کہتے ہیں مسلم —— اور مسلم کا معنی ہے مطیع فرمان۔ جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اللہ کے احکام کو اُٹھا کر پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بندے ہیں۔ بندے کا معنی ہے غلام۔ اس حیثیت سے ہمیں اللہ کے تمام احکام ماننے چاہئیں' ان پر عمل کرنا چاہیے۔ جس کو اس نے حرام ٹھہرایا ہے اسے ترک کرنا چاہیے اور جن چیزوں کو واجب اور فرض قرار دیا ہے ان کو ادا کرنا چاہیے۔ اگر ہم اللہ کے ان احکام کو جو ہمیں پسند نہ ہوں' پس پشت ڈال دیں تو ہم پر یہ بات بالکل صادق آئے گی کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ!!

<u>ارکانِ اسلام اور ان کی اہمیت</u>: ہماری اب تک کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ دین کے تقاضوں میں سے پہلا تقاضا اسلام پر کاربند اور عمل پیرا ہونا ہے۔ اس کے لیے چار اصطلاحات ہیں: (۱) اسلام (۲) اطاعت (۳) تقویٰ (۴) عبادت۔ ان میں جامع ترین اصطلاح عبادت ہے' جس کا مفہوم ہمہ تن' ہمہ وقت اور ہمہ جہت بندگی اور پرستش ہے' یعنی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر کلی اطاعت!

اب میں چاہوں گا کہ ضمیمہ (Appendix) کی حیثیت سے اس کے ساتھ یہ بات جوڑ لیجیے کہ یہ کام

آسان نہیں ہے‘ بڑا مشکل ہے۔اسی لیے تو علامہ اقبال نے کہا تھا کہ: ؎

چوں می گویم مسلمانم بہ لرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را!

یعنی میں جب یہ کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو مجھ پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے‘ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ ’’لا الٰہ الاّ اللہ‘‘ کہنے سے کیا لازم آتا ہے! جو اس کی حقیقت سے واقف نہیں انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا‘ لیکن جن کو اس کلمے کے تقاضوں اور مطالبوں کا علم ہے وہ تو واقعتاً یہ کلمہ زبان سے ادا کرتے ہوئے کانپ اُٹھتے ہیں۔لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ کرم فرمایا کہ اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے چار عبادات عطا فرما دیں‘ جنہیں ارکانِ اسلام بھی کہا جاتا ہے۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ : شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَحَجِّ الْبَيْتِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ)) (۱)

’’اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندے اور رسول ہیں‘ نماز قائم کرنا‘ زکوٰۃ ادا کرنا‘ بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔‘‘

ہر شخص شہادتین کی ادائیگی سے اسلام میں داخل ہوتا ہے۔یہ گویا بنیاد اور فاؤنڈیشن ہے۔عملی ستون چار ہیں: نماز‘ زکوٰۃ‘ حج بیت اللہ اور رمضان کے روزے۔ان ہی کو ہم ’’عبادات‘‘ کہہ دیتے ہیں‘ اگرچہ پورے قرآن مجید میں ان کے لیے لفظ ’’عبادت‘‘ کہیں نہیں آیا۔عبادت کا لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے جس کی تشریح میں نے کی ہے۔یعنی یہ کہ انسان ہمہ وقت‘ ہمہ تن‘ ہمہ جہت اللہ کی محبت سے سرشار ہو کر اس کی بندگی اور پرستش کرے۔لیکن یہ ’’عبادات‘‘ اس فریضۂ عبادتِ ربّ کے لیے انسان کو تیار کرتی ہیں اور اس راہ کی رکاوٹوں کو دُور کرنے میں اس کی مدد و معاون ہوتی ہیں۔چنانچہ نماز کا نظام اس لیے عطا ہوا کہ دن میں پانچ مرتبہ اپنی مصروفیات سے نکلو اور اللہ کے روبرو کھڑے ہو کر اپنے قول و قرار ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ (الفاتحۃ) کی تجدید کرو اور اپنے ایمان کو تازہ رکھو۔لہٰذا فرمایا گیا: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝﴾ (طٰہٰ) ’’نماز قائم کرو میری یاد کے لیے‘‘۔کہیں مصروفیات میں گم ہو کر اپنے ربّ کو بھول نہ جاؤ۔زکوٰۃ کی عبادت اس لیے مرحمت فرمائی ہے کہ مال کی محبت کو دل سے کھرچا جا سکے‘ جو بڑی تباہ کن شے

(۱) صحيح البخاری‘ كتاب الايمان‘ باب بنی الاسلام علی خمس۔ وصحيح مسلم‘ كتاب الايمان‘ باب بيان اركان الاسلام ودعائمه العظام۔ واللفظ له۔

ہے اور سوا اَمراض کا ایک مرض ہے۔ روزہ اس لیے فرض ہوا کہ ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ ''تا کہ تم پرہیز گار بن جاؤ!'' نفس کا گھوڑا بڑا منہ زور ہے اس کو لگام دینے اور قابو میں رکھنے کی روزوں کے ذریعے تربیت حاصل ہو جائے اور اس کے بے محابا تقاضوں سے بچا جا سکے۔ اور حج کے اندر یہ تمام برکات جمع کر دی گئیں۔ اس میں ذکر بھی ہے' طواف بھی ہے۔ اس میں احرام کی پابندیاں بھی ہیں جو روزے سے مشابہ ہیں۔ اس میں پیسے کا خرچ بھی ہے جو زکوٰۃ کے مشابہ ہے —— تو یہ چار ارکانِ اسلام یا چار عبادات اس لیے فرض کی گئیں تا کہ اسلام کی چھت ان ارکان یعنی ستونوں پر استوار ہو جائے۔ یہ ارکانِ اسلام عبادتِ کلی کے لیے سہارے اور support کا کام انجام دیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے یہ تسہیل فرمائی ہے اور ہمارے لیے یہ آسانی فراہم فرمائی ہے۔ یہاں پہلی بات سے متعلق گفتگو ختم ہوئی۔ اب آیئے دوسری بات کی طرف!

دوسرا فریضہ --- دین کو دوسروں تک پہنچانا

میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارا دوسرا فرض اور ہماری دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اسلام کو پھیلائیں۔ پہلی ذمہ داری تو یہ ہے کہ ہم اس پر خود عمل پیرا ہوں' اس پر کاربند ہوں۔ لیکن دوسرا فرض اور دوسری ذمہ داری اسلام کو پھیلانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس ذمہ داری کے لیے بھی کئی اصطلاحات ہیں' لیکن چار کو ضرور ذہن نشین کر لیا جائے۔

(۱) **تبلیغ**: یعنی پہنچانا۔ دوسروں تک پہنچائیں گے تو اسلام پھیلے گا۔ رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (المائدہ: ٦٧)

''اے رسولؐ! پہنچا دو جو کچھ نازل ہوا ہے آپؐ پر آپؐ کے ربّ کی طرف سے۔''

اور رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دے دیا: ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَةً)) [۱] ''پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت''۔ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے یہ فرما کر تبلیغ کی ذمہ داری تا قیامِ قیامت اُمت کے سپرد فرما دی کہ: ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ)) [۲] ''اب پہنچائیں وہ جو یہاں موجود ہیں ان کو جو موجود نہیں ہیں''۔

(۲) **دعوت**: یعنی لوگوں کو اسلام کی طرف بلانا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾

(حٰمٓ السجدة: ٣٣)

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب ما ذکر عن بنی اسراء یل۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الحج' باب الخطبة ایام منی۔ وصحیح مسلم' کتاب القسامة والمحاربین والقصاص والدیات۔ باب تغلیظ تحریم الدماء والاعراض والاموال۔

''اور اس شخص سے بہتر بات کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف بلاتا ہو!''
اور:
﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ (النحل : ۱۲۵)
''پکارو اپنے ربّ کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ اور موعظہ حسنہ کے ساتھ اور ان (کج بحثوں) سے مجادلہ کرو اس طور پر جو بہت عمدہ ہو۔''

(۳) **امر بالمعروف و نهی عن المنکر** : یہ اصطلاح بڑی اہم ہے۔ امر بالمعروف کا مطلب ہے نیکی کا پرچار' نیکی کی تلقین' نیکی کا حکم۔ اور نہی عن المنکر سے مراد ہے بدی اور بُرائی سے لوگوں کو روکنا' بدی اور بُرائی کی اشاعت کے آڑے آنا۔ اور اگر قوت و طاقت میسر ہو تو بدی اور بُرائی کو بزور روکنا۔ اس کے لیے حدیث میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

((مَنْ رَاٰی مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ' وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ))(۱)

''تم میں سے جو کوئی بھی کسی منکر کو دیکھے اس کا فرض ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے (یعنی طاقت سے) بدلے۔ اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے (یعنی تلقین و نصیحت سے اس بُرائی کو روکے)۔ اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنے دل سے (اس کے خلاف نفرت کا اظہار کرے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

یعنی کم از کم دل میں کڑھن تو ہو۔ اگر یہ کڑھن بھی نہ ہو تو اس کیفیت کے لیے دوسری حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:

((......وَلَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ))(۲)

''......اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی موجود نہیں۔''

یعنی تم بدی کو دیکھو' منکر کو دیکھو اور تمہارے احساسات پر جوں بھی نہ رینگنے پائے۔ بُرائی کو دیکھتے ہوئے گزر جاؤ لیکن یہ صدمہ بھی نہ ہو کہ یہ کیوں ہو رہا ہے' کیوں میرے ہاتھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ میں اس کو روک سکوں! اگر یہ کیفیت ہے تو جان لو کہ ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی دل میں موجود نہیں۔ اور یہ فتویٰ

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النهی عن المنکر من الایمان...... عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ۔
(۲) ایضاً ۔ عن عبد اللّٰہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

کس کا ہے؟ یہ حقیقی مفتیٔ اعظم محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا فتویٰ ہے۔ ان کا فتویٰ کون ردّ کرے گا؟ اور اگر ردّ کرے گا تو کیا ایمان سلامت رہ جائے گا؟

(۴) **شهادت على الناس**: یہ چوتھی اصطلاح جامع ترین ہے۔ شہادت علی الناس کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں پر حجت قائم کر دینا تا کہ قیامت کے دن عدالتِ خداوندی میں گواہی دے سکو اور testify کر سکو کہ پروردگار! ہم نے تیرا دین پہنچا دیا تھا۔ یہ وہ اصطلاح ہے کہ یہاں آ کر تبلیغ و دعوت کا تعلق کارِ رسالت سے جا کر جڑ جائے گا ـــــ رسول کیوں بھیجے گئے؟ اس کو سورۃ النساء کی آیت ۴۱ سے سمجھئے جہاں فرمایا:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾﴾

''پس اُس دن کیا حال ہوگا جس دن ہم ہر اُمت میں سے (اُس پر) ایک گواہ کھڑا کریں گے اور (اے نبیؐ) آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے ان کے خلاف!''

کیوں؟ اس لیے کہ رسول یہ گواہی دیں گے کہ اے ربّ! میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا تھا۔ اب اپنے اعمال و افعال کے یہ لوگ خود ذمہ دار ہیں ـــــ اب بتایئے کہ یہ گواہی ہمارے حق میں جائے گی یا خلاف؟ ظاہر ہے یہ گواہی خلاف جا رہی ہے۔ عدالتِ خداوندی میں رسول دراصل استغاثہ کے گواہ (Prosecution witness) ہوں گے۔ وہ کہیں گے کہ اے پروردگار! میں نے تیرا پیغام بے کم و کاست ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا' اب ان کی ذمہ داری تھی کہ یہ تیرا پیغام بنی نوعِ انسان تک پہنچا کر ان پر حجت قائم کریں۔

سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا کہ ہم نے جو تمہیں اُمتِ وسط یعنی بہترین اُمت بنایا ہے تو یہ اسی فریضہ شہادت علی الناس کی ادائیگی کے لیے ہے۔

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ﴾ (آیت ۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانی اُمت (بہترین اُمت) بنایا' تا کہ تم گواہ ہو جاؤ پوری نوعِ انسانی پر اور رسولؐ گواہ ہو جائیں تم پر۔''

عبادتِ ربّ کے بعد شہادت علی الناس کی یہ دوسری اہم ذمہ داری ہے جو اُمت کے سپرد کی گئی۔ اس کی نزاکت کو جان لیجیے۔ اگر رسول بالفرض اللہ کا پیغام نہ پہنچاتے تو اللہ کے ہاں وہ مسئول اور ذمہ دار ہوتے! انہوں نے پہنچا دیا لہٰذا وہ بَری ہو گئے اور باقی دنیا کو پہنچانے کی ذمہ داری اُمت کے حوالے کر کے

تشریف لے گئے۔ اس لیے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ پوری نوعِ انسانی کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے‘صرف عرب کے لیےتونہیں۔ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا﴾ (سبا:۲۸)اور:﴿قُلۡ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعًا﴾ (الاعراف:۱۵۸) اور:﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۰۷﴾﴾ (الانبیاء)— باقی دنیا کوکون پہنچائے گا؟اس کے متعلق میں عرض کر چکا کہ حجۃ الوداع میں آنحضور ﷺ نے فرمادیا کہ اب یہ کام تمہارے ذمے ہے۔میں نے تمہیں پہنچادیا‘اب تم ان کو پہنچاؤ جو یہاں نہیں ہیں۔

یہاں یہ بات مزید سمجھ لیجیے کہ یہ صرف اُس وقت کی دنیاوالوں کا معاملہ نہیں تھا۔اب تو دائمی رسالتِ محمدی کا دَور ہے (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)۔اب تا قیامِ قیامت بنی نوعِ انسان کے لیے شہادت علی الناس کی ذمہ داری کون ادا کرے گا؟ یہ ذمہ داری اُمت محمد کی ہے (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)۔اگر اُمت یہ فریضہ ادانہیں کرتی تو جان لیجیے کہ دنیا کی گمراہی کا وبال اُس کے سر آئے گا۔آپ یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا اُمتی ہونے سے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی کریڈٹ مل جائے گا!میں آپ کو دوسرا رُخ دکھا رہا ہوں۔ یہ تو اتنی بڑی ذمہ داری ہے کہ اگر آپ اسے ادانہیں کرتے تو دنیا کی ضلالت اور گمراہی کا وبال بھی آپ کے ذمہ آئے گا۔بنی نوع انسان عدالت اُخروی میں یہ عذر پیش کرنے میں بڑی حد تک حق بجانب ہوں گے کہ اے اللہ!ان کے پاس تیری آخری اور مکمل کتاب تھی‘ان کے پاس تیرا دین تھا‘یہ تیری شریعت کے علمبردار تھے‘یہ تیرے آخری نبی اور رسول کے اُمتی تھے‘انہوں نے اس دین کو نہ ہم تک پہنچایا اور نہ خود اس پر عمل کیا۔یہ تیری آخری کتاب اور آخری نبیؐ کی تعلیمات پر خزانے کے سانپ بن کر بیٹھے رہے۔

میں آپ کی نصح وخیر خواہی کا حق ادانہیں کر پاؤں گا اگر میں آپ کو متنبہ نہ کردوں کہ اگر آپ کا طرزِعمل یہ ہوگا تو آخرت میں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔خدارا مجھے بتایئے کہ اللہ ربّ العزت کی عدالت میں جب ہم سے یہ سوال ہوگا کہ تم ہمارے آخری نبی ورسول جناب محمد ﷺ کے اُمتی تھے‘ تمہارے پاس ہمارا دین تھا‘ تم حاملِ قرآن تھے‘ ہم نے چینیوں اور امریکیوں کو اپنا دین نہیں دیا تھا بلکہ اس کا وارث تم کو بنایا تھا اور یہ تمہاری ذمہ داری لگائی تھی کہ ان تک ہمارا دین پہنچاؤ‘ ہم نے محمد ﷺ کو روسیوں میں مبعوث نہیں کیا تھا‘ان تک پہنچانا تمہارے ذمے تھا‘ تو ہمارے پاس کیا جواب ہوگا؟ دوسروں تک دین نہ پہنچانے کی ذمہ داری ہم پر ہوگی یا نہیں؟ تو یہ ہے دوسری ذمہ داری جسے میں نے چار اصطلاحات کے حوالے سے بیان کیا

ہے۔اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم دوسروں تک تو کیا پہنچائیں گے‘آج ہم خود محتاج ہیں کہ صحیح دین ہم تک پہنچے۔ہم تو‘ اِلاّ ماشاءَ اللّٰہ‘پیدائشی طور پر (by birth) اور نام کے مسلمان ہیں کہ علامہ اقبال کے بقول: ؎

یوں تو سیّد بھی ہو‘ مرزا بھی ہو‘ افغان بھی ہو!
تم سبھی کچھ ہو‘ بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

تیسرا فریضہ---- دین کو قائم کرنا

اب آیئے تیسری ذمہ داری کی طرف —— یعنی یہ کہ دین کو قائم کیا جائے۔ایک ہے تبلیغ ودعوت یعنی دین کو پھیلانا‘ اسے دوسروں تک پہنچانا‘ اس کی طرف لوگوں کو بلانا اور ایک ہے اسے قائم وغالب کرنا۔ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔اسلام اگر ایک مکمل نظامِ حیات ہے‘ جیسا کہ فی الواقع وہ ہے ﴿اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ ﴾ تو اسے بالفعل قائم کیا جانا چاہیے۔ہم یہ بات بڑے فخر سے کہا کرتے ہیں کہ ہمارا دین ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔آج پاکستان میں شاید ہی کوئی پڑھا لکھا شخص ایسا ہو جو یہ بات نہ جانتا ہو اور نہ کہتا ہو۔یہ فکر بڑا عام ہے۔کم از کم ہمارے دروس وخطابات کے سامعین اور ہمارے لٹریچر کے قارئین میں سے تو کوئی شخص ایسا نہیں ہوسکتا جو اس بات کو جانتا نہ ہو۔تو اگر یہ دین ایک مکمل نظامِ حیات ہے تو اس کو قائم کیوں نہیں کرتے! یہ صرف تبلیغ وتلقین کی خاطر‘ یا محض تحقیقی مقالے لکھنے اور چھاپنے کی غرض سے‘ یا مدح سرائی کرنے اور قصیدے کہنے کے لیے تو نہیں ہے۔نظام اگر بالفعل قائم ہو تو اسے نظام کہا جائے گا‘ ورنہ وہ نظام ہے ہی نہیں۔پھر تو وہ محض ایک خیالی جنت (Utopia) ہے یا ایک ایسا نظریہ جس کا عمل کی دنیا سے کوئی تعلق نہ ہو!

اس تیسری ذمہ داری کے لیے قرآن حکیم میں ہمیں چار اصطلاحات ملتی ہیں‘ جن میں سے دو مکی سورتوں میں وارد ہوئی ہیں اور دو مدنی سورتوں میں۔

(ا) **تکبیر رب**: یہ اصطلاح مکی سورتوں میں سے سورۃ المدثر میں آئی ہے‘ جہاں فرمایا گیا: ﴿وَرَبَّکَ فَکَبِّرۡ ﴾ ”اور اپنے ربّ کو بڑا کرو!“ آپ شاید حیران ہوں کہ میں نے یہ کیا ترجمہ کیا ہے!......تو جان لیجیے کہ تکبیر کا لفظی معنی ہے کسی شے کو بڑا کرنا۔تصغیر کا معنی ہے کسی شے کو چھوٹا کرنا۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ ربّ کو بڑا کرنا چہ معنی دارد؟ وہ تو بذاتہٖ بڑا ہے‘ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا والے اس کی بڑائی کو عملاً تسلیم نہیں کر رہے۔چنانچہ تکبیرِ ربّ سے مراد ہے اس کی بڑائی کو منوانا‘ اسے تسلیم کرانا اور تشریعی معاملات میں اسی کے

حکم کی تنفیذ کرنا۔ جیسا کہ فرمایا گیا: ﴿اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ﴾ اور بقول علامہ اقبال: ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری!

غور کیجیے کہ اس لحاظ سے تو وہ کہیں بڑا نظر نہیں آتا! بڑے تو ہم بنے بیٹھے ہیں۔ کیا آج ہمارا طرزِ عمل یہی نہیں ہے کہ حکم تو بس ہمارا چلے گا‘ ہم نہیں جانتے کہ اللہ کون ہے! بتایئے‘ آج پوری دنیا کا یہ رویّہ ہے کہ نہیں؟ ہم اذانوں میں کہہ دیتے ہیں ’’اللہ اکبر‘‘۔ جلسوں اور جلوسوں میں ’’نعرۂ تکبیر‘‘ کے جواب میں فلک شگاف انداز میں کہہ دیتے ہیں ’’اللہ اکبر‘‘ ......لیکن کہنے کو جتنا چاہیں کہہ لیں کہ اللہ سب سے بڑا ہے‘ حقیقت میں اللہ کہاں بڑا ہے؟ اس کی بڑائی اور اس کی کبریائی نظامِ حیات میں تو بالفعل کہیں بھی نافذ نہیں۔ حالانکہ ’’تکبیر ربّ‘‘ کا اصل تقاضا یہ ہے کہ وہ نظام قائم کیا جائے جس میں اللہ کی حاکمیت مطلقہ (Absolute Sovereignty) کو تسلیم کیا جائے‘ مانا جائے کہ آخری اختیار اُس کا ہے اور آخری فیصلہ اُس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ نظام قائم کرو گے تو تکبیر ربّ کا تقاضا پورا ہوگا۔

دیکھئے‘ نبی اکرم ﷺ کو بذریعہ وحی پہلا حکم ملا: ﴿اِقْرَاْ﴾. پہلی وحی میں تبلیغ اور دعوت کا کوئی ذکر نہیں‘ البتہ ’’اِقْرَاْ‘‘ دو مرتبہ آیا ہے:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ۝۵﴾ (العلق)

دوسری وحی سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات ہیں۔ وہاں باقاعدہ خطاب سے بات شروع ہوئی: ﴿یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱﴾ ’’اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے!‘‘ خطاب کے بعد پہلا حکم ملا: ﴿قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ کھڑے ہو جاؤ‘ کمر بستہ ہو جاؤ‘ مستعد ہو کر اپنا فرضِ منصبی ادا کرو! دو کام کرو‘ انذار اور تکبیر ربّ! بنی نوع انسان کو خبردار اور آگاہ کرو‘ نیند کے ماتوں کو جگاؤ کہ کس دھوکے میں پڑے ہوئے ہو‘ زندگی صرف یہ زندگی نہیں ہے‘ اصل زندگی وہ ہے جو موت کے بعد آئے گی۔ ﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۶۴﴾ (العنکبوت) کہ اے لوگو! اچھی طرح جان لو‘ یہ دنیا کی زندگی عارضی زندگی ہے اور بس ایک کھیل اور دل کا بہلاوا ہے‘ اور اصل زندگی کا گھر تو آخرت کا گھر ہے‘ کاش لوگوں کو سمجھ آ جائے! اور یہ کہ قیامت کا دن آنے والا ہے جس دن سب کو اپنے ربّ کے حضور میں جواب دہی کے لیے لازماً کھڑے ہونا ہوگا۔ ﴿اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝۴ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝۵

﴿يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶﴾ (المطففین) ’’کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن (یعنی قیامت کے روز) اٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اُس دن جب پوری نوعِ انسانی اس کائنات کے مالک کے سامنے (جواب دہی کے لیے) کھڑی ہوگی۔‘‘ انسان اس زعم میں مبتلا نہ رہے کہ یہ محض ڈراوا ہے۔ یہ دن آ کر رہے گا اور یہی اصل ہار جیت کا دن ہوگا۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ (التغابن: ۹)...... یہ انذار ہے اور یہی نبی اکرم ﷺ کی جدوجہد کا نقطۂ آغاز ہے۔ لیکن جانا کدھر ہے؟ آخری منزل کون سی ہے؟ اس کا تعین اگلی آیت میں کر دیا گیا: ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ یعنی وہ منزل ہے تکبیرِ ربّ! اور آپ غور کیجیے' تئیس سال میں آنحضور ﷺ نے تکبیرِ ربّ فرما دی کہ نہیں؟...... یہ ماننا پڑتا ہے کہ جزیرہ نمائے عرب میں آپ ؐ نے وہ نظام قائم فرما دیا جس میں اختیارِ اعلیٰ (Supreme Authority) اور حاکمیتِ مطلقہ کا مالک فقط اللہ عزوجل ہی کو تسلیم کیا گیا تھا۔

خیال رہے کہ تکبیرِ ربّ کی ذمہ داری آنحضور ﷺ کو مرتبہ رسالت پر مأمور ہونے کے وقت ہی سونپ دی گئی تھی۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بعض مفسرین کی یہ رائے ہے اور مجھے بھی اس سے اتفاق ہے کہ پہلی وحی یعنی سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات سے آنحضور ﷺ کی نبوت کا اور دوسری وحی یعنی سورۃ المدثر کی ابتدائی سات آیات سے آنحضور ﷺ کی رسالت کا آغاز ہوا تھا۔ واللہ اعلم!

(۲) **اقامتِ دین**: اسی ذمہ داری کے لیے دوسری اصطلاح اقامتِ دین ہے جو ایک دوسری مکی سورت سورۃ الشوریٰ میں وارد ہوئی۔ فرمایا گیا:

﴿اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ (آیت ۱۳)

’’دین کو قائم کرو اور اس بارے میں تفرقے میں نہ پڑو۔‘‘

قائم کون سی چیز کو کہتے ہیں؟ اس کو جو کھڑی ہو۔ زمین پر پڑی ہوئی چیز تو قائم نہیں کہلاتی۔ کوئی چیز گر جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس کو قائم کرو' اسے کھڑا کرو۔ دین اگر پہلے سے قائم ہے تو اسے قائم رکھنا اہلِ دین کی ذمہ داری ہوگی اور اگر زمین بوس ہو تو اس کا اپنے ماننے والوں سے یہ تقاضا ہے کہ اسے قائم کریں' اسے کھڑا کریں۔ اسی دین کے مطابق نظامِ معیشت و معاشرت استوار ہو' اسی کے مطابق نظامِ حکومت و سیاست قائم ہو۔ اگر یہ صورت ہے تو ’’اَقِيْمُوا الدِّيْنَ‘‘ کا تقاضا پورا ہو رہا ہے' اور اگر نہیں تو جان لیجیے کہ محض تلاوت اور مدح سرائی کے لیے تو یہ دین نہیں اُتارا گیا —— دیکھئے سورۃ المائدۃ میں فرمایا:

﴿قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ

رَّبِّكُمْ ؕ ﴾ (آیت ۶۸)

''(اے نبی صاف صاف) کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تم تورات اور انجیل کو اور دوسری کتابوں کو قائم نہ کرو جو تمہارے ربّ کی طرف سے نازل کی گئی ہیں۔''

یہاں وہی لفظ اقامت (قائم کرنا) آیا ہے۔ اب اس آیت میں بغرضِ تفہیم ''یَا اَھْلَ الْکِتَابِ'' کی جگہ ''یَا اَھْلَ الْقُرْاٰنِ'' اور ''تورات وانجیل'' کی جگہ ''قرآن'' رکھ دیجیے تو بات یوں ہوگی: یَا اَھْلَ الْقُرْاٰنِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا الْقُرْاٰنَ کہ اے اہل قرآن' اے حاملانِ کتاب اللہ! تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے جب تک تم قرآن کو قائم نہ کرو۔ قرآن حکیم اگر واقعی ضابطۂ حیات ہے' جیسا کہ فی الواقع وہ ہے' تو اس کو نافذ کیا جانا چاہیے۔ قرآن نے اگر کوئی نظام دیا ہے' اور واقعی دیا ہے' تو وہ نظام قائم ہونا چاہیے۔ یہ مختصر شرح ہوئی ''اقامتِ دین'' کی جو مکی دَور کی دوسری اصطلاح ہے۔

(۳) یَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰه : یہ تیسری اصطلاح مدنی دور کی ہے اور یہ دو سورتوں (البقرۃ اور الانفال) میں آئی ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ ﴾ (آیت ۱۹۳)

''اور جنگ کرو ان (مشرکین) سے یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کے لیے ہو جائے!''

سورۃ الانفال میں بات اور آگے بڑھی۔ وہاں فرمایا:

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ؕ ﴾ (آیت ۳۹)

''اور (مسلمانو!) تم ان سے جنگ جاری رکھو جب تک فتنہ فرو نہ ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے نہ ہو جائے۔''

یہ نہ ہو کہ دین کو اجزاء میں تقسیم کر لیا جائے —— مسجد میں نمازیں بھی پڑھی جا رہی ہوں' روزے بھی بڑے اہتمام سے رکھے جا رہے ہوں' چلیے زکوٰۃ بھی جیسے تیسے ادا کی جا رہی ہو' حج اور عمرے بھی ذوق وشوق سے ہو رہے ہوں —— لیکن ملک میں قائم نظامِ حکومت کے ڈھانچے میں دین کو کوئی دخل نہ ہو! مالی معاملات کو ہم شریعت کے تحت لانے کے لیے کسی طور پر تیار نہ ہوں اور اس سے گریز کے لیے عذرات کا انبار لگا دیں' حدود وتعزیراتِ اسلامی کے نفاذ کا فیصلہ اگر کر بھی لیں تو اس پر عمل درآمد کے لیے عملاً کوئی پیش رفت نہ ہو۔ ستر وحجاب کے احکام کے بارے میں ہماری سوچ یہ ہو کہ یہ زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتے' لہٰذا ان کے نفاذ کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' بلکہ اس معاملے میں دین کے احکام کی پوری ڈھٹائی سے خلاف ورزی میں ہمارے قدم آگے بڑھتے چلے جائیں اور مَرد وزن کی مساوات اور زندگی کے ہر میدان اور ہر شعبے میں دونوں کو شانہ بشانہ مواقع فراہم کرنا ہمارا نعرہ (slogan) بن جائے' عورت کے تقدس کو ہم برسرِ بازار نیلام کریں اور اسے اشتہار و تشہیر کی جنس بنا کر رکھ دیں۔

ہمارا حال تو اتنا پتلا ہے کہ صدر ایوب کے دَور میں جو عائلی قوانین بذریعہ آرڈی نینس جاری ہوئے تھے اور جن کی اکثر دفعات کو پاکستان میں موجود تمام فرقوں کے علماء نے متفقہ طور پر خلافِ اسلام قرار دیا تھا' ان کو قانونی طور پر شریعت کورٹ میں زیرِ بحث نہیں لایا جا سکتا۔ اس لیے کہ معلوم ہے کہ شریعت کورٹ خلافِ شریعت دفعات کو گوارا نہیں کرے گی اور اس طرح مغرب زدہ اور اباحیت پسند خواتین وحضرات کے ایک چھوٹے لیکن بااثر طبقے کی ناراضگی کا اندیشہ ہے اور اس طبقے کو مطمئن رکھنا ضروری ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے زیادہ خوف ہمیں اس مغرب زدہ اور اباحیت پسند طبقے کا ہے۔ اس کا مطلب یہی تو ہے کہ ہم نے دین کے حصے بخرے کر دیے ہیں۔ ستم ظریفی ملاحظہ کیجیے کہ ''شریعت کورٹ'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا لیکن طے کر دیا گیا کہ فلاں فلاں اُمور اس کورٹ کے دائرے سے باہر ہیں' حتیٰ کہ عائلی قوانین بھی اس کی حدودِ کار میں نہیں آتے۔ حالانکہ عائلی قوانین پر قرآن حکیم نے سب سے زیادہ تفصیل سے بحث کی ہے' اور یہ بحث ایک دو نہیں' متعدد سورتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارے یہ عائلی قوانین وہ تھے جن کو انگریز تک نے نہیں چھیڑا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ انگریز نے ہمارے Personal Law کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ یہ ہماری بدبختی ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے قیام کے بعد اسلام کے عائلی قوانین کی کتر بیونت کی گئی۔ ایک مارشل لاء آیا تو یہ مسخ شدہ غیر اسلامی قوانین نافذ ہوئے اور دوسرا مارشل لاء آیا تو اس نے ان کو تحفظ دیا۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ جو کام غیروں نے ہمارے دورِ غلامی میں نہیں کیا وہ اپنوں نے آزادی ملنے کے بعد اپنے ہاتھوں سے کیا۔

تو تیسری اصطلاح ہمارے سامنے سورۃ البقرۃ اور سورۃ الانفال کی دو آیات کے حوالے سے یہ سامنے آئی کہ دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو۔ جیسا کہ میں نے عبادت کے ضمن میں عرض کیا تھا کہ عبادت وہی ہو گی جو پوری زندگی پر محیط ہو' اسی طرح ''اقامتِ دین'' کے بارے میں نوٹ کر لیجیے کہ یہ اقامت پورے اور مکمل دین کی ہو گی۔ یہ نہیں کہ ایک حصہ ہمیں پسند نہیں' وہ مشکل ہے' لہٰذا وہ قائم نہ کریں' اور جو حصہ ہمیں پسند ہے اور آسان ہے وہ قائم کر دیں۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت نہ ہوئی بلکہ یہ تو اپنے من کی چاہت ہے

جس کی پیروی کی جارہی ہے!

(۴) **غلبۂ دین حق**: اس سلسلے کی چوتھی اور عظیم ترین اصطلاح وہ ہے جو سورۃ الصّف میں وارد ہوئی اور جو اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت کا اصل موضوع ہے۔ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ﴾ (آیت ۹)

''وہی ہے (اللہ) جس نے اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ وہ غالب کر دے اس کو تمام جنسِ دین (یا تمام نظام ہائے اطاعت) پر۔''

یہ الفاظ ایک شوشے کے فرق کے بغیر سورۃ الصّف کے علاوہ سورۃ التوبہ اور سورۃ الفتح میں بھی آئے ہیں۔ سورۃ التوبہ اور سورۃ الصّف میں آخری ٹکڑا آیا: ﴿وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ۝﴾ اور سورۃ الفتح میں ﴿وَکَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیۡدًا ۝۲۸﴾. اس طرح ان تین مقامات کے حوالے سے ''اظهارُ دينِ الحقِّ على الدّين كُلِّهٖ'' کی یہ اصطلاح سامنے آئی۔

آپ نے دیکھا کہ اصطلاحات ثقیل ہوتی چلی جارہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اصل باتوں کو سادہ ترین الفاظ میں آپ کے سامنے رکھا۔ ان کا پھر اعادہ کر رہا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ دین پر خود عمل پیرا اور کاربند ہو۔ دوسری یہ کہ دین کو پھیلاؤ۔ اور تیسری بات یہ کہ دین کو قائم کرو۔ یہ ہیں تین فرائض جو ہم پر دین کی طرف سے عائد ہوتے ہیں۔ کلمۂ شہادت ان کے لیے بمنزلہ بنیاد کے ہے' اور نماز' زکوٰۃ' حج اور روزہ اس کے چار ستون ہیں۔ ان چار ستونوں پر یہ تین منزلہ عمارت کھڑی ہے۔ اہم ترین دینی اصطلاحات کے حوالے سے ان تین منزلوں کو (۱) عبادتِ ربّ (۲) شہادت علی الناس اور (۳) اقامتِ دین کا نام دیا جائے گا۔ اگر آپ کے ذہن میں دینی فرائض کا یہ تصور موجود ہے تو بنیادی خاکہ مکمل ہوگیا' اور اگر یہ نہیں ہے اور ذہن میں صرف نماز' زکوٰۃ' حج اور روزہ ہی ہیں تو پھر ستون ہی ستون ہیں' چھت تو آپ کے سامنے ہے ہی نہیں۔ بغیر چھت کے جو ستون ہوتے ہیں وہ تو بطورِ یادگار کھڑے رہ جاتے ہیں' ان کا مصرف کوئی نہیں ہوتا۔ وہ آثارِ قدیمہ ہو سکتے ہیں' اور تو کوئی مقصد پورا نہیں کرتے۔ چنانچہ فرائض دینی کی عمارت کا خاکہ اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ ارکانِ اسلام یعنی کلمۂ شہادت' نماز' زکوٰۃ' حج اور روزہ پر اسلام' اطاعت اور عبادتِ ربّ کی پہلی منزل استوار ہوتی ہے۔ تبلیغ ودعوت' امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور شہادت علی الناس اس کی دوسری منزل ہے' جبکہ تکبیر ربّ' اقامتِ دین' کُل کا کُل دین اللہ ہی کے لیے ہو اور اظہارِ دین الحق یعنی اس دین حق کو غالب وقائم کر دیا جائے' یہ تیسری منزل ہے۔ یہ خاکہ اپنے ذہن میں رکھیے تو آپ کے

سامنے صحیح تصور آئے گا کہ ہمارا دین ہم سے کیا چاہتا ہے؟ ہمارے دینی فرائض کیا ہیں؟ یا یوں کہیے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک بندۂ مؤمن سے مطالبات کیا ہیں؟

فرائضِ دینی کے تین لوازم

پہلا لازمہ --- جہاد

اب آیئے ان تین اُمور کی طرف جن کی حیثیت ان فرائض کے لوازم یعنی لازمی تقاضوں کی ہے۔ ان میں سے پہلے لازمی تقاضے کو سادہ الفاظ میں بیان کیا جائے تو وہ ہوگا کوشش اور کشاکش۔ غور کیجیے کہ کوشش اور محنت کیے بغیر کیا یہ منزلیں سر ہوسکتی ہیں؟ ہرگز نہیں! بلکہ محض کوشش اور محنت سے بھی کام نہیں بنتا' اس لیے کہ یہاں خلاء تو ہے نہیں۔ آپ اگر اپنے نظریات کے مطابق کوشش کر رہے ہیں تو اور لوگ بھی تو ہیں جو اپنے نظریات کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ لہٰذا کوشش' کوشش سے ٹکرائے گی۔ جب کوششیں باہم ٹکراتی ہیں تو اس کا نام ہوتا ہے کشاکش' جسے عام طور پر کشمکش بھی کہا جاتا ہے۔ اس کشاکش یا کشمکش کے لیے دینی اصطلاح ''جہاد'' ہے۔ یہ جہاد وہ پہلا لازمی عمل ہے کہ اگر یہ ہوگا تو دین کے وہ تین بنیادی تقاضے پورے ہوں گے جو ہمارے سامنے آئے' ورنہ نہیں۔ اب اس لفظِ جہاد کو ان تین بنیادی تقاضوں کے حوالے سے بھی سمجھ لیجیے۔

(۱) **جہاد مع النفس**: فرائضِ دینی کی پہلی سطح یعنی اسلام' اطاعت' تقویٰ اور عبادت کی سطح پر جہاد کس سے ہوگا؟ اپنے نفس سے ---- اپنے نفس کو اللہ کا مطیع بنانے کے لیے کشاکش کرنی ہوگی' کیونکہ نفس تو کسی اور طرف زور لگاتا رہتا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ﴾ (یوسف:۵۳)۔ وہ حرام کی طرف بڑھنا چاہتا ہے' آپ کو اسے روکنا ہوگا۔ اس کے اندر خواہشات کا سرکش گھوڑا ہے' آپ کو اسے لگام دینی ہوگی۔ صبح ہوگئی ہے' اذان سن لی ہے' اللہ کی پکار آ گئی ہے' نفس کہتا ہے کہ سوتے رہو۔ اس سے کشمکش کریں گے اور اسے زیر کریں گے تو نماز کے لیے کھڑے ہوسکیں گے' ورنہ نہیں۔ اگر اُس وقت ذرا سی کروٹ لی اور چادر اوپر سرکالی کہ ابھی اٹھتے ہیں تو پھر اٹھنا محال ہے۔ یہی کشمکش و کشاکش دراصل جہاد کی پہلی اور اہم ترین سطح ہے۔ حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَلْمُجَاھِدُ مَنْ جَاھَدَ نَفْسَهٗ)) [1] حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: اَیُّ الْجِھَادِ اَفْضَلُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟ ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب فضائل الجهاد عن رسول اللّٰه، باب ماجاء فی فضل من مات......

بہترین جہاد کون سا ہے؟'' آنحضور ﷺ نے فرمایا: ((اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ وَهَوَاكَ فِيْ ذَاتِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ)) [1] ''یہ کہ تو اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو اللہ کا مطیع بنانے کے لیے ان سے جہاد کرے''۔ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے روزمرہ کے معمولات کو اللہ کے احکام کے تابع رکھنے کو ''جہادِ اکبر'' قرار دیا' اور یہ موقع سفرِ تبوک سے واپسی کا تھا جس سے زیادہ طویل اور سخت سفر شدید گرمی کے موسم میں کوئی اور نہیں ہوا تھا۔ ایک روایت کے مطابق اس سفر سے مدینہ منورہ مراجعت ہو رہی تھی تو اس موقع پر فرمایا: ((رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ)) ''ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹے ہیں''۔ یعنی لوگ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ اعداء سے مقابلہ اور کشاکش ہی جہاد ہے' بلکہ یہ جو ہمارے اندر بیٹھا ہوا دشمن ''ہمارا نفس'' ہے' اہم ترین کشاکش اس سے کرنی پڑتی ہے۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاد کی پہلی سطح اور اس کا پہلا مرحلہ ''جہاد مع النفس'' ہے۔ یعنی اپنے نفس کے ساتھ کشاکش اور پنجہ آزمائی!

(۲) جہاد بالقرآن: دینی فرائض کے دوسرے مرحلے یعنی تبلیغ' دعوت' امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور شہادت علی الناس کی سطح پر جہاد کی صورت کیا ہوگی؟ دیکھئے! آپ اگر دین کی تبلیغ کر رہے ہیں' اس کی دعوت دے رہے ہیں تو الحاد' دہریت' مادہ پرستی' فسطائیت' اشتراکیت اور دوسرے اَدیان و مذاہب باطلہ کے مبلغین بھی تو آپ کے اسی معاشرے میں موجود ہیں۔ آپ اسلام کے قائل ہیں تو کفر کی طاقتیں بھی یہیں موجود ہیں۔ دعوت و تبلیغ کی سطح پر ان سے کشمکش و کشاکش ہوگی۔ البتہ یہ کشاکش نظریاتی سطح پر ہوگی' خیالات کی سطح پر' فلسفہ و فکر کی سطح پر ____ اس کشاکش میں مال اور جسم و جان کی توانائیاں کھپانی پڑیں گی۔ رسول اللہ ﷺ جب توحید کی دعوت دے رہے تھے تو آپؐ کے مقابل ابوجہل اور اس کے ساتھی شرک اور بُت پرستی کے علمبردار بن کر کھڑے تھے۔ چنانچہ باہم کشاکش ہوئی یا نہیں؟ پس تبلیغ و دعوت' امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور شہادت علی الناس کے فرائض کی ادائیگی کے لیے جب آپ محنت' کوشش اور جدوجہد کریں گے تو اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ کو دیکھتے ہی کفر اور الحاد میدان چھوڑ کر بھاگ جائیں گے تو یہ محض ایک مغالطہ ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ آپ کو کشمکش و کشاکش سے سابقہ پیش آکر رہے گا۔ اب مرحلہ مشکل تر ہوگیا۔ پہلے تو اپنے باطن میں کشاکش والا معاملہ تھا' جہاد مع النفس تھا' اب دعوت و تبلیغ کے لیے' امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے اور شہادت علی الناس کے لیے آپ کو جہاد کرنا ہوگا' کشمکش کرنی پڑے گی باطل کے ساتھ' الحاد کے ساتھ' اباحیت کے ساتھ اور تمام باطل نظریات کے ساتھ۔

---

(۱) رواه الديلمى، بحواله كنز العمال، ۲۶۹/٤ سلسلة الاحاديث الصحيحة: ۱٤۸٦

اس جہاد اور کشاکش میں تلوار کون سی چلے گی؟ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفرقان میں رہنمائی فرمائی: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾﴾ کہ اے نبیؐ! ان کفار سے جہاد کیجیے اس قرآن کے ساتھ‘ زبردست جہاد۔ یہاں ’’بِهٖ‘‘ کی ضمیر مجرور قرآن کی طرف جا رہی ہے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے تمہارے ہاتھ میں قرآن دیا ہے‘ یہ وہ تلوار ہے جو ہر باطل نظریے کو کاٹ پھینکنے والی ہے۔ ایک تلوار لوہے کی ہوتی ہے‘ اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ قرآن بھی ایک تلوار ہے۔ علامہ اقبال نے اس کو بڑے پیارے انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نفس اور شیطان کے ساتھ کشمکش کرنے کے لیے یہی قرآن کی تلوار کام دے گی: ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است
زانکہ او گم اندر اَعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی!

’’ابلیس کو ہلاک کرنا ایک مشکل کام ہے‘ اس لیے کہ وہ انسان کے دل کی گہرائیوں کے اندر روپوش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بہتر یہ ہوگا کہ تم اسے مسلمان کر لو اور (اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ) تم شمشیرِ قرآنی کے ذریعے اسے گھائل کرو!‘‘

چنانچہ نفس امّارہ کو بھی مارو گے تو قرآن کی تلوار سے مارو گے‘ ویسے یہ نہیں مرے گا۔ اور شیطان سے لڑنے کے لیے بھی یہی تلوار کام آئے گی جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے ہاتھ میں قرآن مجید کی صورت میں دی ہے اور جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ ہے‘ جسے ہم نے ’’کتابِ مقدس‘‘ بنا کر طاقوں میں رکھ چھوڑا ہے۔

تو یہ جہاد کی دوسری سطح ہوئی۔ یعنی فکری و نظریاتی سطح پر کشاکش اور تصادم۔ حق کا بول بالا کرنا‘ یعنی احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے جان و مال سے سعی و جہد کرنا۔ اس کے لیے زبان بھی استعمال ہوگی اور قلم بھی۔ اس میں تمام ذرائع ابلاغ اور نشر و اشاعت کے تمام وسائل استعمال ہوں گے اور ان سب کے ذریعے قرآن مجید کی دعوت اور اس کے پیغام کو پھیلایا جائے گا۔

(۳) قتال فی سبیل اللہ : تیسری سطح یعنی اللہ کے دین کو بالفعل قائم و نافذ کرنے کے مرحلے پر یہ جہاد بھی اپنی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے اور یہ جہاد کا تیسرا اور بلند ترین مرحلہ ہے۔ اس مرحلہ میں باطل کے علمبرداروں کے ساتھ کشاکش اور تصادم ہوگا۔ دعوت و تبلیغ کے مرحلے میں کشاکش اور تصادم باطل نظریات کے ساتھ تھا‘ لیکن جب دین کو قائم کرنے کا مرحلہ آئے گا تو یہ کشاکش اور تصادم محض باطل نظریات سے نہیں

بلکہ باطل کے علمبرداروں اور باطل کی قوتوں کے ساتھ ہوگا۔اس لیے کہ وہ اس راستے میں مزاحم ہوں گے۔ وہ ہرگز یہ نہیں کہیں گے کہ ٹھیک ہے ہم ہٹ جاتے ہیں' آپ آیئے اور اپنا دین قائم و نافذ کر دیجیے! ع ایں خیال است و محال است و جنوں! ہر نظامِ باطل کے ساتھ مراعات یافتہ طبقات (privileged classes) کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ایسے طبقات کے ہاتھوں میں ملک کے معاملات کی زمامِ کار ہوتی ہے۔تو کیا ایسے تمام طبقات کبھی یہ گوارا کریں گے کہ آپ وہ رائج نظام جس سے ان کے مفادات وابستہ ہیں' ہٹا کر دین کا نظام مکمل طور پر قائم کر دیں؟ اس بات کو وہ لوگ ٹھنڈے پیٹوں ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ چنانچہ ان کے ساتھ لازماً پنجہ آزمائی کرنی پڑے گی۔اس پنجہ آزمائی کی بھی مختلف سطحیں ہیں۔ پہلی سطح صبر و مصابرت اور استقامت (Passive Resistance) کی ہے۔ دوسری سطح اقدام (Active Resistance) کی ہے' جبکہ تیسری سطح مسلح تصادم (Armed Conflict) کی ہے۔ اہل حق اگر کمزور ہوں تو جب تک طاقت حاصل نہ ہو جائے انہیں صبرِ محض کی روش پر عمل کرنا ہوگا۔ وہ مار کھائیں گے لیکن ہاتھ نہیں اُٹھائیں گے' کیونکہ حکمت اسی میں ہے۔ مکہ مکرمہ میں اسی حکمت پر عمل ہوا۔ وہاں اہلِ ایمان کو یہی حکم تھا کہ مصائب جھیلو' ظلم و تعدی برداشت کرو لیکن ہاتھ نہ اُٹھاؤ۔ یہ ہے صبر و مصابرت' یعنی Passive Resistance —— لیکن جب طاقت حاصل ہو جائے تو پھر انہیں اجازت ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیں۔ چنانچہ وہی مسلمان جو مکہ میں ہاتھ نہیں اُٹھا رہے تھے' مدینہ میں ان کے ہاتھ کھول دیے گئے۔انہیں اذنِ قتال دے دیا گیا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصۡرِہِمۡ لَقَدِیۡرُۨ ﴿۳۹﴾﴾ (الحج)

''اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف (کفار کی طرف سے) جنگ کی جا رہی ہے' کیونکہ وہ مظلوم ہیں' اور بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔''

تو جان لیجیے کہ اس کشمکش کا آخری مرحلہ مسلح تصادم (Armed Conflict) ہے' یعنی قتال فی سبیل اللہ۔ اور یہ جہاد کی چوٹی ہے۔ سورۃ الصّف میں واضح فرما دیا گیا ہے کہ یہی چوٹی محبوبیت ربّ کا مقام ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ صَفًّا کَاَنَّہُمۡ بُنۡیَانٌ مَّرۡصُوۡصٌ ﴿۴﴾﴾

''بلاشبہ اللہ کو تو اپنے وہ بندے محبوب ہیں جو اُس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اس طرح صفیں باندھ کر گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔''

اس موقع پر میں صحیح مسلم کی ایک حدیث شریف کا حوالہ دے رہا ہوں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِنَ النِّفَاقِ))(۱)

''جو شخص اس حال میں مرگیا کہ نہ تو اس نے (اللہ کی راہ میں) جنگ کی اور نہ اس کے دل میں اس کی تمنا ہی پیدا ہوئی تو وہ ایک قسم کے نفاق پر مرا۔''

چنانچہ دل میں یہ تمنا ضرور رکھنی چاہیے۔ اگر دل میں فی الواقع ایمان موجود ہے تو یہ آرزو ضرور رہے کہ کوئی وقت آئے کہ خالصتاً اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے ہم اللہ کی راہ میں اپنی گردنیں کٹا کر سرخرو ہو جائیں۔ اگر اس تمنا سے سینہ خالی ہے تو اس سینے میں نفاق ہے۔ میں پھر عرض کر دوں کہ یہ جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا فتویٰ ہے۔

دوسرا لازمہ ---- التزام جماعت

فرائضِ دینی کے ضمن میں دوسرا لازمی تقاضا التزامِ جماعت ہے۔ کون ہے جو بقائمی ہوش وحواس یہ کہہ سکے کہ یہ کام انفرادی طور پر ہو سکتے ہیں؟ کوئی ایک بھی سلیم العقل شخص ایسا نہیں ہو سکتا جو یہ رائے رکھتا ہو کہ ان کاموں کے لیے جماعت ضروری نہیں۔ اگر یہ اُمور یعنی عبادتِ ربّ' اطاعتِ ربّ' شہادت علی الناس' امر بالمعروف' نہی عن المنکر' اقامتِ دین اور اظہارِ دین الحق علی الدین کلہ فرائض دینی ہیں تو ان کے لوازم کا شمار بھی فرائض میں ہوگا' کیونکہ جو شے فرض کی ادائیگی کے لیے لازمی ہو وہ بھی فرض ہے۔ مثلاً نماز پڑھنا فرض ہے اور اس کے لیے وضو شرط ہے تو وضو بھی فرض ہوا کہ نہیں؟ حج یا عمرہ کی ادائیگی کے لیے احرام شرط ہے تو احرام بھی فرض ہوا کہ نہیں؟ لہٰذا التزامِ جماعت بھی لازم و واجب ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا حکم ہے' جسے حضرت حارث الاشعری رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے:

((اَنَا آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ' اَللّٰهُ اَمَرَنِيْ بِهِنَّ : بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ))(۲)

''(مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں' اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے: التزامِ جماعت کا' (امیر کا حکم) سننے اور ماننے کا' ہجرت کا' اور اللہ کے راستے میں جہاد کا!''

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب ذم من مات ولم یغز ولم یحدث نفسہ بالغزو۔

(۲) مسند احمد ۱۳۰/۴۔ وسنن الترمذی' کتاب الامثال' باب ما جاء فی مثل الصلاۃ والصیام والصدقۃ۔

ہجرت کیا ہے؟ یہ کہ ہر اُس چیز کو چھوڑ دینا جو اللہ کو پسند نہ ہو—— جیسے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: یَـــا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ الْھِجْرَۃِ اَفْضَلُ؟ تو آپؐ نے جواب دیا: ((اَنْ تَھْجُرَ مَاکَرِہَ رَبُّکَ)) [(۱)] —— یہاں تک کہ وقت آئے اور گھر بار اور وطن چھوڑنا پڑے تو اس کے لیے بھی انسان ہر دم آمادہ رہے۔ اور یہ ہجرت کی چوٹی ہے۔ جیسے جہاد کی چوٹی قتال فی سبیل اللہ ہے اسی طرح ہجرت کی چوٹی اللہ کے دین کے لیے ترکِ وطن ہے۔ رہا جہاد فی سبیل اللہ تو اس کا آغاز مجاہدہ مع النفس سے ہوتا ہے اور اس کی چوٹی اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال ہے۔ اور سب سے پہلی چیز جس کا اس حدیث میں حکم دیا گیا وہ التزامِ جماعت ہے۔ یہ ہے التزامِ جماعت کی فرضیت!

اب یہ آپ حضرات کے سوچنے کی بات ہے کہ آپ کسی ایسی جماعت میں شامل ہیں یا نہیں جو اقامت دین کے لیے، دین کو قائم کرنے کے لیے، دین کو برپا کرنے کے لیے اور دین کو شہادت علی الناس کی سطح پر دنیا میں پھیلانے کے لیے قائم کی گئی ہو۔ باقی اگر آپ نے رفاہِ عامہ، خدمتِ خلق، اشاعت تعلیم یا اپنے پیشہ ورانہ مفادات کے تحفظات کے لیے کوئی انجمن، کوئی ادارہ یا کوئی ایسوسی ایشن بنائی ہوئی ہو تو اس پر ''جماعت'' کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اس حدیث کی رو سے تو وہ جماعت درکار ہے جس کا مقصدِ وجود اللہ کے دین کا غلبہ ہو۔ بقول علامہ اقبال: ؎

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے، جام رہے؟

اور: ؎

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں، میں اسی لیے نمازی

اور یہ بات بھی جان لیجیے کہ اس جماعت کا نظام ٹھیٹھ اسلامی اصول ''سمع وطاعت'' پر ہونا چاہیے، جس کا حکم بھی مذکورہ بالا حدیث میں ''بِالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ'' کے الفاظ میں آیا ہے۔ اگر آپ ایسی کسی جماعت میں شامل نہیں ہیں تو دین کے یہ تقاضے گویا آپ کے سامنے ہی نہیں ہیں۔

تیسرا لازمہ —— بیعت

دینی فرائض کے لوازم میں سے تیسری چیز یہ ہے کہ اس جماعت کا جو نظام قائم ہو وہ بیعت پر مبنی

(۱) سنن النسائی، کتاب البیعۃ، باب ھجرۃ البادی۔ عن عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنھما۔

ہو۔ یہ وہ واحد نظام ہے جو ہمیں کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنے سے ملتا ہے۔ کتاب وسنت میں مجھے اس کے سوا کوئی دوسرا نظام نہیں ملا اور نہ کوئی مجھے آج تک بتا سکا۔ اب یہ بات سمجھئے کہ یہ بیعت ہے کیا! ایک شخص سے ان فرائض کی ادائیگی کے ارادے سے شخصی تعلق قائم کرنا' اس کے ہاتھ پر ان فرائض کی انجام دہی کے لیے قول وقرار کرنا بیعت ہے۔ میں نے شروع ہی میں لفظ ''مرید'' کی وضاحت کر دی تھی کہ مرید وہ ہے جو ارادہ کرے۔ یعنی ایسا فرد جو اپنی اصلاح کے ارادے سے کسی کے ہاتھ پر قول وقرار کے لیے بیعت کرلے۔ چنانچہ شخصی اصلاح اور تزکیۂ نفس کے لیے بیعت کی جاتی ہے۔ اور یہ بیعت اسلام' اطاعت' تقویٰ اور عبادت کے تقاضوں اور مطالبوں پر پورا اترنے کے لیے کسی مردِ صالح کے ہاتھ پر ہوتی ہے۔ یہ بیعت ''بیعت توبہ'' یا ''بیعت ارشاد وتزکیہ'' کہلاتی ہے —— اور جب اللہ کے دین کی تبلیغ و دعوت' دین کی نشر واشاعت' شہادت علی الناس اور اقامت دین جیسے عظیم فرائض کی ادائیگی اور اس کے لیے سمع وطاعت پر مبنی جماعت کے قیام اور ہجرت و جہاد کا مرحلہ درپیش ہو تو اس کے لیے بھی ایسے شخص کے ہاتھ پر جو اِس کام کا عزم لے کر اُٹھا ہو' شخصی بیعت ہوگی اور یہ بیعت ''بیعتِ جہاد'' کہلائے گی۔

ماضی قریب میں برعظیم پاک و ہند میں برپا ہونے والی سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم تحریک ''تحریک شہیدین'' کے نام سے موسوم ہوئی' اس لیے کہ اس میں دوسری اہم شخصیت امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی شامل تھی۔ ورنہ نا معلوم کتنے ہزاروں مسلمان اس میں شہید ہوئے: ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اس تحریک کے نتیجے میں اس برعظیم پاک و ہند میں خالصتاً اللہ کے دین کے غلبے کے لیے جہاد وقتال ہوا۔ اس میں سید احمد شہید بریلویؒ نے پہلے بیعت ارشاد لی اور پھر بیعت جہاد —— اور اس بیعت جہاد کی وہ آخری منزل بھی آئی کہ سیف بدست میدانِ جنگ میں قتال کیا اور سکھوں کی فوج کے ہاتھوں گردن کٹوا کر بارگاہِ ربّ العزت میں سرخرو ہو گئے۔

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰـکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾﴾ (البقرۃ)

اس تحریک کا نظم شخصی بیعت پر قائم ہوا تھا' لیکن آج یہ لفظ گالی بن گیا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں تو لفظ مرید بھی بدنام ہو گیا' اور پھر اللہ جانے ہم نے دین کی کتنی عظیم اصطلاحات کو بدنام کر چھوڑا ہے۔

لیکن اس وجہ سے ہم دین کی کسی بھی اصطلاح کو اِن شاء اللہ ترک نہیں کریں گے‘ بلکہ ان میں اصل روح پھونکنے کی ہر امکانی کوشش کریں گے۔

اب ذرا مزید توجہ کیجیے۔ ایک اہم بات عرض کر رہا ہوں اور وہ یہ کہ آپ میں سے اکثر حضرات کو معلوم ہوگا کہ ہمارے ہاں دینی حلقوں میں یہ تصور عام رہا ہے اور آج بھی ہے کہ اگر کسی کی بیعت کا حلقہ تمہاری گردن میں نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ دین کا صحیح تقاضا پورا نہیں ہو رہا۔ میں کہتا ہوں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ:

’’اگر بیعت جہاد کے لیے آپ کسی کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں‘ تو دین کے وہ تقاضے اور فرائض‘ جو میں نے قرآن مجید اور احادیث شریفہ سے آپ کے سامنے قدرے تفصیل سے بیان کیے ہیں‘ وہ پورے نہیں ہو سکتے۔‘‘

البتہ یہ ضرور ہے کہ اب چونکہ کوئی نبی نہیں‘ کوئی معصوم نہیں‘ لہٰذا آپ کو خود تلاش کرنا پڑے گا کہ ہے کوئی اللہ کا بندہ جو ’’مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ؟‘‘ کی صدا لگا رہا ہو اور ان فرائض کی انجام دہی کے لیے کوشاں ہو اور آگے بڑھ رہا ہو! اور اگر آپ کا دل اس پر مطمئن ہو جائے‘ اس کے فہم اور اس کے خلوص و اخلاص پر آپ کو اعتماد پیدا ہو تو اس کے ساتھ وابستہ اور منسلک ہو جایئے!...... میں کہا کرتا ہوں کہ اس طرح اگر ہزار قافلے بھی بن جائیں تو کوئی حرج نہیں‘ بشرطیکہ منزل ایک ہو۔ اگر دینی فرائض کا تصور صحیح ہو‘ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کے مطابق ہو تو کوئی مضائقہ نہیں کہ بیک وقت کئی قافلے اس تصور کو لے کر رواں دواں ہو جائیں۔ منزل تو سب کی ایک ہی ہوگی۔ میرے نزدیک سب کا ایک ہونا اب لازم نہیں ہے۔ سب کا ایک ہونا صرف رسول کے ساتھ ہونا لازم ہوتا ہے۔ میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ ایامِ حج میں جب منیٰ سے وقوفِ عرفات کے لیے سفر ہوتا ہے تو بیک وقت ہزاروں قافلے چلتے ہیں‘ جن میں سے ہر ایک کا جھنڈا الگ ہوتا ہے۔ لیکن سب کا رُخ کس طرف ہے؟ عرفات کی طرف! منزل تو سب کی ایک ہی ہے۔ چنانچہ اگر ہزاروں قافلے بھی ہو گئے تو کوئی حرج نہیں۔ تاہم اگر کوئی شریکِ سفر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے قافلے والوں میں فرائض دینی کا صحیح اور مکمل تصور ہی مفقود ہے‘ یا یہ کہ جو راستہ اختیار کیا جا رہا ہے اس کا رُخ منزل کی طرف صحیح طور پر نہیں ہے‘ بلکہ شاہراہ کو چھوڑ کر کوئی شارٹ کٹ اختیار کر لیا گیا ہے‘ جس کی بدولت منزلِ مقصود تک جلد پہنچنے کی بجائے یہ قافلہ اس شارٹ کٹ کی بھول بھلیوں اور راستے کے جھاڑ جھنکاڑ میں

ایسا الجھ کر رہ گیا ہے کہ منزل کو جانے والی اصل شاہراہ سے تعلق ہی منقطع ہو گیا ہے‘ یا کسی قائد پر دل مطمئن نہیں ہو رہا ہے اور اندیشہ ہے کہ یہ صحیح شخص نہیں ہے‘ یا مخلص نہیں ہے‘ محض دکاندار ہے تو ایسی صورت میں وہ کسی اور کو تلاش کرے‘ یا پھر خود کھڑے ہو کر پکارے کہ ﴿مَنۡ اَنۡصَارِیۡ اِلَی اللّٰہِ﴾ خود قافلہ بنانے کی سعی کرے —— یہاں کسی کی اجارہ داری نہیں ہے‘ تمام حقوق کسی کے نام محفوظ نہیں ہیں کہ کوئی دوسرا قافلہ نہیں بنا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر نیت صاف ہو‘ دل میں خلوص ہو‘ دوسروں سے الجھنے سے اجتناب ہو‘ سامنے منزل اقامتِ دین کی ہو تو خواہ سینکڑوں قافلے ہوں یا ہزاروں‘ کوئی مضائقہ نہیں۔ خلوص و اخلاص ہو گا تو وقت آنے پر وہ باہم جڑتے چلے جائیں گے۔ اور اگر چلنا ہی نہیں ہے تو تم بھی کھڑے ہو‘ ہم بھی کھڑے ہیں ع زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد —— یہ ہے طرزِ عمل جو ہمارا آج ہے۔ اور بعض لوگوں کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ نہ چلیں گے نہ چلنے دیں گے‘ نہ کھیلیں گے نہ کھیلنے دیں گے۔ تو ہر طرزِ عمل آپ کو مل جائے گا۔ لیکن جسے بھی چلنا ہے اور اس کی چلنے کی نیت ہے تو وہ کوئی قافلہ تلاش کرے اور جس پر بھی دل مطمئن ہو جائے اس میں شامل ہو جائے۔ اس کے بعد آنکھیں کھلی رکھے‘ کان کھلے رکھے‘ دائیں بائیں دیکھتا رہے‘ اس سے بہتر قافلہ ملے تو اس کی طرف لبیک کہے۔ آخر دُنیوی معاملات میں بھی ہمارا طرزِ عمل یہی ہوتا ہے نا کہ ع ”ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!“ —— یہ تو نہیں ہوتا کہ آپ کہیں کہ اب میں ایک کاروبار شروع کر چکا ہوں‘ کیا کروں؟ اس میں تو منافع نہیں ہے‘ ہے تو بہت قلیل‘ اصل میں مجھے فلاں کاروبار کرنا چاہیے تھا۔ بلکہ آپ اپنے کاروبار کی بساط لپیٹیں گے اور کوئی دوسرا کام شروع کر دیں گے۔

حرفِ آخر

حضرات! یہ چھ باتیں میں نے آپ کے سامنے رکھ دیں۔ ان سے ہمارے سامنے اپنے دینی فرائض کا ایک صحیح اور جامع خاکہ آ گیا ہے‘ اس کے علاوہ باقی تو ساری تفاصیل ہیں۔ اگر خاکہ نامکمل رہے گا تو آپ کا فرائضِ دینی کا تصور نامکمل رہے گا‘ لہٰذا ایک مکمل اور جامع خاکہ سامنے ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد اصل ضرورت قدم بڑھانے کی ہے۔ اگر آپ نے منزلِ مقصود کے تعین کے ساتھ سفر کا آغاز کر دیا تو اگر منزل تک نہ بھی پہنچ سکے تب بھی آپ کامیاب ہیں۔ ہمارے دین کا معاملہ یہ ہے کہ اللہ کے ہاں اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہو گا۔ جو شخص گھر سے ہجرت کی نیت سے مدینہ کے لیے نکلا تو خواہ وہ مدینہ پہنچ سکا یا نہیں پہنچ

سکا‘ وہ مہاجر ہے۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص ہجرت کی نیت سے گھر سے نکل آیا اور راستہ ہی میں اسے موت آ گئی تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ثابت ہو گیا:

﴿وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۰۰)

لہٰذا جو آغاز کر دے اس کا اجر محفوظ ہے۔ رہا یہ سوال کہ کہاں تک پہنچ پائیں گے‘ اس کا کوئی پتا نہیں۔ شہیدینؒ کی تحریک اگرچہ دُنیوی اعتبار سے ناکام ہو گئی اور وہ خاک و خون میں لوٹ گئے‘ لیکن وہ اللہ کے ہاں فلاح پائیں گے۔ اگر دُنیوی لحاظ سے بھی یہ تحریک کامیاب ہو گئی ہوتی تو پورا برعظیم پاک و ہند دارالاسلام بن سکتا تھا۔ ورنہ یہ علاقہ جو پاکستان کہلاتا ہے‘ ضرور دارالاسلام بن جاتا۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ اس تحریک کی ناکامی میں اصل ہاتھ کن لوگوں کا تھا! سکھوں کی تلواریں اسے ختم نہیں کر سکتی تھیں‘ خود اپنوں کی غداری نے اسے ختم کیا تھا۔

ایک بندۂ مؤمن کا اصل نصب العین رضائے الٰہی کا حصول اور محاسبۂ اُخروی میں کامیابی ہے۔ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے قرآن حکیم اور سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ہمیں ہمارے دینی فرائض کا ایک مکمل خاکہ ملتا ہے‘ جو تین جامع ترین اصطلاحات عبادتِ ربّ‘ شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کے حوالے سے ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ اس کے لوازم بھی کسی قدر تفصیل سے بیان ہو گئے ہیں جن میں اہم ترین لوازم جہاد فی سبیل اللہ‘ التزامِ جماعت اور بیعت سمع و طاعت ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم ان دینی فرائض کی بجا آوری کا مصمم ارادہ دلوں میں پیدا کریں اور پھر اس ارادے کی تکمیل کے لیے پیش قدمی کریں۔ وَمَا توفیقی اِلاَّ باللّٰہ العلیّ العظیم

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ
وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ OO

بابِ دوم

رسولِ انقلاب کا طریقۂ انقلاب

بابِ دوم

رسولِ انقلاب کا طریقۂ انقلاب

گزشتہ صفحات میں بحمداللہ یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ بندۂ مومن کے دینی فرائض میں ایک اہم فریضہ ''فریضۂ اقامتِ دین'' بھی ہے جس پر مفصّل بحث گزشتہ باب میں ''دینی فرائض کے جامع تصور'' کے ضمن میں ہوچکی ہے۔ اس حوالے سے ایک اہم سوال یہ سامنے آتا ہے کہ فی زمانہ اس فریضے کی ادائیگی کا طریقۂ کار کیا ہوگا۔ اسی مسئلے پر روشنی ڈالنے کے لئے بانی محترمؒ نے اولاً ۸۵۔۱۹۸۴ء میں مسجد دارالسلام باغِ جناح لاہور میں مسلسل گیارہ خطباتِ جمعہ میں ''منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ'' کو موضوعِ گفتگو بنایا اور سچی بات تو یہ ہے کہ موضوع کا حق ادا کردیا۔ ان خطبات کے مجموعے پر مشتمل ایک ضخیم کتاب اسی عنوان سے محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحبؒ کی کاوشوں سے منظرِ عام پر آچکی ہے اور بے پناہ افادیت کی حامل ہے۔ بعدازاں بانی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اسی موضوع کو مختصر مگر حد درجہ جامعیت کے ساتھ ''رسولِ انقلاب کا طریقِ انقلاب'' کے عنوان سے ۱۶ر مئی ۲۰۰۴ء کو الحمرا ہال لاہور میں اہلِ علم ودانش کے اجتماع میں بیان کیا جسے بعد میں ترتیب دے کر کتابچے کی صورت میں شائع کیا گیا۔

تنظیمِ اسلامی نے اقامتِ دین کی جدوجہد کا جو طریقہ اسوۂ رسولؐ کی روشنی میں اختیار کیا ہے اُسے سمجھنے کے لئے یہ دونوں کتابیں انتہائی مفید ہیں۔ البتہ اختصار کے پیشِ نظر زیرِ نظر تالیف میں طریقۂ کار کی وضاحت کے لئے بانی محترمؒ کے مؤخرالذکر خطاب یعنی ''رسولِ انقلاب کا طریقِ انقلاب'' کو شاملِ اشاعت کیا جارہا ہے۔ (مرتب)

رسول انقلابؐ کا طریقِ انقلاب

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ﴾

(التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' الصف:۹)

﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا﴾ (سبا:۲۸)

﴿لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنۡ کَانَ یَرۡجُوا اللّٰهَ وَالۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰهَ کَثِیۡرًا﴾ (الاحزاب:۲۱) ...... صدق اللّٰہ العظیم

معزز حاضرین اور محترم خواتین' السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں اپنے موضوع پر براہِ راست گفتگو سے قبل آپ کے سامنے ایک سوال رکھ رہا ہوں کہ آج اُمتِ مسلمہ کی سب سے بڑی ضرورت کیا ہے؟ ہر شخص سوچے کہ کیا مال و دولت' حکومت' تعلیم' ٹیکنالوجی یا جمہوریت میں سے کوئی چیز ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے؟ میرے تجزیے کے مطابق آج اُمتِ مسلمہ کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ اسلامی انقلاب برپا کرنے کے اس طریقِ کار کو سمجھ لے جس طریقے پر محمد رسول اللہ ﷺ نے انقلاب برپا کیا۔ میری سوچ کے یہ پہلو تو آپ حضرات پر واضح ہوں گے کہ اس وقت عالمی پیمانے پر اُمتِ مسلمہ جس زبوں حالی کا شکار ہے یہ اصل میں عذابِ الٰہی ہے جس میں ہم مبتلا ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم زمین پر اللہ کے دین کے نمائندے بنائے گئے تھے' لیکن ہم آج پوری دنیا میں کوئی ایک ملک بھی بطور ماڈل ایسا نہیں دکھا سکتے جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکیں کہ لوگو آؤ' دیکھو' یہ ہے نظامِ مصطفیٰ ﷺ —— یہ ہیں اللہ کے دینِ حق کے قیام کی برکات! لہٰذا ہم اللہ کے عذاب کی گرفت میں ہیں۔ یہ بات جان لیجئے کہ اللہ کے اِذن کے بغیر بھارت اور امریکہ سمیت دنیا کی کوئی طاقت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ گویا اس وقت دنیا میں ہمارا جو حال ہو رہا ہے وہ اِذنِ ربّ ہی سے ہو رہا ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ہم اللہ کے دین کی صحیح نمائندگی نہیں کر رہے' بلکہ اپنے عمل سے اسے misrepresent کر رہے ہیں۔ تو اس کا حل ایک ہی ہے

کہ ہم کم از کم دنیا کے کسی ایک ملک میں صحیح صحیح اسلامی نظام قائم کر کے دکھا دیں۔ اور پھر دنیا کو دعوت دیں کہ آؤ، دیکھو یہ ہے اسلام!

ملکی اور قومی سطح پر پاکستان کے بارے میں بھی میرا یہ موقف آپ کے علم میں ہے کہ پاکستان کے خاتمے کی الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے۔ اس لئے کہ یہ اپنے قیام کی وجہ جواز کھو بیٹھا ہے۔ البتہ ابھی اللہ کی طرف سے ایک مہلت باقی ہے اور اب اس کے بقاء واستحکام کی صرف ایک صورت ہے کہ یہاں پر اسلامی انقلاب برپا ہو۔ یہ ملک اسی مقصد کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ بانی و مؤسس پاکستان قائداعظم نے کہا تھا کہ ہم پاکستان اس لئے چاہتے ہیں کہ اسلام کے اصولِ حریت واخوت ومساوات کا ایک عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کریں۔ یہی بات مفکر ومبشر ومصورِ پاکستان علامہ اقبال نے فرمائی تھی۔

تیسری طرف یہ دیکھئے کہ عالمی سطح پر اس وقت دنیا کی سب سے بڑی قوت امریکہ اور اس کے حواری اس بات پر تُل گئے ہیں کہ دنیا میں کہیں پر اسلامی نظام کا ظہور نہ ہو۔ یہ وہی بات ہے جو علامہ اقبال نے ابلیس کی زبان سے کہلوائی تھی۔

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

آج امریکہ اور پوری مغربی دنیا پر بالفعل یہ خوف طاری ہے کہ کہیں دنیا کے کسی کونے میں شرعِ پیغمبرؐ کا عملی ظہور نہ ہو جائے۔ ظاہر بات ہے کہ "جَاءَ الْحَقُّ" کے بعد "زَهَقَ الْبَاطِلُ" اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور یہ خوف ان پر اس درجے مسلط ہے کہ ان کی پوری گلوبل پالیسی اسی پر مرکوز ہو گئی ہے۔ اس لئے کہ انہیں نظر آ رہا ہے کہ عالمِ اسلام کے اندر اسلامی نظام کو قائم کرنے کا جذبہ انگڑائیاں لے رہا ہے اور یہ جذبہ ان کے اعتبار سے بہت خوفناک جذبہ ہے۔ اس ضمن میں کمی صرف یہ ہے کہ ابھی اُس جذبے کو صحیح راہِ عمل نہیں مل رہی اور محض جذبہ اس وقت تک ناکافی ہے جب تک اسے صحیح لائحہ عمل بھی نہ مل جائے۔

ان تینوں زاویوں کے حوالے سے میری بات جس نقطے پر آ کر مرکوز ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کو نظامِ زندگی کے طور پر نافذ وغالب کرنے کے لئے صحیح لائحہ عمل واضح کیا جانا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اور صحیح لائحہ عمل وہی ہوگا جو سیرت النبیؐ سے ماخوذ ہو۔ ہم نے وہ احادیث ایک جگہ جمع کر کے بہت عام کی ہیں جن سے یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ قیامت سے قبل پوری دنیا میں اسلام کا بول بالا ہوگا اور کفار کا "نیو ورلڈ آرڈر" نہیں، اسلام کا "Just World Order" پوری دنیا پر غالب ہو کر

رہے گا۔ یہ جس ''نیو ورلڈ آرڈر'' کو دنیا پر مسلط کرنا چاہتے ہیں وہ درحقیقت ''جیو (یہودی) ورلڈ آرڈر'' ہے' جبکہ اسلامک ورلڈ آرڈر منصفانہ اور عادلانہ نظام ہے اور اس کے بارے میں محمد رسول اللہ ﷺ نے خوشخبری دی ہے کہ یہ قیامت سے قبل پوری دنیا پر غالب ہوگا۔ظاہر بات ہے کہ اسلام کے عالمی غلبے کا آغاز اسی طور سے ہوگا کہ یہ نظام پہلے کسی ایک ملک میں قائم ہوگا' جیسے حضور ﷺ کے دستِ مبارک سے ''جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ'' کی کیفیت جزیرہ نمائے عرب میں پیدا ہوئی تھی۔ دنیا کے کسی ایک ملک میں بھی یہ نظام کیسے قائم ہوگا؟ اس کے ضمن میں امامِ دارالہجرت امام مالکؒ کا قول ہے: ''لَا یَصْلُحُ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا''یعنی اس اُمت کے آخری حصے کی اصلاح نہیں ہو سکے گی' مگر اسی طریقے پر جس پر کہ پہلے حصے کی اصلاح ہوئی تھی۔ چنانچہ آج اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے ہمیں محمد رسول اللہ ﷺ کے انقلاب کا طریقِ کار اچھی طرح سمجھنا ہوگا اور پھر اسے apply کرنا ہوگا۔

میں نے یہ چند باتیں بطور تمہید عرض کی ہیں تاکہ آج کی گفتگو کی اہمیت آپ پر واضح ہو جائے۔آج غلبۂ اسلام کے لئے لوگوں کے جذبے میں کمی نہیں ہے' لیکن صحیح لائحہ عمل پیش نظر نہ ہونے کے باعث تحریکیں اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہیں اور ان کا حال بالفعل یہ ہوگیا ہے کہ ؎

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے!

اسلامی انقلاب کے لئے صحیح لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا جو صرف اُسوۂ رسول ﷺ میں ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ یعنی تمہارے لئے اللہ کے رسولؐ کی شخصیت اور حیاتِ طیبہ میں ایک بہت عمدہ نمونہ موجود ہے۔لیکن اس ''اسوۂ حسنہ'' سے استفادے کی تین شرائط ہیں' جو ساتھ ہی بیان فرما دی گئی ہیں:﴿لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾ یعنی اس سے استفادہ وہی کر سکیں گے (۱) جو اللہ سے ملاقات کے امیدوار ہیں' (۲) جو یومِ آخرت پر یقین رکھتے ہیں' اور (۳) جو کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ یہی لوگ اس اسوۂ حسنہ سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ جیسے قرآن ''هُدًى لِّلنَّاسِ'' یعنی تمام نوعِ انسانی کے لئے ہدایت ہے' لیکن اس کی ہدایت سے فائدہ وہی لوگ اٹھا سکیں گے جس کے اندر تقویٰ موجود ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کے آغاز ہی میں واضح کر دیا گیا کہ یہ ''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' ہے۔

انقلاب کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

اس تمہیدی گفتگو کے بعد سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ انقلاب کسے کہتے ہیں۔ اس کے لفظی معنی ہیں تبدیلی۔ لہٰذا ہم یہ لفظ کسی بھی لفظ کے ساتھ جوڑ کر استعمال کر لیتے ہیں۔ مثلاً علمی انقلاب' ثقافتی انقلاب' سائنسی انقلاب' فوجی انقلاب۔ لیکن لفظ ''انقلاب'' کے اصطلاحی مفہوم میں اس استعمال کی گنجائش نہیں۔ بلکہ کسی معاشرے کے سیاسی نظام' معاشی نظام یا سماجی نظام میں سے کسی ایک میں بنیادی تبدیلی کو صحیح انقلاب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ آج دنیا بھر میں انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم مانا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک حصہ فرد کی انفرادی زندگی سے متعلق ہے' جبکہ دوسرا حصہ زندگی کے اجتماعی معاملات کو محیط ہے۔ ان میں سے مقدم الذکر حصہ مذہب کا دائرۂ کار ہے' جو کہ عقائد (dogmas)' مراسم عبودیت (rituals) اور سماجی رسومات (social customs) پر مشتمل ہے۔ آج دنیا بھر میں ان معاملات میں فرد کو آزاد تسلیم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کہ وہ جس طرح کے چاہے عقائد اپنا لے۔ چاہے وہ ایک خدا کو مانے' چاہے سو کو مانے یا ہزار کو مانے' چاہے کسی کو بھی نہ مانے۔ جس طرح چاہے مراسمِ عبودیت بجا لائے۔ چاہے گوشہ نشین ہو کر تپسیائیں کرے' چاہے بتوں کے آگے سجدے کرے' یا ایک نادیدہ خدا کی پرستش کرے۔ مراسمِ عبودیت کی اسے آزادی ہے۔ چاہے روزے رکھے' نماز پڑھے' چاہے مندر میں جائے یا چرچ میں' اجازت ہے۔ اسی طرح سماجی رسومات ادا کرنے میں وہ آزاد ہے۔ شادی کے موقع پر چاہے نکاح پڑھوائے چاہے پھیرے ڈلوائے۔ فوت شدہ شخص کی میت کو چاہے دفن کیا جائے چاہے اسے جلا دیا جائے۔

زندگی کا دوسرا حصہ تہذیب' تمدن' ریاست اور سیاست یعنی اجتماعی نظام سے متعلق ہے اور یہ سیاسی نظام' معاشی نظام اور سماجی نظام (The Politico-Socio-Economic System) پر مشتمل ہے۔ اس کا تعلق مذہب سے نہیں ہے۔ اس کا نام سیکولرزم ہے۔ واضح رہے کہ سیکولرزم کا مطلب لامذہبیت نہیں ہے' بلکہ یہ ہمہ مذہبیت' لادینیت کے اصول پر مبنی ہے۔ سیکولرزم میں مذہب تو سارے قابلِ قبول ہیں۔ یہ بات تو بش بھی کہتا ہے کہ ''We are ready to embrace Islam'' اسلام بطور مذہب پر انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے امریکہ میں آ کر سینیگاگ اور چرچ خریدے اور انہیں مساجد بنا لیا' ہم نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ انہوں نے یہاں بڑی تعداد میں ایفرو امریکنز کو اور کچھ گوروں کو بھی convert کر کے مسلمان بنا لیا' ہم نے

کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس لئے کہ بحیثیتِ مذہب ان کی اسلام سے کوئی جنگ نہیں ہے' لیکن ایک نظام (Politico-Socio-Economic system) کی حیثیت سے اسلام انہیں قطعاً گوارا نہیں۔ اسلام کے اسی تصور کو وہ فنڈ امنٹلزم کا نام دیتے ہیں۔ اور اس وقت چونکہ کچھ فنڈ امینٹلسٹ لوگوں نے جو طریقہ کار اختیار کیا ہے اس پر دہشت گردی کا لیبل لگ گیا ہے' لہٰذا وہ فنڈ امینٹلزم کو دہشت گردی (Terrorism) کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ کبھی وہ ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کا نعرہ لگاتے ہیں تو کبھی ''بنیاد پرستی کے خلاف جنگ'' کا۔ حقیقت میں یہ جنگ اسلام کے نظامِ حیات کے خلاف ہے۔ یہ جنگ اسلام کے عقائد' عبادات اور رسومات کے خلاف نہیں ہے۔

آج کی اصطلاح میں انقلاب اس اجتماعی نظام میں کسی تبدیلی کو کہتے ہیں۔ مذہبی میدان میں کسی بڑی سے بڑی تبدیلی کو بھی انقلاب نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بہت اہم نکتہ ہے' اس کو سمجھ لیجئے۔ تاریخِ انسانی میں سب سے بڑی مذہبی تبدیلی ۳۰۰ عیسوی میں ہوئی تھی جب شہنشاہِ روم قسطنطینِ اعظم نے عیسائیت اختیار کر لی تھی اور ساری سلطنت عیسائی ہو گئی تھی۔ مذہبی تاریخ کے اندر اتنی بڑی تبدیلی (Conversion) کبھی نہیں ہوئی۔ سلطنت روما اُس وقت تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی' یعنی پورا شمالی افریقہ' پورا مشرقی یورپ اور پورا مغربی ایشیا۔ لیکن اتنی بڑی مذہبی تبدیلی کا نام کبھی انقلابات کی تاریخ میں نہیں گنوایا گیا۔ اس لئے کہ اس مذہبی تبدیلی سے سیاسی' معاشی یا سماجی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ انقلاب (Revolution) وہ تبدیلی کہلائے گی جو کسی ملک کے سیاسی نظام' معاشی نظام' یا سماجی نظام سے متعلق ہو اور بنیادی نوعیت کی ہو۔

کامل انقلاب کی واحد مثال: انقلابِ نبویؐ

اب ہم دنیا کے چند مشہور انقلابات کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان میں ''انقلابِ فرانس'' بہت مشہور ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ واقعی انقلاب تھا۔ لیکن اس سے صرف سیاسی نظام میں تبدیلی آئی تھی۔ مذہب پہلے بھی عیسائیت تھا' بعد میں بھی وہی رہا۔ سماجی ڈھانچے (Social Structure) میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تو انقلابِ فرانس میں صرف سیاسی نظام تبدیل ہوا۔ دوسرا بہت مشہور انقلاب روس کا بالشویک انقلاب ہے جو ۱۹۱۷ء میں آیا۔ اس سے صرف معاشی نظام تبدیل ہوا۔ تمام ذرائع پیداوار قومیا لئے گئے اور انفرادی ملکیت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ نوٹ کیجئے کہ یہ دونوں انقلابات ہیں جبکہ

رومن امپائر کا بیک وقت کرسچین ہو جانا انقلاب نہیں ہے۔

اب ذرا محمد رسول اللہ ﷺ کے برپا کردہ انقلاب کا جائزہ لیجئے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ کیا واقعی حضور ﷺ نے انقلاب برپا کیا —— یا ہم صرف جوشِ عقیدت میں یہ دعویٰ کر بیٹھتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا کیا۔ یہ بات میں جذباتی انداز سے نہیں بلکہ ٹھنڈے تجزیے (Cold Analysis) سے ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے تو میں اس پر اغیار کی گواہیاں پیش کروں گا' اس لئے کہ ''اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ '' (اصل فضیلت وہ ہوتی ہے جس کا دشمن بھی اقرار کریں)۔ دوست اور اعتقاد رکھنے والے تو ہر چیز کی تعریف ہی کریں گے' اصل تعریف وہ ہے جو دشمن کی زبان سے ہو۔ اگر شیر دل کنگ رچرڈ نے صلاح الدین ایوبی کی تعریف کی تو معلوم ہوا کہ واقعتاً صلاح الدین ایوبی بڑی عظیم شخصیت تھی۔

ایم این رائے ایک بنگالی ہندو تھا اور وہ انٹرنیشنل کمیونسٹ آرگنائزیشن کا رکن تھا۔ اس نے ۱۹۲۰ء میں بریڈلا ہال لاہور میں ''اسلام کا تاریخی کردار'' (The Historical Role of Islam) کے عنوان سے لیکچر دیا اور کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب محمد (ﷺ) نے برپا کیا۔ واضح رہے کہ وہ عقیدت مند نہیں ہے' ایک بنگالی ہندو ہے اور ٹاپ کا کمیونسٹ ہے' لیکن وہ یہ بات تسلیم کر رہا ہے۔ یہ تو ۱۹۲۰ء کی بات ہے' یعنی صدی کے آغاز سے ۲۰ برس بعد۔ اب ۱۹۸۰ء پر آجایئے' صدی کے اختتام سے ۲۰ برس قبل —— امریکہ میں ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے کتاب ''The 100'' لکھی۔ اس کتاب میں اُس نے پانچ ہزار سالہ معلوم انسانی تاریخ میں سے ایسے ایک سو انسانوں کا انتخاب (selection) کر کے ان کی درجہ بندی (gradation) کی' جنہوں نے انسانی تمدن کے دھارے کے رخ کو موڑنے میں مؤثر کردار ادا کیا۔ اور اس درجہ بندی میں وہ نمبر ایک پر لایا محمد رسول اللہ ﷺ کو۔ ڈاکٹر مائیکل ہارٹ مذہب کے اعتبار سے عیسائی ہے اور میری اطلاع کی حد تک ابھی زندہ ہے' اور مین ہٹن میں رہائش پذیر ہے۔ اس کی یہ کتاب دنیا میں بہت عام ہوئی ہے' لیکن اشاعت کے بعد وہ بہت جلد نایاب ہو گئی تھی اور عام خیال یہ تھا کہ شاید کسی سازش کے تحت اسے غائب کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس نے اس کتاب میں (عیسائیوں کے نزدیک خدا کے اکلوتے بیٹے) حضرت مسیح علیہ السلام کو نمبر تین پر رکھا اور حضور ﷺ کو نمبر ایک پر لایا' اور یہ بات عیسائی دنیا کے لئے قابلِ قبول اور قابلِ برداشت نہیں تھی۔ اس نے لکھا ہے:

"My choice of Muhammad to lead the list of the world's most influential persons may surprise some readers and may be questioned by others, but he was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."

ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کے نزدیک انسانی زندگی کے دو علیحدہ علیحدہ میدان ہیں۔ ایک ہے مذہب' اخلاق اور روحانیت کا میدان' جبکہ ایک ہے تمدن' تہذیب' سیاست اور معاشرت کا میدان' اور ان دونوں میدانوں میں انتہائی کامیاب (Supremely successful) انسان تاریخ انسانی میں صرف اور صرف ایک ہی ہیں اور وہ ہیں حضرت محمد ﷺ۔ جن لوگوں کو بالعموم بڑا سمجھا جاتا ہے ان کی عظمت کسی ایک پہلو سے نمایاں ہوتی ہے۔ عبادت گزاری اور نفس کشی میں گوتم بدھ بہت اونچا ہے۔ اخلاقی تعلیمات کے اعتبار سے حضرت مسیحؑ بہت اونچے ہیں' لیکن ریاست' حکومت اور سیاست میں ان کا کوئی دخل نہیں۔ فتوحات اور ملک گیری کے حوالے سے سکندرِ اعظم بہت اونچا ہے' اٹیلا بہت اونچا ہے' چنگیز خان بہت اونچا ہے' اکبر اعظم بہت اونچا ہے۔ اور بھی بڑے بڑے حکمران ہو گزرے ہیں —— لیکن دین' اخلاق اور روحانیت میں ان کا کوئی مقام تھا؟ یہاں زیرو سے بھی کام نہیں چلے گا' minus لانا پڑے گا۔ تاریخِ انسانی میں صرف اور صرف ایک ہی انسان ہے جو ہر دو اعتبار سے بلند ترین اور کامیاب ترین قرار پاتا ہے —— اور وہ ہیں محمد رسول اللہ ﷺ۔

اغیار کی گواہیوں میں سے تیسری گواہی میں ایچ جی ویلز کی دیا کرتا ہوں' لیکن اس کی جس عبارت کا میں حوالہ دیتا ہوں' اس کی کتاب ''A Concise History of the World'' کے نئے ایڈیشن سے اس عبارت کو نکال دیا گیا ہے۔ واقعتاً کسی دشمن کی زبان سے اس سے بڑا خراجِ تحسین ممکن نہیں۔ اس لئے کہ ایچ جی ویلز بدترین دشمن ہے۔ اس نے حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین (دو بدبخت جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے) ان سے کہیں زیادہ زہریلے اور ان سے کہیں زیادہ کمینگی والے جملے کہے ہیں۔ لیکن جب اُس نے آنحضور ﷺ کے خطبہ حجۃ الوداع کے مندرجہ ذیل الفاظ کا حوالہ دیا ہے تو وہ گھٹنے ٹیک کر خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

((یَا اَیُّهَا النَّاسُ ! اَلَا اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ ' اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰی

اَعْجَمِيّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰی عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی)) (مسند احمد' ح ۲۲۹۷۸)

''لوگو! آگاہ ہو جاؤ' یقیناً تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ خبردار! نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر۔ اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر۔ فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے۔''

ایچ جی ویلز اگرچہ عیسائی ہے' لیکن خطبہ حجۃ الوداع کا حوالہ دینے کے بعد وہ یہ اعتراف کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے:

''اگرچہ انسانی اخوت' مساوات اور حریت کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے اور ایسے وعظ ہمیں مسیح ناصری کے ہاں بھی بہت ملتے ہیں' لیکن یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ یہ محمد (ﷺ) ہی تھے جنہوں نے تاریخِ انسانی میں پہلی بار ان اصولوں پر ایک معاشرہ قائم کیا۔''

چنانچہ دشمنوں کی گواہی سے بھی یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب تھا جو محمد رسول اللہ ﷺ نے برپا فرمایا۔ انقلابِ محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس سے تقابل کریں تو نظر آتا ہے کہ انقلابِ فرانس میں صرف سیاسی نظام بدلا اور انقلابِ روس میں صرف معاشی نظام تبدیل ہوا ـــــــ لیکن انقلابِ محمدیؐ میں ہر چیز بدل گئی۔ مذہب بھی بدل گیا' عقائد بھی بدل گئے' رسومات بھی بدل گئیں' سیاسی نظام بھی بدل گیا' معاشی نظام بھی بدل گیا' معاشرت بھی بدل گئی۔ کوئی بھی شے اپنی سابقہ حالت پر قائم نہیں رہی۔ ڈھونڈ کر بتایئے کہ فلاں چیز جوں کی توں رہ گئی۔ جہاں پڑھے لکھے لوگ انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے' اس قوم کو آپ ﷺ نے علم کے میدان میں دنیا کا امام بنا دیا۔ انہوں نے نئے نئے علوم ایجاد کئے' پوری دنیا کا علم سمیٹ کر' ہندوستان اور یونان تک سے علم لے کر' اور اسے مزید develop کر کے دنیا کے سامنے رکھا۔ تو پہلی بات یہ ثابت ہوئی کہ دنیا کا جامع ترین' گھمبیر ترین اور most profound انقلاب محمد عربی ﷺ کا انقلاب تھا' کوئی دوسرا انقلاب اس کے مقابلے میں نہیں آسکتا۔ باقی سب جزوی (partial) انقلابات تھے۔ باقی تمام انقلابات میں آپ دیکھیں گے کہ فکر اور دعوت دینے والے کچھ اور لوگ تھے جبکہ انقلاب برپا کرنے والے کچھ اور۔ مارکس اور اینجلز نے کتاب Das Capital جرمنی یا انگلستان میں بیٹھ کر لکھی' لیکن جرمنی اور انگلستان کے کسی ایک گاؤں میں بھی مارکسسٹ انقلاب نہیں آیا' بلکہ تیسرے تیواڑے کہاں جا کر روس میں بالشویک اور مانشویک کے ہاتھوں

انقلاب آیا‘ اور عین وقت پر فرنٹ پر لینن آ گیا۔ اس انقلاب کے برپا کرنے میں نہ مارکس کا کوئی حصہ ہے نہ اینجلز کا۔ تو فکر دینے والے اور تھے‘ اور انقلاب برپا کرنے والے اور۔ اسی طرح والٹیئر اور روسو جیسے بے شمار اصحابِ قلم تھے جنہوں نے حریت‘ آزادی اور جمہوریت کا ایک فکر دیا تھا‘ لیکن وہ محض ڈیسک ورکر تھے‘ کتابیں لکھ سکتے تھے‘ میدان میں آ کر قیادت نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا فرانس میں انقلاب برپا کیا اوباش اور بدمعاش لوگوں نے۔ یہی وجہ ہے کہ انقلابِ فرانس انتہائی خونیں انقلاب تھا۔ اسے کنٹرول کرنے والا کوئی تھا ہی نہیں اور ہجوم (mob) جو چاہے کر گزرے۔ اب ذرا contrast دیکھئے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا انقلاب دنیا کا واحد انقلاب ہے کہ ابتدا سے انتہا تک اس کی قیادت ایک ہی ہستی کر رہی ہے۔ ایک وقت میں وہی ہیں جو مکے میں street preaching کر رہے ہیں‘ گلی گلی گھوم کر دعوت دے رہے ہیں‘ تبلیغ کر رہے ہیں۔ کوئی پاگل کہتا ہے‘ کوئی مجنون کہتا ہے‘ کوئی کہتا ہے شاعر ہیں۔ آپ ﷺ سب برداشت کر رہے ہیں۔ آپؐ نے کبھی پلٹ کر نہیں کہا پاگل تم ہو۔ لیکن وہی شخص ہے جو میدانِ بدر میں فوج کی کمان کر رہا ہے۔ کوئی ہے تاریخ میں اس کی مثال؟ میں پھر ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کے وہی الفاظ دہراؤں گا کہ He is the only, the only, the only person —— کہاں گلی گلی دعوت دینے والا ایک شخص‘ کہاں ایک فوج کی کمان کرنے والا قائد —— کوئی ہے مناسبت؟

اس حوالے سے ایک بڑی اہم بات نوٹ کیجیے کہ ٹائن بی پچھلی صدی کا ایک بہت بڑا فلاسفر آف ہسٹری گزرا ہے۔ اس نے حضور ﷺ کے بارے میں ایک بڑا زہر میں بجھا ہوا جملہ کہا ہے:

> *"Muhammad failed as a prophet, but succeeded as a statesman."*

یعنی ’’محمد (ﷺ) ایک نبی کی حیثیت سے تو ناکام ہو گئے (نقل کفر‘ کفر نباشد) البتہ ایک سیاست دان کی حیثیت سے کامیاب ہو گئے‘‘۔

ٹائن بی کے اس ایک جملے کی شرح میں انگلینڈ کے پروفیسر ڈاکٹر منٹگمری واٹ نے دو کتابیں لکھ دیں: Muhammad at Mecca اور Muhammad at Madina —— ’’محمد ایٹ مدینہ‘‘ میں اس نے بظاہر حضور ﷺ کے لئے تعریف کے جو الفاظ ممکن تھے superlative ڈگری میں استعمال کئے‘ لیکن بباطن اس نے ایک تضاد (contrast) ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ مکے والا محمدؐ تو کچھ اور تھا اور یہ مدینہ والا محمدؐ کچھ اور ہے۔ ان تعریفی الفاظ سے دھوکہ کھا کر ضیاء الحق مرحوم نے اس منٹگمری واٹ کو مرکزی سیرت کانفرنس کے اجلاس میں چیف سپیکر کی حیثیت سے بلا لیا تھا۔ انہیں اندازہ

ہی نہیں تھا کہ اس نے کس عیاری سے سیرتِ طیبہ میں یہ تضاد دکھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ دو محمد (ﷺ) علیحدہ علیحدہ ہیں' ان کی تصویریں مختلف ہیں۔

دراصل جب یہ لوگ حضور ﷺ کی مکے کی زندگی دیکھتے ہیں تو اگرچہ وہ آپ ﷺ کو نبی یا رسول نہیں مانتے لیکن وہ یہ ضرور مانتے ہیں کہ آپؐ کی زندگی نبیوں سے کچھ مشابہ ہے۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام گھوم پھر کر تبلیغ کرتے تھے' ایسے ہی حضرت محمد ﷺ دکھائی دے رہے ہیں۔ جیسے حضرت عیسیٰؑ کو جو کچھ کہا گیا انہوں نے برداشت کیا' کوئی جواب نہیں دیا' اسی طرح کا طرزِ عمل حضرت محمد ﷺ نے بھی اختیار کیا۔ چنانچہ ان کے نزدیک یہ تو کچھ نبیوں والا نقشہ ہے' جس میں آپؐ (معاذ اللہ) فیل ہو گئے۔ یہاں سے تو' بقول ان کے' جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ وہ ہجرت کو flight (فرار) کا نام دیتے ہیں' حالانکہ flight تو کسی خوف کی بنیاد پر ہوتی ہے' جبکہ ہجرت خوف کی وجہ سے نہیں تھی' بلکہ یہ ایک حکمت عملی (strategy) تھی اور اس کا مقصد اپنے لئے متبادل Base تلاش کرنا تھا۔ بہر حال ان مستشرقین کو مدینے میں فرو کش ایک بالکل نئے محمد (ﷺ) نظر آ رہے ہیں جو بڑے مدبر سیاستدان ہیں' جو ایک ریاست کے حکمران ہیں' جو فوج کے کمانڈر ہیں۔ یہاں آ کر آپؐ یہودیوں سے معاہدے کر رہے ہیں۔ یہاں پر ان کے تدبر' statesmanship اور موقع شناسی کا کمال ظاہر ہو رہا ہے۔ ان کے نزدیک یہ آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا تضاد ہے۔

اس کا حوالہ صرف اس لئے دے رہا ہوں کہ حضور ﷺ کی زندگی اس اعتبار سے واقعتاً contrast کی حامل ہے کہ ایک انقلابی دعوت کا آغاز بھی آپؐ نے کیا اور اسے کامیابی کی آخری منزل تک بھی خود پہنچایا۔ دنیا کے انقلابات میں سے کوئی بھی دوسرا انقلاب ایک حیاتِ انسانی کے عرصے (span) میں پورا نہیں ہوا' بلکہ فکر دینے والے مر کھپ گئے' بعد میں کہیں وہ فکر پروان چڑھا اور اس کی بنیاد پر کہیں انقلاب آ گیا۔ جبکہ محمد رسول اللہ ﷺ کا انقلاب اس اعتبار سے منفرد اور لاثانی ہے کہ ایک انسانی زندگی کے اندر' کل ۲۳ سال کے عرصے میں' الف سے ی تک انقلاب کے تمام مراحل طے ہو گئے۔

اس سے میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ آج عہدِ حاضر میں اجتماعیات' سوشیالوجی یا پولیٹکل سائنس کا کوئی طالب علم پوری دیانت داری سے انقلاب کا صحیح طریق کار اخذ کرنا چاہے تو اسے صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے مکمل راہنمائی مل سکتی ہے۔ مارکس' اینجلز' لینن یا والٹیئر کی زندگیوں سے اس ضمن میں قطعاً کوئی راہنمائی حاصل نہیں ہوسکتی۔ گویا طریقِ انقلاب کے لئے اب دنیا کے سامنے صرف

ایک ہی منبع و سرچشمہ (source) ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ ہے۔ چنانچہ میں انقلاب کے طریقِ کار پر جو کچھ عرض کر رہا ہوں اس کے لئے میرا source صرف سیرتِ محمدیؐ ہے۔ میں اسلامی اصطلاحات دین‘ اسلام‘ ایمان‘ جہاد اور قتال استعمال کئے بغیر جدید اصطلاحات میں انقلاب کے مراحل آپ کے اوپر واضح کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دورِ زوال کے دوران ان اصطلاحات کا مفہوم محدود اور مسخ (limited and perverted) ہو گیا ہے اور ہم جب بھی کوئی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس کا وہی مسخ شدہ تصور ذہن میں آتا ہے۔ لہٰذا اگر ان اصطلاحات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے جدید terminology میں بات کی جائے تو انقلاب کا خاکہ نسبتاً آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ اس کے بعد مناسب ہوگا کہ اس خاکہ میں قرآن و حدیث کی اصطلاحات‘ سیرت النبی ﷺ اور واقعات کا رنگ بھر دیا جائے۔

انقلابی عمل کے لوازم و مراحل

ایک مکمل انقلاب کے چھ یا سات مراحل ہیں:

(۱) انقلابی نظریہ

ہر انقلاب کی پہلی ضرورت ایک ایسا انقلابی نظریہ اور انقلابی فلسفہ ہوتی ہے جو پہلے سے موجود Politico-Socio-Economic System کی جڑوں پر تیشہ بن کر گرے۔ اور جب تک اس کے اندر ایسی کاٹ موجود نہ ہو کہ یہ موجودہ سیاسی نظام کو کاٹتا ہو، معاشی نظام کو کاٹتا ہو، سماجی نظام کو کاٹتا ہو اس وقت تک وہ انقلابی نظریہ نہیں محض وعظ (Sermon) ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر وہ نظریہ اور فلسفہ نیا ہے تو معاملہ آسان ہے۔ وہ اپنی اصطلاحات خود وضع کرے گا اور ان اصطلاحات کے معنی خود معین کرے گا۔ لیکن اگر وہ کوئی پرانا نظریہ ہے تو اب اُس کی جدید تعبیر پیش کرنا ہوگی اور اس کی وضاحت دورِ حاضر کی جدید اصطلاحات کے مطابق وقت کی علمی سطح پر کرنا ہوگی۔ پھر اس نظریئے کو پھیلایا جائے، عام کیا جائے اور اس کے لئے دورِ جدید کے تمام میسر ذرائع ابلاغ استعمال کئے جائیں۔ پہلے کبھی صرف گلیوں بازاروں میں گھوم پھر کر لوگوں کو جمع کر کے دعوت دی جاسکتی تھی یا لوگوں کو کھانے پر بلا لیا جاتا اور ان کے سامنے کوئی بات رکھی جاتی۔ لیکن اب جلسے ہو سکتے ہیں، کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا سمیت دورِ جدید کے تمام ذرائع ابلاغ انقلابی نظریئے کی تشہیر و اشاعت کے لئے استعمال کئے جانے چاہئیں۔

(۲) تنظیم

دوسرے مرحلے کے طور پر جو لوگ اس نظریئے کو قبول کر لیں انہیں ایک ہیئت اجتماعی کے تحت منظّم کیا جائے۔ اس ہیئت اجتماعی یا تنظیم کی بھی دو شرطیں ہیں۔ اوّلاً یہ بڑی مضبوط ڈسپلن والی تنظیم ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ جب مقابلہ پیش آئے گا اور آپ موجودہ نظام کو ختم کرنے کے لئے میدان میں آئیں گے تو مراعات یافتہ طبقات جن کے اس نظام سے مفادات وابستہ ہیں، اس نظام کی پاسبانی کی

خاطر آپ کو کچلنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے ؏ ''نظامِ کہنہ کے پاسبانو یہ معرضِ انقلاب میں ہے!'' تب آپ کو ان کے مقابل ایک فوجی ڈسپلن کی ضرورت ہوگی۔ محض mob مقابلہ نہیں کر سکے گا' بلکہ یہاں ''listen & obey'' کے اصول کے تحت منظّم ہونے والی مضبوط جماعت درکار ہوگی جس کے ڈسپلن کا یہ عالم ہو کہ ؎

Their's not to reason why?

Their's but to do and die!

ثانیاً یہ کہ اس تنظیم میں کارکنوں کی حیثیت اور مرتبے کا تعین تحریک کے ساتھ وفاداری اور قربانی کی بنیاد پر ہونا چاہئے' نہ یہ کہ کوئی برہمن ہو تو اونچا ہے اور شودر ہو تو نیچا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ انقلابی تنظیم نہیں۔ انقلابی تنظیم میں تو ہر شخص کی commitment کی گہرائی اور تحریک کے ساتھ اس کی وابستگی اور وفاداری کی بنیاد پر اس کی حیثیت کا تعین ہوگا' یہ بھی دیکھا جائے گا کہ اس نے کتنی قربانی دی ہے۔ عین ممکن ہے کہ ایک شودر کمیونسٹ پارٹی میں اوپر چلا جائے اور برہمن نیچے رہ جائے۔

(۳) تربیت

تیسرا مرحلہ کارکنوں کی تربیت کا ہے۔ اس مرحلے میں انقلابی جماعت کے کارکنوں کے ذہنوں سے انقلابی نظریہ ایک لحظے کے لئے بھی اوجھل نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ اسی نظریئے پر تو ساری انقلابی جدوجہد کا دارومدار ہے۔ اگر وہ انقلابی نظریہ ذہنوں میں راسخ ہے تو عمل کا جذبہ بھی بیدار رہے گا اور اگر وہ نظریہ مدھم پڑ گیا تو جذبۂ عمل بھی ختم ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں ڈسپلن کا عادی بنایا جائے کہ سنیں اور مانیں۔ یہ آسان کام نہیں ہے' بلکہ اس کے لئے بڑی ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ بقول شاعر ؎

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی!

لیکن تسلیم کی خو ڈالنا آسان نہیں ہے۔ اس میں اپنی انا آڑے آ جاتی ہے' بلکہ انا سے بڑھ کر انانیت راستے کا پتھر بن جاتی ہے۔ انقلابی تربیت کا تیسرا ہدف یہ ہے کہ تحریک کے کارکنوں میں اپنا تن' من' دھن سب قربان کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اس کے بغیر انقلاب نہیں آ سکتا۔ بقول اقبال ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئنہ ہے وہ آئنہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں!

یہ تین تو انقلابی تربیت کے لازمی اجزاء ہیں۔ ان کے علاوہ چوتھا جزو یہ ہوگا کہ آپ انقلاب کے ذریعے سے جو نظام قائم کرنا چاہتے ہیں اس میں اگر کوئی روحانیت کا پہلو بھی مطلوب ہے تو کارکنوں کی روحانی تربیت بھی کرنا پڑے گی۔ کارکنوں کی روحانی تربیت کے بغیر انقلاب کے اندر روحانیت کہاں سے آ جائے گی؟

(۴) صبرِ محض (Passive Resistance)

یہ مرحلہ کہنے کو تو نمبر۴ ہے لیکن حقیقت میں اس کا آغاز پہلے مرحلے کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے۔ صبرِ محض (Passive Resistance) کا مطلب یہ ہے کہ انقلابی تحریک کے کارکن اپنے موقف پر ڈٹے رہیں، پیچھے نہ ہٹیں، لیکن تشدد و تعذیب کے جواب میں کسی قسم کی جوابی کارروائی نہ کریں۔ اس کی وجہ بہت منطقی (logical) ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ معاشرے کے اندر conflict پیدا کرنے والے یہی انقلابی لوگ ہوتے ہیں۔ ورنہ لوگ آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔ امراء بھی تھے اور غرباء بھی۔ غرباء اپنی قسمت پر راضی تھے، امراء اپنے ہاں عیش کر رہے تھے۔ غلام بیچارہ اپنا کام کر رہا ہے، اس کو پتا ہے میری قسمت یہی ہے، مجھے خدا نے غلام بنا دیا۔ اسی لئے مارکس نے کہا تھا کہ مذہب عوام کا افیون ہے، لہٰذا عوام اپنے حال پر صابر و شاکر رہتے ہیں اور انقلاب کے لئے نہیں اٹھتے۔ وہ نظام کے خلاف بغاوت نہیں کرتے۔ چنانچہ جیسے ایک پُرسکون تالاب جس میں کوئی لہریں نہ ہوں، اس میں آپ نے پتھر مار کر ارتعاش پیدا کر دیا ہو اسی طرح انقلابی لوگ پہلے سے قائم نظام کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں کہ یہ نظام غلط ہے، یہ ایک استحصالی (exploitative) اور استبدادی (repressive) نظام ہے۔ یہ انسانوں کے اندر امتیازات (discrimination) قائم کر رہا ہے۔ تو کس نے پتھر مارا؟ داعیانِ انقلاب نے! اب پتھر پانی میں جائے گا تو کچھ لہریں تو اٹھیں گی۔ تو معاشرے میں جو لہریں اٹھتی ہیں وہ انقلابی دعوت کا ایک فطری ردِّعمل ہیں۔ البتہ اس ردِّعمل کے بھی مختلف درجات اور stages ہوتی ہیں۔

ان میں دو stages بڑی اہم ہیں۔ پہلی stage میں کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو شخص داعی انقلاب بن کر سامنے آیا ہے اس کی کردار کشی کی جائے، کسی نہ کسی طرح اس کی شخصیت کو مجروح کیا جائے، اس کی ہمت کو توڑ دیا جائے اور اس کی قوتِ ارادی کو ختم کر دیا جائے۔ لہٰذا تشدد اور تعذیب (persecution) کا واحد نشانہ داعی کی ذات بنتی ہے۔ اور یہ ایذا رسانی اوّلاً زبانی ہوتی

ہے کہ یہ پاگل ہے‘ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے‘ ہمارا نظام ٹھیک ٹھاک صدیوں سے چلا آ رہا ہے‘ ہمارے آباء واجداد سے چلا آ رہا ہے‘ یہ اسے غلط کہتا ہے۔ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے یا شاید آسیب کا سایہ ہو گیا ہے‘ اس پر کوئی جن آ گیا ہے۔ اگر اس انداز سے داعی کی قوتِ ارادی کو ختم کر دیا جائے تو اس کی ہمت جواب دے جائے گی۔ اب کسی اور کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ درخت کی جڑ کٹ جائے تو سارا درخت خود بخود ہی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ داعی کھڑا رہ گیا‘ اپنی کردار کشی کی کوششوں کو برداشت کر گیا‘ جواباً اس نے یہ نہیں کہا کہ تم پاگل ہو‘ میں نہیں ہوں‘ تمہارا دماغ خراب ہے میرا نہیں ہے‘ اور مخالفین نے دیکھا کہ یہ دعوت تو آگے بڑھ رہی ہے اور لوگ اس کے گرد جمع ہو رہے ہیں تو پھر زبانی ایذا رسانی سے آگے بڑھ کر جسمانی تشدد و تعذیب کی stage کا آغاز ہو جاتا ہے اور اب اس کا نشانہ صرف داعی کی ذات نہیں بلکہ انقلابی تحریک کے تمام کارکن بالخصوص کمزور عوام اور اونچے گھرانوں کے نوجوان بنتے ہیں۔ اب انہیں مارا جاتا ہے‘ بھوکا رکھا جاتا ہے‘ گھروں سے نکال دیا جاتا ہے۔ جیلوں میں ٹھونسا جاتا ہے‘ انہیں قتل کیا جاتا ہے‘ فائرنگ سکواڈز کے سامنے کھڑے کر کے ان کو سینکڑوں کی تعداد میں گولیوں سے اڑا دیا جاتا ہے۔

اب یہاں ''صبرِ محض'' کی ضرورت ہے کہ اس سارے تشدد کو کسی جوابی کارروائی کے بغیر برداشت کیا جائے۔ اس لئے کہ شروع میں انقلابی تحریک کے کارکن تھوڑے سے ہوتے ہیں۔ اگر وہ بھی مشتعل (violent) ہو جائیں تو اس سسٹم کو حق حاصل ہو گا کہ انہیں کچل کر ختم کر دیا جائے۔ لیکن اگر وہ کچھ نہیں کر رہے‘ کوئی جوابی کارروائی نہیں کر رہے تو انہیں تشدد و تعذیب کا نشانہ تو بنایا جائے گا لیکن انہیں کچلا نہیں جا سکے گا۔ اس طرح انہیں مہلتِ عمل حاصل ہو جائے گی کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اپنی دعوت پہنچا سکیں اور اپنا تنظیمی Base زیادہ سے زیادہ وسیع کر سکیں۔ یہ موجودہ سسٹم سے اسی صورت میں براہِ راست ٹکر لے سکیں گے اگر ان کے پاس طاقت ہو گی۔ اور طاقت حاصل کرنے کے لئے ابھی انہیں وقت چاہئے‘ جسے میں ''to buy time'' کہتا ہوں۔ لہٰذا ابھی انہیں اپنے تحفظ میں بھی ہاتھ نہیں اٹھانا چاہئے۔ اس کا نہایت اہم نتیجہ یہ نکلے گا کہ انقلابی کارکنوں کو عوام الناس کی ہمدردیاں حاصل ہو جائیں گی۔ دیکھئے معاشرے میں جہاں چوہدری‘ سردار‘ سرمایہ دار اور جاگیردار ہیں وہاں عوام بھی ہیں۔ چوہدری‘ سردار‘ تعلقہ دار‘ جاگیردار اور سرمایہ دار تو یہ سمجھ رہے ہوتے ہیں کہ یہ ہمارے خلاف انقلاب کی جدوجہد ہو رہی ہے‘ جبکہ عوام تو یہ نہیں سمجھ رہے ہوتے‘

لیکن ان میں انقلابیوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کی ہمت نہیں ہوتی' وہ ان کی حمایت میں بول بھی نہیں سکتے۔ اسی کو ہم خاموش اکثریت (silent majority) کہتے ہیں۔ عوام کی اکثریت خاموش ہوتی ہے' لیکن وہ اندھے بہرے تو نہیں ہوتے۔ وہ دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے' انہیں کیوں مارا جا رہا ہے' کیوں قتل کیا جا رہا ہے' کیوں ان کے گھر بارود سے اڑائے جا رہے ہیں' کیوں ان کے پورے پورے خاندان کو لہوؤں میں پلوائے جا رہے ہیں ——— وہ سوچتے ہیں کہ ان کا آخر جرم کیا ہے؟ انہوں نے چوری کی ہے یا ڈاکہ ڈالا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں کیا ——— یہ تو محض ایک نظریئے پر یقین رکھتے ہیں اور معاشرے سے ظلم و ناانصافی اور استحصال کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ عوام محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ان پر واقعی ظلم ہو رہا ہے۔ چنانچہ اندر ہی اندر عوام کی ہمدردیاں ان انقلابیوں کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ گویا ع ''جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ!''

(۵) راست اقدام (Active Resistance)

انقلابی جدوجہد کا پانچواں مرحلہ اقدام کا ہوگا۔ یہ انتہائی نازک فیصلے کا وقت ہے اور قیادت کی ذہانت کا امتحان ہے۔ اس مرحلے کے لئے مناسب وقت کا تعین بہت ضروری ہے۔ اگر آپ کی تیاری نہیں ہے اور آپ نے اقدام کر دیا تو آپ ختم ہو جائیں گے۔ دوسری طرف اگر تیاری پوری ہونے کے باوجود اقدام میں تاخیر کر دی تو آپ نے موقع کھو دیا۔ You have missed the bus. گویا اگر آپ نے موقع گنوا دیا تب بھی آپ ناکام ٹھہریں گے اور اگر آپ نے قبل از وقت اقدام کر دیا' تب بھی ناکام قرار پائیں گے۔ اقدام کا فیصلہ اس وقت کیا جانا چاہئے جب یہ محسوس ہو کہ ایک تو ہماری تعداد کافی ہے۔ ''کافی'' کا مطلب مختلف حالات میں مختلف ہوگا۔ ایک چھوٹے سے ملک میں جس کی ایک کروڑ کی آبادی ہے' شاید پچاس ہزار آدمی بھی ایسے تیار ہو جائیں تو کافی ہو جائیں گے' جبکہ پندرہ کروڑ کی آبادی کے ملک میں تین چار لاکھ تربیت یافتہ افراد درکار ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ اب ان کے اندر ڈسپلن کی پوری پابندی ہو' یہ listen & obey کے اصول کے خوگر ہو گئے ہوں کہ انہیں حکم دیا جائے گا تو حرکت کریں گے اور جب رُکنے کا کہا جائے گا تو رُک جائیں گے۔ ایسے انقلابی نہ ہوں کہ اوّل تو چلتے ہی نہیں اور اگر چل پڑیں تو رُکتے ہی نہیں۔ مالاکنڈ میں صوفی محمد صاحب کی جو تحریک نفاذِ شریعت چلی تھی اس میں قائد نے حکم ہی نہیں دیا تھا اور گولیاں چلنی شروع ہو گئی تھیں۔ پھر ان کے کارکنوں نے پہاڑوں پر جا کر مورچے بنا لئے تھے۔ ان کے قائد نے انہیں نیچے اترنے کا حکم دیا

تو انہوں نے کہا مولوی بک گیا۔تو یہ منظم جماعت نہیں تھی' اس میں ڈسپلن نہیں تھا' بلکہ یہ ایک ہجوم (mob) تھا جو ایک جذباتی اپیل کے تحت آ گے آ گیا تھا۔اس ضمن میں تیسری شرط یہ ہے کہ انقلابی کارکن اپنے مشن کی خاطر اپنے جان و مال سمیت ہر چیز قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ جب یہ تین شرطیں پوری ہوں تو یہ تحریک صبرِ محض (Passive Resistance) سے راست اقدام (Active Resistance) کے مرحلے میں منتقل ہوسکتی ہے۔

اب یہ سمجھ لیجئے کہ راست اقدام (Active Resistance) کا مطلب کیا ہے۔اس کے لئے بھی میں باہر سے مثالیں دوں گا' ابھی میں حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے کوئی مثال نہیں دے رہا۔ اس لئے کہ پہلے آپ جدید اصطلاحات کے حوالے سے ایک خاکہ اپنے ذہن میں جما لیں' پھر ہم اس میں سیرتِ نبویؐ سے رنگ بھریں گے۔لیکن واضح رہے کہ میرا دعویٰ یہ ہے کہ طریق انقلاب کے علم و ادراک کے لئے میرے نزدیک محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے سوا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ Active Resistance یہ ہے کہ آپ نظام کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑیں' اگرچہ آپ نے براہِ راست ابھی کوئی چیلنج نہیں کیا' کوئی الٹی میٹم نہیں دیا۔مثال کے طور پر گاندھی نے انگریز حکمرانوں کے خلاف سب سے پہلے ''عدم تشدد' عدم تعاون'' کا نعرہ بلند کیا تھا۔یعنی ہم تشدد نہیں کریں گے' مار دھاڑ نہیں کریں گے' لیکن ہم انگلینڈ کی ملوں میں بنا ہوا کپڑا استعمال نہیں کریں گے۔ بلکہ ہم تو اپنا چرخہ چلائیں گے' اس پر سوت کاتیں گے اور اس سے کھدر بنیں گے اور وہ پہنیں گے۔ چرخے کو انہوں نے اپنا قومی نشان قرار دے دیا۔ ذرا غور تو کیجئے کہ بیسویں صدی میں ایک قوم اور اس کی ایک جماعت چرخے کو اپنا قومی نشان قرار دے رہی ہے۔اب بتائیے کیا کوئی قانون ہوسکتا ہے کہ تم ضرور ولایتی کپڑا پہنو؟ اور کیا انہوں نے کسی اور کو کوئی نقصان پہنچایا؟ کسی کی جان اور مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا' لیکن حکومتی ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی۔اس لئے کہ مانچسٹر کی ملیں بند ہونے لگیں۔انڈیا برطانوی کپڑے کی بہت بڑی مارکیٹ تھا اور یہاں انگلینڈ سے آنے والے لٹھے' گرم کپڑے اور ململ کی بہت زیادہ کھپت تھی۔لیکن اب یہاں صرف ''کھادی'' چل رہی تھی۔ یہ انگریز کے خلاف Active Resistance کا پہلا قدم تھا۔اس سے انگریزوں کو پتہ چل گیا کہ اب کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔اس تحریک کا دوسرا قدم عدم تشدد پر مبنی سول نافرمانی کی تحریک تھا کہ ہم کوئی تشدد نہیں کریں گے' کوئی توڑ پھوڑ اور مار دھاڑ نہیں کریں گے' لیکن قانون توڑیں گے۔اور قانون شکنی کا انداز ملاحظہ ہو کہ پرماتما کا سمندر ہے' پرماتما نے اس میں نمک

پیدا کیا ہے‘ ہم پر ماتما کے سمندر سے نمک نکالنے جا رہے ہیں۔ ہم نے تو کسی کو کچھ نہیں کہا۔ لیکن اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آپ نے برطانوی حکومت کی ٹیکس پالیسی کو چیلنج کر دیا۔ اس لئے کہ نمک پر ایکسائز ڈیوٹی عائد تھی۔ چنانچہ اب لاٹھیاں پڑیں‘ بڑے بڑے لیڈروں کے سر پھٹے اور بڑے پیمانے پر جیلیں بھری گئیں۔ اگرچہ تحریک آزادی کے کارکنوں نے کوئی تشدّد نہیں کیا!

(۶) مسلح تصادم (Armed Conflict)

اقدام کے بعد چھٹا اور آخری مرحلہ براہِ راست تصادم کا ہوگا۔ یعنی موجودہ نظام اور اس کے محافظوں کے ساتھ انقلابی کارکنوں کا باقاعدہ جسمانی تصادم ہوگا۔ کیونکہ جب آپ نے Active Resistance شروع کر دی ہے تو گویا کہ آپ نے پورے سسٹم کو براہِ راست چیلنج کر دیا ہے‘ لہٰذا اب موجودہ استحصالی نظام انقلابی تحریک کے کارکنوں کو مکمل طور پر کچلنے کے لئے اقدام کرے گا۔ اس مرحلے پر انقلابی تحریک کا امتحان ہوگا۔ اگر تحریک نے انقلاب کے لئے تیاری ٹھیک طور سے کی تھی ‘ کارکنوں کی تنظیم و تربیت درست نہج پر کی گئی تھی‘ صحیح وقت پر اقدام کا فیصلہ کیا تھا تو یہ تحریک کامیاب ہو جائے گی۔ اور اگر تیاری کے بغیر ہی اقدام کر دیا‘ ابھی نہ تو انقلابی کارکنوں کی معتد بہ تعداد موجود تھی‘ نہ ابھی ان کی تربیت تھی‘ نہ وہ listen and obey کے خوگر تھے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ تحریک ناکام ہو جائے گی۔ گویا تصادم کے اس مرحلے کے بعد تو تخت یا تختہ والی بات ہوگی‘ کوئی درمیانی بات نہیں ہوگی۔ اس تصادم کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں‘ وہ میں بعد میں بیان کروں گا۔

طریقِ انقلاب کے ضمن میں مَیں نے اب تک جو کچھ عرض کیا ہے اس کو اگر آپ شعری انداز میں سمجھنا چاہیں تو علامہ اقبال کے ایک فارسی شعر کے حوالے سے سمجھ سکتے ہیں ؎

گفتند جہانِ ما آیا بہ تو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد‘ گفتند کہ برہم زن!

اس شعر میں اقبال اللہ سے اپنا ایک مکالمہ بیان کر رہا ہے۔ اللہ نے مجھ سے کہا اے اقبال! میں نے تمہیں اپنی جس دنیا میں بھیجا ہے آیا وہ تمہارے ساتھ سازگار ہے؟ کیا تمہیں وہ پسند ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں‘ مجھے پسند نہیں! یہاں ظلم ہے‘ یہاں غریب پس رہا ہے۔ یہاں مزدور کے رگوں کے خون کی سرخی سے شراب کشید کر کے سرمایہ دار پیتا ہے۔ ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!!

سرمایہ دار نے مزدور کی رگوں میں دوڑنے والے خون سے سرخ شراب کشید کی ہے اور جاگیرداروں کے ظلم وستم سے دہقان کی کھیتی خراب ہے۔ اس کے بچے بھوکے ہیں اور اس کی کھیتی سے ان کی غذا کا اہتمام نہیں ہو رہا۔ یہ اقبال کی بڑی عظیم نظم ہے جس میں اس نے انقلاب کا نعرہ لگایا ہے۔ تو اقبال کہتے ہیں کہ جب میں نے کہا کہ مجھے تیرا یہ جہان پسند نہیں' یہ میرے لئے سازگار نہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''برہم زن!'' یعنی اسے توڑ پھوڑ دو' درہم برہم کر دو! یہاں انقلاب برپا کر دو!!

اب اس انقلاب کا طریق کار کیا ہو؟ اسے اقبال نے دو مصرعوں میں بیان کر دیا ہے۔ پہلے مصرعہ میں چار مراحل اور دوسرے میں دو مراحل بیان کئے ہیں۔

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن![1]

پہلے درویشی کی روش اختیار کرو اور اپنا کام کرتے رہو۔ دعوت وتبلیغ میں لگے رہو۔ کوئی پاگل کہے یا کوئی گالی دے تو اُسے جواب میں دعا دو۔ یہ درویشی ہے۔ گویا بدھ مت کے بھکشو بنے ہوئے ہیں۔ مارا جا رہا ہے تو جواب نہیں دے رہے ہیں۔ اور جب تیار ہو جاؤ یعنی تعداد بھی کافی ہو' ٹریننگ بھی صحیح ہو چکی ہو' ڈسپلن کے بھی پابند ہو جائیں اور ہر شے قربان کرنے کو تیار ہوں تو اب اپنے آپ کو سلطنتِ جم کے ساتھ ٹکرا دو۔ اس ٹکراؤ کے بغیر انقلاب نہیں آتا۔ وعظ سے انقلاب نہیں آیا کرتا۔ ٹکراؤ میں جانیں جائیں گی' خون دینا پڑے گا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے انقلاب نہیں آتا۔ یہ چھ مراحل جو میں نے گنوائے' یہ کسی ملک کے اندر انقلاب کی تکمیل کے مراحل ہیں۔

(۷) تصدیرِ انقلاب

مذکورہ بالا چھ مراحل کے علاوہ انقلاب کا ایک ساتواں مرحلہ بھی ہے اور یہ ایک حقیقی انقلاب کا

(۱) علامہ اقبالؒ نے اسی خیال کو جاوید نامہ میں ایک اور انداز سے باندھا ہے:
اول اندر نار خود سوزد ترا
باز سلطانی بیاموزد ترا (مرتب)

litmus test ہے۔ ایک حقیقی انقلاب کبھی بھی اپنی جغرافیائی یا قومی وملکی اور حکومتی سرحدوں کے اندر محدود نہیں رہتا۔ کیونکہ اگر انقلابی نظریہ زوردار‘ قوی‘ مضبوط‘ مدلل اور مبرہن ہے تو یہ لوگوں کے قلوب واذہان کو اپنی گرفت میں لے گا۔ چنانچہ حقیقی انقلاب لازماً برآمد (export) ہوتا ہے‘ وہ اپنی حدود میں نہیں رہ سکتا۔

یہ ہے انقلابی عمل کا وہ خاکہ جسے میں نے سیرتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے اخذ کیا ہے‘ لیکن دینی اصطلاحات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے عمومی انداز میں آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ اب ہم اس خاکے میں سیرتِ نبویؐ اور انقلابِ نبویؐ کا رنگ بھرتے ہیں۔

رسولِ انقلاب ﷺ کا انقلابی نظریہ اور اس کے تقاضے

محمد رسول اللہ ﷺ کا انقلابی نظریہ کیا ہے؟ ایک لفظ میں بیان کریں تو وہ ہے ''توحید'' جس کے بارے میں اقبال کہتا ہے۔

زندہ قوت تھی زمانے میں یہ توحید کبھی
اور اب کیا ہے' فقط اک مسئلہ علمِ کلام!

جو کبھی انقلابی نظریہ تھا وہ آج ایک مذہبی بحث ونزاع کا موضوع بن کر رہ گیا ہے۔ اب اس نظریہ کے جو انقلابی نتائج و مضمرات ہیں ذرا ان پر ایک نظر ڈال لیں۔

۱) انسانی حاکمیت کی بجائے خلافت

میں نے عرض کیا تھا کہ انقلابی نظریہ کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ موجودالوقت نظام کی جڑوں پر تیشہ بن کر گرے۔ نظریۂ توحید کے متضمنات میں سب سے پہلی بات اللہ کی حاکمیت ہے۔ اللہ کی زمین پر نہ کوئی انسان حاکم ہے اور نہ کوئی قوم حاکم ہے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلاَّ لِلّٰہِ ۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی' باقی بتانِ آزری!

نظریۂ توحید انسانی حاکمیت کی ہر شکل میں نفی کرتا ہے۔ انسانی حاکمیت نہ تو فردِ واحد کی بادشاہت کی شکل میں قابلِ قبول ہے نہ کسی قوم کی دوسری قوم پر حاکمیت کی شکل میں' جیسے انگریز ہم پر حکمران ہو گیا تھا۔ اور نہ ہی عوام کی حاکمیت جائز ہے۔ حاکمیت (Sovereignty) کا حق صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور انسان کے لئے خلافت ہے۔ حاکمیت کی دوسری تمام صورتیں شرک ہیں اور دورِ حاضر میں حاکمیت جمہوری(Popular Sovereignty) کا تصور بدترین شرک ہے۔ شارع (قانون ساز) صرف اللہ تعالیٰ ہے اور رسولؐ اس کے نمائندے ہیں۔ اب بتائیے اس سے بڑا کوئی انقلابی نعرہ ہوگا؟

۲) ملکیت کی بجائے امانت

توحید کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ ہر شے کا مالک حقیقی اللہ ہے۔ یہ انقلابی نعرہ سیاسی نظام کی جڑوں پر

تیشے کی طرح گرتا ہے۔ کوئی شخص کسی شے کا مالک نہیں ہے' نہ انفرادی طور پر نہ قومی طور پر۔ اس طرح سرمایہ داری کی بھی نفی ہوگئی اور کمیونزم کی بھی۔ مالک صرف وہ ہے: ﴿لَـهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ ''اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے''۔ ہر شے کا مالک وہی ہے اور انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ امانت ہے ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
در حقیقت مالکِ ہر شے خدا ست!

میں اپنے جسم کا بھی مالک نہیں ہوں' میرا یہ جسم بھی اللہ کی ملکیت ہے' انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ ہاتھ پاؤں' یہ آنکھیں' یہ دماغ سب کچھ میرے پاس اللہ کی امانت ہے۔ اُس نے مجھے کوئی گھر دے دیا ہے تو وہ بھی اس کی امانت ہے' اولاد دی ہے تو وہ بھی اُسی کی امانت ہے۔ چنانچہ ملکیت تامّہ اسی کے لئے ہے۔ ہم مالک ومختار نہیں ہیں کہ جو چاہیں کرتے پھریں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا کہ ''اے شعیبؑ! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے؟ اور یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟'' سرمایہ دار کا موقف یہ ہوتا ہے کہ یہ میرا مال ہے' میں اسے جیسے چاہوں تصرف میں لاؤں' خواہ اس سے سودی کاروبار کروں یا کسی کو سود پر قرضہ دوں۔ اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو سرمائے کا مالک سمجھتا ہے۔ اگر آپ اپنے آپ کو امین سمجھیں گے تو آپ کا نقطۂ نظر یکسر مختلف ہوگا۔ پھر آپ اپنا ہاتھ بھی وہیں استعمال کریں گے جہاں اللہ کی اجازت ہے۔ آپ اپنے پاؤں سے بھی اسی راستے پر چلنا چاہیں گے جس پر اللہ چاہتا ہے کہ آپ چلیں۔ آپ کا مال وہیں خرچ ہوگا جہاں اللہ چاہتا ہے کہ آپ خرچ کریں۔

۳) کامل معاشرتی مساوات

سماجی سطح پر توحید کا تقاضا یہ ہے کہ بنیادی طور پر' پیدائشی طور پر تمام انسان برابر ہیں' کوئی اونچا نہیں' کوئی نیچا نہیں۔ اس ضمن میں ایچ جی ویلز کی گواہی آپ کو بتا چکا ہوں کہ ''انسانی اخوت' مساوات اور حریت کے وعظ تو پہلے بھی بہت کہے گئے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ تاریخِ انسانی میں پہلی بار ان بنیادوں پر ایک معاشرہ قائم کیا ہے محمد (ﷺ) نے''۔ اسلامی معاشرے میں اگر کوئی اونچ نیچ ہے تو وہ ان

کمالات کی بنیاد پر ہے جو آپ نے از خود حاصل کئے ہیں۔ آپ نے علم حاصل کیا تو آپ اونچے ہو گئے' آپ کی عزت کی جائے گی۔ آپ نے تقویٰ کی روش اختیار کی' روحانی مقام حاصل کیا' اب آپ کی عزت کی جائے گی۔ ﴿اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ﴾ ''اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو تم میں سب سے بڑھ کر متقی ہو''۔ پیدائشی طور پر تمام انسان برابر ہیں۔ شودر ہو یا برہمن' کالا ہو یا گورا' مرد ہو یا عورت' کوئی فرق نہیں۔ مرد اور عورت کے درمیان فرق انتظامی اعتبار سے ہے۔ جیسے کسی محکمے میں ایک انچارج اور ایک باہر کھڑے ہوئے قاصد میں بحیثیت انسان بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں' لیکن منصب کے اعتبار سے سربراہ شعبہ کا منصب اونچا ہے' قاصد کا نیچا ہے۔ یہ انتظامی معاملہ ہے۔

ہمارے ہاں پٹھانوں میں بالعموم یہ مساوات نظر آتی ہے کہ سب ایک سا لباس پہنتے ہیں۔ بڑے سے بڑا زمیندار ہو یا اس کا ملازم ہو' دونوں کا لباس ایک ہی طرح کا ہوگا' اور یہ کہ کھانا بھی دونوں ساتھ بیٹھ کر کھائیں گے۔ میں نے سنا ہے کہ عربوں کے ہاں بھی یہ مساوات قائم ہے اور لنچ ٹائم پر ایک منسٹر کا بوّاب (دربان) اور سوّاق (ڈرائیور) اس کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ مرد اور عورت میں بھی بحیثیت انسان کوئی فرق نہیں' صرف انتظامی اعتبار سے فرق ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ (النساء:۳۴) ''مرد عورتوں پر قوام ہیں''۔ یعنی مرد کو خاندان کے ادارے کے سربراہ کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مرد افضل ہے اور عورت کمتر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی عورت اپنے اخلاق اور کردار کے اعتبار سے کروڑوں مردوں سے اوپر چلی جائے۔ کتنے مرد ہوں گے جو حضرت مریم ' حضرت آسیہ' حضرت خدیجہ' حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ (رضی اللہ عنہن اجمعین) کے مقام کو اس طرح دیکھیں گے جیسے آپ آسمان کو دیکھتے ہیں۔ تو نظریۂ توحید کے یہ تین نتیجے ہیں جو سیاسی سطح پر' معاشی سطح پر اور سماجی سطح پر نکلتے ہیں — حاکمیتِ مطلقہ اللہ کے لئے' ملکیتِ مطلقہ اللہ کے لئے اور کامل مساواتِ انسانی۔

رسول اللہ ﷺ نے اس نظریۂ توحید کی تبلیغ مکہ کی گلیوں میں گھوم پھر کر کی۔ آپؐ نے لوگوں کو پکارا: **یَا اَیُّھَا النَّاسُ قُوۡلُوۡا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفۡلِحُوا** ''اے لوگو! کہو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' تم کامیاب ہو جاؤ گے''۔ ابتدائی دعوت میں ابھی آپؐ نے اپنی رسالت کا ذکر شامل نہیں کیا' پورے کا پورا زور (emphasis) توحید پر ہی رکھا۔ اس انقلابی نظریئے کی دعوت و اشاعت میں آپؐ نے اُس

وقت کے جو بھی ذرائع میسر تھے‘ انہیں استعمال کیا۔ آپؐ نے گھر گھر جا کر دعوتِ توحید پیش کی ۔ پھر دو مرتبہ اپنے خاندان والوں (بنو ہاشم) کو کھانے پر بلا کر دعوت پیش کی ۔ ایک مرتبہ تو لوگوں نے بات سنی ہی نہیں‘ شور مچا دیا۔ دوسری مرتبہ بات سن لی لیکن سب کے سب خاموش بیٹھے رہے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ حاضرین میں سے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے جو پہلے ہی ایمان لا چکے تھے۔ انہوں نے کہا اگرچہ میری ٹانگیں پتلی ہیں‘ اگرچہ میں سب سے چھوٹا ہوں‘ اگرچہ میری آنکھیں بھی دکھتی ہیں‘ لیکن میں آپؐ کا ساتھ دوں گا۔ اوراس پر سارا مجمع کھل کھلا کر ہنس پڑا کہ یہ چلے ہیں انقلاب لانے کے لئے اور یہ ان کے ساتھی ہیں۔ پھر آپ ﷺ کو حکم ہوا: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (الحجر:۹۴) ’’اے نبیؐ! جس چیز کا آپ کو حکم ہوا ہے اسے ڈنکے کی چوٹ بیان کیجئے اور مشرکین کی ذرا پروا نہ کیجئے‘‘۔ چنانچہ آپ ﷺ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر واصباحا کا نعرہ لگایا۔ پھر عکاظ اور دوسرے میلوں میں جا کر دعوت دی۔ حج کے اجتماعات میں لوگوں کے سامنے دعوت رکھی۔ الغرض جو طریقہ بھی ممکن تھا اسے استعمال کیا۔ اُس وقت نہ تو لاؤڈ سپیکر تھا نہ کوئی ٹیلی ویژن تھا۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا بھی نہیں تھے۔ نہ کوئی چھاپہ خانہ تھا‘ نہ کتابیں نہ رسالے نہ اخبار! لیکن جو بھی میسر ذرائع اور وسائل تھے انہیں آپؐ نے استعمال کیا۔

اسلامی انقلابی تنظیم اور اس کی اساسات

جو لوگ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے، انہیں آپؐ نے منظّم کیا اور ان کی تربیت کی۔ اس تنظیم کی سب سے پہلی بنیاد یہ تھی کہ جن لوگوں نے مان لیا کہ آپ ﷺ اللہ کے نبی ہیں، آپ ﷺ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اللہ کی جانب سے کہہ رہے ہیں، یہ آپؐ پر وحی آئی ہے تو پھر ان کے لئے آپ ﷺ کے حکم سے سرتابی کیسے ممکن ہے؟ کیا نبی کی بات سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے؟ اس سے زیادہ مضبوط جماعت کا آپ تصور نہیں کر سکتے جو نبوت کی بنیاد پر قائم ہو۔ آج کی دنیا میں بھی آپ کو مثال ملے گی کہ سچی نبوت تو تنظیم کی بہت بڑی بنیاد ہے ہی، جھوٹی نبوت بھی بہت بڑی بنیاد ہے۔ غلام احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت کی بنیاد پر جو جماعت چل رہی ہے ذرا اس کا اندازہ کیجئے کہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اور ان کا لاہوری فرقہ، جس نے غلام احمد قادیانی کو نبی نہیں مانا، وہ منتشر ہو کر ختم ہو گیا۔ تو مضبوط ترین جماعت جو دنیا میں ہو سکتی ہے وہ نبوت کے دعویٰ کی بنیاد پر ممکن ہے۔ چنانچہ محمد رسول اللہ ﷺ کی سچی نبوت اور آخری نبوت کی بنیاد پر جو جماعت بنی وہ دنیا کی مضبوط ترین جماعت تھی، جس کے بارے میں قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ﴾ ''اللہ کے رسول محمدؐ اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں۔'' اس جماعت میں کسی نے رسول اللہ ﷺ کو جماعت کا صدر منتخب نہیں کیا تھا بلکہ آپ ﷺ نبی ہونے کی حیثیت سے اور داعی ہونے کی حیثیت سے خود بخود امیر تھے۔ آپ ﷺ کے ساتھی ''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'' (ہم نے سنا اور مانا) کے اصول پر کاربند تھے۔ البتہ حضور ﷺ نے مستقبل کے لئے ایک مثال قائم کرنے کے لئے کہ آئندہ اگر اسی انقلابی جدوجہد کا مسلمانوں نے آغاز کیا تو اس کے لئے جماعت کیسے بنے گی، بیعت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ملاحظہ کیجئے جو بخاری اور مسلم دونوں کی روایت ہے اور سند کے اعتبار سے اس سے زیادہ صحیح حدیث ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ ''ہم نے بیعت کی اللہ کے رسول ﷺ سے''۔ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ ''اس بات پر کہ آپؐ کا ہر حکم سنیں گے اور اطاعت کریں گے'' فِى الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ ''تنگی اور سختی میں بھی اور

آسانی میں بھی'' وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ ''طبیعت کی آمادگی کی صورت میں بھی اور طبیعت پر جبر کرنا پڑا تب بھی''۔ وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا ''اور چاہے آپؐ دوسروں کو ہم پر ترجیح دے دیں''۔ ہم یہ نہیں کہیں گے کہ آپؐ نے ایک نووارد نوجوان کو ہم پر امیر کیوں بنا دیا؟ ہم آپؐ کے پرانے خدمت گار اور جان نثار ساتھی ہیں، ہم پر اس نوجوان کو کیوں امیر بنا دیا؟ آپؐ کا اختیار ہو گا جو چاہیں کریں۔ وَعَلٰی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ ''اور جس کو بھی آپؐ امیر بنا دیں گے اس سے جھگڑیں گے نہیں''۔ وَعَلٰی اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ ''اور یہ کہ ہم حق بات ضرور کہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں، اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت کا خوف نہیں کریں گے''۔ ہماری جو رائے ہو گی، ہمارے نزدیک جو بات حق ہو گی وہ ضرور کہہ دیں گے۔ اس لئے زبانیں بند نہیں کریں گے کہ لوگ کہیں گے کہ لو جی انہوں نے کیا کہہ دیا۔ یہ ہے آرگنائزیشن کی دوسری بنیاد۔ آپ بھی تجزیہ کر لیجئے کہ کیا حضور ﷺ کو اس کی ضرورت تھی؟ کیا آپؐ پر ایمان لانا ہی کافی نہیں تھا کہ آپؐ کی ہر بات ماننی ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ﴾ (النساء:۶۴) ''ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے۔'' اس کے باوجود آنحضور ﷺ نے بیعت لی تو یہ دراصل آئندہ کے لئے رہنمائی کے لئے تھی!

غزوۂ بدر سے پہلے حضور ﷺ نے ایک مجلسِ مشاورت منعقد کی تھی کہ قریش کا ایک قافلہ شمال سے مالِ تجارت سے لدا پھندا آ رہا ہے جس کے ساتھ صرف چالیس یا پچاس محافظ ہیں، جبکہ کیل کانٹے سے لیس ایک مسلح لشکر جنوب سے آ رہا ہے اور اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ ان دو میں سے ایک پر تمہیں ضرور فتح عطا فرما دے گا۔ بتاؤ، کدھر چلیں؟ کچھ ہم جیسے کمزور لوگ بھی موجود تھے، انہوں نے کہا کہ حضور! قافلے کی طرف چلیں، تھوڑے سے آدمی ہیں، ان پر ہم آسانی سے قابو پا لیں گے، مالِ غنیمت بہت ہاتھ آ جائے گا، اور ہتھیار بھی ملیں گے، جن کی ہمیں اشد ضرورت ہے۔ لیکن حضور ﷺ مزید مشورہ طلب فرماتے رہے۔ تب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اندازہ کیا کہ حضور ﷺ کا اپنا رجحانِ طبع کچھ اور ہے۔ چنانچہ اس مرحلے پر پہلے مہاجرین نے تقریریں کیں کہ حضورؐ! آپؐ ہم سے کیا پوچھتے ہیں، جو آپؐ کا حکم ہو ہم حاضر ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے تقریریں کیں، لیکن حضور ﷺ نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے حضور ﷺ کسی خاص بات کے منتظر ہیں۔ مہاجرین میں سے ہی حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ ''حضورؐ جو

آپ کا ارادہ ہو بسم اللہ کیجئے' ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں پر قیاس نہ کیجئے جنہوں نے اپنے نبیؑ سے یہ کہہ دیا تھا کہ ''اے موسیٰؑ آپ اور آپ کا رب دونوں جائیں اور جا کر جنگ کریں' ہم تو یہاں بیٹھے ہیں''۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو ہمارے ذریعے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما دے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی انتظار کی کیفیت میں تھے۔

اب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو خیال آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روئے سخن دراصل انصار کی جانب ہے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں طے یہ ہوا تھا کہ اگر قریش آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیچھا کرتے ہوئے مدینے پر حملہ آور ہوئے تو ہم آپؐ کی اس طرح حفاظت کریں گے جیسے اپنے اہل و عیال کی کرتے ہیں۔ لیکن صورتِ واقعہ یہ تھی کہ قریش نے مدینے پر حملہ نہیں کیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود باہر نکل کر تصادم کا آغاز کر چکے تھے' لہٰذا انصار اس معاہدے کی رو سے مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرنے کے پابند نہیں تھے۔ حضرت سعدؓ کو فوراً خیال آ گیا کہ ہو نہ ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہماری تائید کے منتظر ہیں۔ چنانچہ حضرت سعدؓ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! معلوم ہوتا ہے آپؐ کا روئے سخن ہماری جانب ہے۔ اب دیکھئے کس قدر عمدہ جملہ کہا: فَاِنَّا آمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ یعنی حضور! ہم آپؐ پر ایمان لا چکے ہیں اور ہم نے آپؐ کی تصدیق کی ہے۔ ہم نے آپؐ کو اللہ کا نبی اور رسول مانا ہے۔ اب ہمارا اختیار کہاں رہا؟ آپؐ جو بھی حکم دیں گے' سر آنکھوں پر! آپؐ ہمیں جہاں بھی لے جانا ہو لے چلئے۔ خدا کی قسم' اگر آپؐ ہمیں اپنی سواریاں سمندر میں ڈالنے کا حکم دیں گے تو ہم ڈال دیں گے......!

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی کی بیعت کی ضرورت نہیں تھی' آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو اللہ کے نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے مطاع تھے ـــــ لیکن اس کے باوجود آپؐ نے بیعت کیوں لی؟ اس لئے کہ آئندہ کوئی مسلمان جماعت بنانے کے لئے انگریزوں سے' روسیوں سے یا جرمنوں سے کوئی طریقہ مستعار نہ لیتا پھرے' بلکہ جماعت بنانے کے لئے وہ بنیاد اختیار کرے جو میں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

انقلابی تربیت کا نبوی ﷺ منہاج

تربیت کے لئے میں نے چار عنوانات مقرر کئے تھے۔ اولاً یہ کہ انقلابی فکر مستحضر رہے۔ رسول اللہ ﷺ کے انقلابی فکر کا منبع و سرچشمہ قرآن تھا اور اس منہج پر اب جو بھی دعوت اٹھے گی اس کا منبع و سرچشمہ بھی یہی قرآن ہوگا کہ اسے پڑھتے رہو تاکہ تمہارا فکر تازہ رہے۔ اس کے لئے اجتماعی مذاکرہ بھی کرو۔ مل کر بیٹھو اور قرآن پڑھو' سیکھو اور سکھاؤ۔ اسی سے تمہارا فکر تروتازہ رہے گا۔

ثانیاً سمع و طاعت —— جس کا سب سے بڑا امتحان یہی تھا کہ چاہے تمہارے ٹکڑے کر دیئے جائیں تم نے ہاتھ نہیں اٹھانا۔ دیکھئے ایک شخص کو جب یہ معلوم ہو کہ یہ مجھے مار دیں گے تو وہ desperate ہو کر دو چار کو مار کر ہی مرے گا۔ بلی کو اگر آپ کارنر (Corner) کر لیں اور اسے اندازہ ہو جائے کہ اب میرے لئے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے تو وہ سیدھی آپ کی آنکھوں پر جھپٹے گی۔ لیکن یہاں اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ حضرت خبابؓ بن ارتؓ کے سامنے دہکتے ہوئے انگارے بچھائے گئے' اور ان سے کہا گیا کہ کُرتا اُتار کر ان پر لیٹ جاؤ۔ آپؓ لیٹ گئے۔ پیٹھ کی کھال جلی' چربی پگھلی تو اس سے وہ انگارے ٹھنڈے ہوئے۔ جسے یہ نظر آ رہا ہو کہ یہ مجھے انگاروں پر بھوننے والے ہیں' زندہ کے کباب بنانے والے ہیں' وہ دو چار کو مار کر ہی مرتا ہے' یا کم از کم اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کرتا ہے' لیکن یہاں اس کی اجازت نہیں تھی۔ میرے نزدیک سمع و طاعت کا اس سے بڑا کوئی مظہر ممکن ہی نہیں۔

ثالثاً —— اپنی جان' مال' تن' من' دھن' اولاد' غرض ہر شے اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔ ویسے تو دنیاوی انقلابات میں بھی لوگوں نے یہ سب کام کئے ہیں۔ کمیونسٹ انقلاب نہیں آ سکتا تھا جب تک کہ لوگ جانیں نہ دیتے اور لوگوں نے ساری سختیاں نہ جھیلی ہوتیں۔ لیکن مسلمان کے لئے اپنی جان اللہ کی راہ میں پیش کرنا اتنا آسان ہے کہ دوسروں کو اُس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اس کا ایمان آخرت پر ہے اور اُس کے نزدیک اصل زندگی آخرت کی ہے۔ لہٰذا وہ اگر اپنا سب کچھ اللہ کی خاطر لگا دے' کھپا دے تو اسے گھاٹا کس اعتبار سے ہے؟ وہ تو سوچتا ہے کہ مجھے آخرت میں اس کا کئی گنا مل جائے گا' سات سو گنا مل جائے گا' ہزار گنا مل جائے گا' تو اس معاملے میں میرا کوئی نقصان نہیں ہے۔

آدمی کو آخرت پر جتنا یقین ہوگا اتنا ہی آدمی اپنے آپ کو invest کر دے گا۔ میں اپنی جمع پونجی بینک میں بچا کر رکھوں تو مجھ سے زیادہ پاگل کون ہوگا؟ یہ مجھے زیادہ سے زیادہ دس یا پندرہ فیصد منافع دے دیں گے' لیکن اللہ کا بینک کھلا ہوا ہے جو سات سو گنا دیتا ہے۔تو یہاں بچا بچا کر رکھنا یقیناً بے وقوفی ہے۔ جیسے حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا تھا: زمین پر جمع نہ کرو' یہاں کیڑا بھی خراب کرتا رہتا ہے' چوری بھی ہوتی ہے' ڈاکہ بھی پڑتا ہے۔آسمان پر جمع کرو' جہاں نہ کیڑا خراب کر سکے' جہاں چوری نہیں' ڈاکہ نہیں' اور میں تم سے سچ کہتا ہوں جہاں تمہارا مال ہوگا وہیں تمہارا دل بھی ہوگا''۔تم نے مال اگر یہاں جمع کیا تو دل یہیں اٹکا رہے گا۔ جب فرشتے جان نکالنے کے لئے آئیں گے تو سوائے حسرت وافسوس کے کچھ نہ کر سکو گے۔ حدیث میں آیا ہے کہ فرشتے ایسے جان نکالیں گے جیسے گرم سلاخ کے اوپر سے کباب کھینچا جاتا ہے۔ اگر آپ کی جمع پونجی اللہ کے بینک میں جمع ہے تو آپ کا دل بھی وہیں اٹکا ہوگا۔فرشتہ آئے گا تو آپ کے لبوں پر مسکراہٹ ہوگی۔

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم　　چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست!

اگر آپ نے کروڑوں روپیہ سوئٹزرلینڈ کے بینکوں میں جمع کر رکھا ہو اور آپ سے کہا جائے کہ ''نکل جاؤ ملک سے'' تو آپ کو کوئی افسوس ہوگا؟ لیکن اگر ملک سے باہر آپ کا کچھ نہیں' نہ کوئی جاننے والا ہے' تب کہا جائے نکل جاؤ تو آپ کو یقیناً تشویش ہوگی۔ یہ دراصل عقیدۂ آخرت ہی ہے جو آج دنیا کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مسلمانوں کو کیا ہوگیا ہے کہ جانیں دینے کے لئے اس طرح آمادہ ہیں۔انہوں نے فلسطین' کشمیر' چیچنیا اور افغانستان میں مسلمانوں کا یہ جذبہ دیکھ لیا ہے۔ یہ سب عقیدۂ آخرت پر یقین کی علامتیں ہیں۔

ایک زمانے میں جب مولانا مودودی مرحوم کو سزائے موت ہوئی تھی مَیں اُس وقت اسلامی جمعیت طلبہ کا ناظم اعلیٰ تھا۔ میں نے ''عزم'' کے ٹائٹل پر یہ نظم شائع کی تھی اور پھر جیل میں مولاناؒ کو بھیجی تھی۔

وہ وقت آیا کہ ہم کو قدرت ہماری سعی و عمل کا پھل دے
بتا رہی ہے یہ ظلمتِ شب کہ صبح نزدیک آ رہی ہے
ابھی ہیں کچھ امتحان باقی ' فلاکتوں کے نشان باقی
قدم نہ پیچھے ہٹیں کہ قسمت ابھی ہمیں آزما رہی ہے

سیاہیوں سے حزیں نہ ہونا' غموں سے اندوہ گیں نہ ہونا

انہی کے پردے میں زندگی کی نئی سحر جگمگا رہی ہے

رئیسؔ اہلِ نظر سے کہہ دو کہ آزمائش سے جی نہ ہاریں

جسے سمجھتے تھے آزمائش وہی تو بگڑی بنا رہی ہے!

یہ رئیسؔ امروہوی کے اشعار تھے۔ میں نے رئیس کی اضافت کے ساتھ یہ اشعار ''رئیسِ اہلِ نظر'' کی خدمت میں پیش کئے۔

نبی اکرم ﷺ کے انقلاب میں روحانی تربیت کو بھی انتہائی اہمیت دی گئی۔ روحانیت پیدا کرنے کے سب سے بڑے ذریعے قرآن حکیم کو دلوں میں اتارا گیا' اس سے سینوں کو منور کیا گیا' اور اس کے ساتھ ساتھ نفس کے تقاضوں کی مخالفت کرائی گئی۔ نیند بہت عزیز ہے' اللہ کی راہ میں جاگتے رہنے کی ترغیب دلائی گئی اور تہجد میں قرآن کو اپنے اندر اتارنے کا حکم دیا گیا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ o قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا o نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا o اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا o اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا o اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْئًا وَّاَقْوَمُ قِیْلًا o﴾ (المزمل)

''اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم' آدھی رات' یا اس سے کچھ کم کر لو' یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو' اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لئے اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لئے زیادہ موزوں ہے۔''

قرآن تو ویسے ہی نور ہے' یہ دلوں کی تاریکیاں دور کر کے انہیں منور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے' اور رات کا جاگنا نفس کو کچلنے میں بہت مؤثر ہے۔ تزکیہ نفس کے لئے جس تیسری شے کی ترغیب دی گئی ہے وہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا ہے۔ تو یہ ہے نظام محمد رسول اللہ ﷺ کی انقلابی تربیت کا۔ ہمارے ہاں بعد میں جو بھی خانقاہی نظام وجود میں آیا اس میں تربیت اور تزکیہ کے اسلوب اور انداز اپنے ہیں۔ ان کے مراقبے' ان کے چلّے اور ذکر کے طریقے اپنے ہیں۔ میں اس نظام کی بات نہیں کر رہا' سلوکِ محمدی ؐ کی بات کر رہا ہوں۔ وہ انقلابی تربیت جو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کی فرمائی اس کے عناصرِ ترکیبی میں نے بیان کر دیئے ہیں۔

آنحضورﷺ کی انقلابی جدوجہد میں صبرِ محض کا مرحلہ

میں نے عرض کیا تھا کہ صبر محض (Passive Resistance) کی ابتدا داعی کی کردار کشی سے ہوتی ہے کہ اس کی قوتِ ارادی کو ختم کر دیا جائے۔ تین سال تک تنہا حضورﷺ اس ایذا رسانی کا ہدف بنے رہے ہیں۔ اور یہ زبانی ہوتی رہی کہ پاگل ہو گئے ہیں‘ مجنون ہو گئے ہیں۔ ہم انہیں کہتے تھے مت جایا کرو غارِ حرا میں اور وہاں کئی کئی دن نہ رہا کرو‘ وہاں پر کوئی نہ کوئی آسیب سوار ہو گیا ہے‘ ان پر کوئی جن آ گیا ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ انہوں نے شاعری شروع کر دی ہے‘ یا یہ کہ یہ ساحر بن گئے ہیں یا مسحور ہو گئے ہیں۔ یہ تمام تر آنحضورﷺ کی کردار کشی (Character Assassination) اور آپؐ کی قوتِ ارادی کو مجروح کرنے کی کوششیں تھیں —— اور یہ مت سمجھئے کہ اس سے حضورﷺ کو رنج نہیں ہوتا تھا۔ قرآن کی گواہی ہے: ﴿وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّكَ يَضِيۡقُ صَدۡرُكَ بِمَا يَقُوۡلُوۡنَ﴾ (الحجر: ۹۶) ''اے نبیؐ ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ کہہ رہے ہیں ان سے آپ کا سینہ بھنچتا ہے''۔ ان سے آپؐ کو صدمہ ہوتا ہے‘ آپؐ کو اپنے سینے میں گھٹن محسوس ہوتی ہے کہ یہی ہیں جو مجھے الصادق اور الامین کہا کرتے تھے‘ آج یہ مجھے ساحر اور کذاب کہہ رہے ہیں۔ مجھ پر جھوٹ کا الزام لگا رہے ہیں۔ مجھ پر دھوکے کا الزام لگا رہے ہیں کہ کسی سے ڈکٹیشن لے کر ہم پر دھونس جماتا ہے کہ یہ مجھ پر اللہ کی وحی آ گئی ہے۔ لیکن اس کیفیت میں آپﷺ کے لئے حکم یہ تھا کہ ﴿وَاصۡبِرۡ عَلٰى مَا يَقُوۡلُوۡنَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِيۡلًا ۝۱۰﴾ (المزمل) ''جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کیجئے اور بھلے طریقے سے ان کو چھوڑ دیجئے''۔ خوبصورتی کے ساتھ اپنا رخ موڑ لیجئے اور ان کو چھوڑ دیئے‘ کسی اور سے بات کیجئے۔ لیکن علیحدگی لٹھ مار کر نہ ہو۔ ہوسکتا ہے جو شخص آج بات نہیں سن رہا‘ کل سننے پر آمادہ ہو جائے۔

تین سال کے بعد مشرکین کو محسوس ہوا کہ یہ تو چٹان کی طرح کھڑے ہیں اور دو باتیں بہت خطرناک ہو گئی ہیں۔ ایک تو ہماری نوجوان نسل ان کے گرد جمع ہو گئی ہے۔ یہ بنوامیہ کا چشم و چراغ عثمان ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ مصعب بن عمیر اور سعد بن ابی وقاص جیسے نوجوان ان کے گرد جمع ہو گئے ہیں‘ اور اس سے بھی بڑھ کر خطرناک معاملہ یہ کہ ہمارے غلام ان پر ایمان لے آئے ہیں۔ یہ تو ایسا معاملہ ہے جیسے کہیں پر بارود کا سٹور ہو اور وہاں پر چنگاری اڑ کر جا رہی ہو۔ ہمارے غلام اگر کہیں ہمارے خلاف کھڑے ہو گئے اور انہوں نے ہم سے ہمارے مظالم کے بدلے چکانے شروع

کئے تو کس بھاؤ بکے گی؟ لہٰذا اب جسمانی تشدد وتعذیب (Physical Persecution) کا آغاز ہو گیا کہ انہیں مارو' انہیں بدترین جسمانی سزائیں دو' ان کو گھروں میں بند کر دو اور زنجیروں میں جکڑ کر رکھو۔ کھانے کو کچھ مت دو' بھوکا رکھو۔ غلام ہے تو بری طرح مارو' پیٹو' گلیوں میں گھسیٹو۔ حضرت سمیہ اور حضرت یاسر (رضی اللہ عنہما) کو ابوجہل نے بدترین اور شرمناک ترین تشدد کر کے شہید کیا۔ جوان بیٹے عمار بن یاسر کو ستون سے باندھا اور ان کے سامنے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو برہنہ کر کے تشدد کا نشانہ بنایا۔ مار مار کر تھک گیا تو کہا ایک دفعہ کہہ دو کہ ''تمہارا معبود بھی سچا ہے'' میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ انہوں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ پھر اس نے شرمگاہ کے اندر برچھا مارا جو جسم کے آر پار ہو گیا۔ حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کے جسم کو چار وحشی اونٹوں کے ساتھ باندھ کر ان کو چار مخالف سمتوں میں دوڑایا گیا تو ان کے جسم کے پرخچے اڑ گئے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یہ تھا کہ کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ ابھی اپنے ہاتھ بندھے رکھو! اس کا فلسفہ میں بیان کر چکا ہوں کہ مسلمان اُس وقت تعداد میں بہت قلیل تھے۔ اگر اس وقت وہ کوئی جوابی کارروائی کرتے تو انہیں کچل کر رکھ دیا جاتا۔ جبکہ انہیں ایک قوت بننے کے لئے مہلتِ عمل درکار تھی۔ دوسرے یہ کہ تشدد کا یکطرفہ نشانہ بننے سے انہیں عوام کی ہمدردیاں حاصل ہو رہی تھیں۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی گردن میں رسی ڈال کر ان کا آقا چھوکروں کے ہاتھ میں تھما دیتا کہ اسے کھینچو۔ جیسے ان دنوں عراق کی ابوغریب جیل میں قیدیوں پر تشدد کی تصویریں شائع ہوئی ہیں کہ قیدیوں کو برہنہ کر کے گلے میں رسی ڈال کر انہیں زمین پر گھسیٹا جا رہا ہے' حضرت بلالؓ کے ساتھ یہ معاملہ مکہ کی گلیوں کے اندر ہوا۔ انہیں نوکیلے پتھروں والی زمین پر اس طرح گھسیٹا جاتا جیسے مردہ جانور کی لاش گھسیٹی جاتی ہے۔ لوگ اس منظر کو دیکھتے اور سوچتے کہ بلال کے ساتھ یہ سلوک کیوں ہو رہا ہے؟ کیا اس نے چوری کی ہے یا آقا کی بیٹی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے؟ وہ جانتے تھے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ بلالؓ کا قصور صرف یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عوام کی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ بڑھ رہی تھیں۔

ایک بات نوٹ کر لیجئے کہ دس نبوی تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی نے دست درازی نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے خاندان بنو ہاشم کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اگرچہ بنو ہاشم سب ایمان نہیں لائے تھے' بلکہ ان میں ابولہب جیسے بدترین دشمن بھی تھے' لیکن بنو ہاشم کے سردار ابوطالب تھے اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تحفظ فراہم کر رہے تھے۔ قبائلی نظام میں قبیلے کا سردار جس کسی کو تحفظ دے دیتا' پورا قبیلہ

اس کے پیچھے ہوتا۔ لہٰذا اگر شعب بنی ہاشم میں تین سال کی نظر بندی ہوئی ہے تو پورا خاندانِ بنی ہاشم اس میں شریک تھا' صرف مسلمان محصور نہیں تھے۔ ابو طالب سے کفارِ مکہ کا مطالبہ تھا کہ وہ محمد (ﷺ) کی پشت پناہی چھوڑ دیں تاکہ ہم ان سے نمٹ سکیں' لیکن انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔ سن ۱۰ نبوی میں ابو طالب کا انتقال ہو گیا' اسی سال حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا بھی انتقال ہو گیا۔ حضور ﷺ جب باہر سے تھکے ہوئے گھر آتے' طبیعت میں انقباض ہوتا کہ آج فلاں شخص نے پاگل کہہ دیا' فلاں نے ساحر کہہ دیا' تو گھر میں ایک دلجوئی کرنے والی وفا شعار شریکۂ حیات تو موجود تھی' وہ بھی اللہ نے اٹھا لی۔ ابو طالب خاندانی طور پر ساتھ دے رہے تھے' ان کا سایہ بھی اٹھ گیا۔ اس سال کو آپ ﷺ نے ''عام الحزن'' کا نام دیا کہ یہ ہمارے لئے غم کا سال ہے۔ ابو طالب کے انتقال سے آپ ﷺ کو جو خاندانی تحفظ حاصل تھا وہ ختم ہو گیا۔ لہٰذا اب دارالندوہ میں فیصلہ ہو گیا کہ محمد (ﷺ) کو قتل کر دیا جائے۔ مشورہ یہ ہوا کہ کوئی ایک آدمی قتل نہ کرے' ورنہ اس کے خلاف پورا خاندانِ بنو ہاشم کھڑا ہو جائے گا' بلکہ اس مقصد کے لئے تمام قبیلوں سے نوجوانوں کو چنا جائے جو بیک وقت جا کر حملہ کریں تاکہ یہ معلوم کرنا مشکل ہو جائے کہ کس نے قتل کیا ہے۔ مکہ کی سرزمین تنگ ہوتی نظر آئی تو آپ ﷺ نے طائف کا سفر اختیار کیا کہ شاید وہاں کوئی امیر یا کوئی سردار ایمان لے آئے تو میں اپنا مرکز وہاں شفٹ کر دوں۔ وہاں حضور ﷺ کے ساتھ تین دنوں میں جو کچھ بیتی' وہ مکہ میں دس سال میں نہیں بیتی تھی۔ آپ ﷺ پر پتھراؤ ہوا' شدید ترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور جسمِ اطہر خون سے لہولہان ہوا۔ اس موقع پر آپؐ کے قلب کی گہرائیوں سے جو فریاد نکلی ہے اسے نقل کرتے ہوئے بھی کلیجہ شق ہوتا ہے:

((اَللّٰھُمَّ اِلَیْكَ اَشْكُوْ ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّةَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ)) ''اے اللہ! کہاں جاؤں' کہاں فریاد کروں' تیری ہی جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں' اپنی قوت کی کمی اور اپنے وسائل و ذرائع کی کمی کی اور لوگوں میں جو رسوائی ہو رہی ہے' اس کی۔'' ((اِلٰی مَنْ تَكِلُنِیْ؟ اِلٰی بَعِیْدٍ یَجْھَمُنِیْ اَوْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّكْتَ اَمْرِیْ؟)) ''اے اللہ! تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا کسی بعید کے حوالے جو میرے ساتھ ترش روئی سے پیش آئے' یا کیا تو نے میرا معاملہ دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ جو چاہیں میرے ساتھ کر گزریں؟'' ((اِنْ لَمْ یَكُنْ عَلَیَّ غَضَبُكَ فَلَا اُبَالِیْ!)) ''پروردگار! اگر تیری رضا یہی ہے اور اگر تو ناراض نہیں ہے تو پھر میں بھی راضی ہوں' مجھے اس تشدد کی کوئی پروا نہیں ہے۔'' ((اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْھِكَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمٰتُ)) ''اے ربّ! میں تیرے روئے انور کی ضیاء کی پناہ میں آتا ہوں جس سے ظلمات منور ہو جاتے ہیں۔''

اس سے گہری کوئی فریاد ہوسکتی ہے؟ لیکن دیکھئے' حضور ﷺ کی دو نسبتیں ہیں' مقامِ عبدیت اور مقامِ رسالت ۔(وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ) یہاں وہ نسبتِ عبدیت غالب آ رہی ہے: (اِنْ لَمْ يَكُنْ عَلَيَّ غَضَبُكَ فَلَا اُبَالِيْ) ''پروردگار اگر تو ناراض نہیں ہے تو مجھے کوئی پرواہ نہیں!'' سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!!

انقلابِ نبویؐ میں اقدام اور چیلنج کا مرحلہ

اگلا مرحلہ اقدام (Active Resistance) کا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ اس مرحلے میں قدم رکھنے کا فیصلہ نہایت نازک ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کے معاملے میں اس مرحلے میں داخل ہونے کا فیصلہ اللہ کی طرف سے تھا لہٰذا غلطی کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ لیکن آئندہ جو بھی تحریک ہوگی اس کی قیادت یہ فیصلہ کرے گی اور اس میں غلطی کا امکان موجود رہے گا۔ نیک نیتی کے ساتھ غلطی کی صورت میں دنیا میں ناکامی کے باوجود آخرت کی کامیابی یقینی ہے۔ تحریک شہیدینؒ انیسویں صدی کی سب سے بڑی انقلابی تحریک تھی۔ اس تحریک میں سید احمد بریلویؒ سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے قبل از وقت (pre-mature) قدم اٹھا لیا اور پٹھانوں کے علاقے میں جا کر فوراً شریعت نافذ کر دی۔ انہوں نے اپنی ہجرت کو رسول اللہ ﷺ کی ہجرت پر قیاس کرتے ہوئے یہ سمجھا کہ جیسے ہجرت کے بعد حضور ﷺ نے شریعت نافذ کر دی تھی اسی طرح میں رائے بریلی سے چل کر ہجرت کر کے یہاں آ گیا ہوں لہٰذا شریعت کا نفاذ کر دینا چاہئے۔ انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ حضور ﷺ کو تو مدینے والے خود آ کر لے گئے تھے' آپ کو تو کوئی لینے نہیں گیا تھا۔ لہٰذا کچھ وقت لگانا چاہئے تھا کہ مقامی آبادی کا ذہن تیار ہو' ان کا فکر پختہ ہو' ان کے دلوں میں ایمان و یقین راسخ ہو اور پھر وہ اپنے رسوم و رواج کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ آپؒ سے غلطی ہوئی' لیکن چونکہ یہ غلطی پورے خلوص و اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ ہوئی لہٰذا اللہ کے ہاں ان کا اجر و ثواب محفوظ ہو گیا' اگرچہ دنیا میں تحریک ناکامی سے دوچار ہو گئی۔ مولانا مودودیؒ سے بھی بہت بڑی غلطی ہوئی کہ وہ چھ سات سال تک جس طریق کار پر عمل پیرا رہے تھے جب تک ہندوستان ایک ملک تھا' اُسے پاکستان آ کر تبدیل کر دیا اور انتخابات کے میدان میں آ گئے کہ شاید لوگ ہمیں ووٹ دیں گے اور ہم حکومت بنا لیں گے اور جب حکومت ہماری ہوگی تو

سارا نظام ہم خود ہی بدل دیں گے۔ نظامِ تعلیم بدل دیں گے‘ نظامِ معیشت تبدیل کر دیں گے۔ ذرائع ابلاغ ہمارے ہاتھ میں ہوں گے تو ہم پوری قوم کی ذہنی وفکری تربیت کریں گے۔ تو بظاہر بڑا عمدہ معاملہ تھا کہ اگر بلی کے گلے میں گھنٹی لٹکا دی جائے تو چوہوں کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ تو الیکشن کے ذریعے سے کامیابی کا یہ سراب سامنے آیا تو وہ دھوکہ کھا گئے۔ اس لئے کہ ابھی یہاں کی فضا تو تیار نہیں تھی۔ ابھی معدودے چند لوگ ان کی دعوت سے واقف تھے۔ لہٰذا عوام کی اکثریت انہیں ووٹ کیسے دے دیتی؟ بہرحال غلطیاں ہوتی ہیں اور غلطیوں کے نتیجے میں دنیا میں ناکامی ہو جاتی ہے‘ لیکن غلطی اگر نیک نیتی سے ہو تو آخرت کے اجر وثواب میں کوئی کمی نہیں آتی۔

مدینہ میں حضور ﷺ کے ابتدائی اقدامات

رسول اللہ ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو یہاں اوس اور خزرج دونوں قبیلے ایمان لے آئے تھے۔ اُدھر مکہ سے جو جمعیت تیار ہو کر آئی تھی یہ سوڈیڑھ سو آدمی تھے جو آزمائش کی بھٹیوں میں سے گزر کر آئے تھے۔

تو خاک میں مل اور آگ میں جل‘ جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر!

لہٰذا آپ ﷺ نے ہجرت کے بعد اقدام (Active Resistance) کا فیصلہ کیا۔ لیکن چھ مہینے میں آپؐ نے اپنی پوزیشن کو مستحکم بنانے کی خاطر تین کام کئے۔ اولاً مسجد نبویؐ تعمیر فرمائی‘ جو عبادت گاہ بھی تھی‘ خانقاہ اور درس گاہ بھی تھی‘ پارلیمنٹ اور مشاورت کی جگہ بھی تھی‘ یہی گورنمنٹ ہاؤس کا مقام بھی رکھتی تھی‘ یہیں پر وفود بھی آ رہے تھے۔ گویا مسلمانوں کا ایک مرکز وجود میں آ گیا۔ ثانیاً آپ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے مابین ’’مواخات‘‘ قائم فرما دی اور ہر مہاجر کو کسی ایک انصاری کا بھائی قرار دے دیا۔ چنانچہ انصارِ مدینہ نے اپنے ان مہاجر بھائیوں کو اپنے گھروں اور دکانوں میں سے حصے دیئے اور اپنے ذرائع معاش میں ان کو شریک کیا۔ اس مواخات میں ایسی ایسی مثالیں بھی سامنے آئیں کہ انصاری بھائیوں نے اپنے مکانوں اور دکانوں کے درمیان دیواریں کھڑی کر کے انہیں نصف نصف تقسیم کر کے مہاجر بھائیوں کو دے دیا۔ یہاں تک کہ ایک انصاری کی دو بیویاں تھیں۔ اُس وقت پردے کے احکام ابھی نہیں آئے تھے‘ وہ تو کہیں پانچ چھ سال بعد آئے۔ وہ انصاری اپنے مہاجر بھائی کو اپنے گھر لے گئے‘ اور کہا کہ یہ میری دو بیویاں ہیں‘ ان میں سے جو تمہیں پسند ہو اشارہ کرو‘ میں اسے طلاق دے

دوں گا تم اس سے شادی کر لینا۔ رسول اللہ ﷺ نے تمہیں میرا بھائی قرار دیا ہے اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تمہارا گھر آباد نہ ہو اور میرے گھر میں دو دو بیویاں ہوں۔ یہ مواخات کا درس تھا۔

ہجرت کے بعد چھ ماہ کے دوران رسول اللہ ﷺ نے تیسرا اہم کام یہ کیا کہ مدینہ میں آباد یہودی قبائل کے ساتھ مشترکہ دفاع کے معاہدے کر لئے۔ آپ ﷺ کے اس اقدام کی منٹگمری واٹ اور ٹائن بی نے بہت زیادہ تعریف کی ہے اور اسے آپ ﷺ کے حسنِ تدبر اور statesmanship کا عظیم مظہر قرار دیا ہے۔ مدینہ میں یہود کے تین قبائل بنوقینقاع' بنونضیر اور بنوقریظہ آباد تھے جو بڑی strategic پوزیشن میں تھے۔ مدینے کے باہر ان کی گڑھیاں اور قلعے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ''میثاقِ مدینہ'' کے نام سے ان تینوں قبائل سے مشترکہ دفاع کا معاہدہ کر لیا۔ آج بعض لوگ احمقانہ طور پر میثاقِ مدینہ کو اسلامی ریاست کے دستور کا نام دیتے ہیں' حالانکہ یہ مشترکہ دفاع کا ایک معاہدہ (Joint Defence Pact) تھا کہ اگر مدینے پر حملہ ہوا تو مسلمان اور یہودی مل کر حملہ آور کا مقابلہ کریں گے۔ اس معاہدے سے رسول اللہ ﷺ کی پوزیشن بہت مضبوط ہو گئی۔

غزوۂ بدر سے قبل آٹھ مہمات

مدینہ میں اپنی پوزیشن مستحکم بنانے کے بعد آپ ﷺ نے Active Resistance کے طور پر چھوٹے چھوٹے چھاپہ مار قسم کے گروپ بھیجنے شروع کر دیئے۔ غزوۂ بدر سے پہلے پہلے آپؐ نے ایسی آٹھ مہمات روانہ کیں' جن میں سے چار میں حضور ﷺ خود بھی شریک ہوئے اور چار میں آپؐ شریک نہیں ہوئے۔ لہٰذا ان میں سے چار غزوات اور چار سرایا کہلاتی ہیں۔ اس عرصے میں مکہ والوں کی طرف سے کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ یعنی اب جو initiative لیا گیا وہ حضور ﷺ کی طرف سے لیا گیا۔ افسوس کہ اس بات کو چھپانے کے لئے ہمارے ہاں سیرتِ نبویؐ میں تحریف کی گئی ہے۔ اس لئے کہ جس طرح آج کل ویسٹرن میڈیا پروپیگنڈا کرتا ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے' اسلام تو خونی مذہب ہے' اسلام دہشت گردی کا درس دیتا ہے' اسی طرح جب یورپ کی استعماری طاقتیں عالم اسلام پر قابض ہوئیں تو مستشرقین نے اسلام کے خلاف اسی طرح کا زہریلا پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ اس پر ہمارے مصنفین نے معذرت خواہانہ (apologetic) انداز اختیار کیا کہ نہیں نہیں' حضور ﷺ نے کوئی جنگ خود شروع نہیں کی تھی' یہ تو حضور ﷺ نے اپنے دفاع میں جنگیں کی تھیں۔ حالانکہ یہ بات سو فیصد جھوٹ ہے۔ مکہ

کے پرسکون تالاب میں بھی ہلچل حضورﷺ نے پیدا کی تھی ؂

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادیؐ عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی!

ورنہ وہاں کے لوگ سب کے سب اپنی قسمت پر صابر وشاکر رہ رہے تھے۔اسی طرح ہجرت کے بعد مکہ والوں کے خلاف راست اقدام (Active Resistance) اور بالآخر مسلح تصادم (Armed Conflict) کا آغاز بھی محمد رسول اللہﷺ نے فرمایا۔

غزوۂ بدر سے قبل ایک سال کے عرصے میں آپﷺ نے جو آٹھ مہمات روانہ کیں ان کے دو مقصد سامنے آتے ہیں۔ جدید اصطلاحات کے حوالے سے پہلا مقصد مکہ کی معاشی ناکہ بندی(Economic Blockade) اور دوسرا مقصد قریش کی سیاسی ناکہ بندی (Isolation or Political Containment) تھا۔قریش کے قافلے جس راستے سے گزرتے تھے' آپؐ نے اس کو مخدوش بنادیا اور قریش کو گویا یہ پیغام دے دیا کہ اب ہم یہاں موجود ہیں اور آپ کے تجارتی قافلے ہماری زد میں ہیں۔ جوراستہ مکہ سے شام جاتا تھا' وہ بدر سے گزرتا تھا۔ بدر مکہ سے دوسو میل دور ہے جبکہ مدینہ سے اس کا فاصلہ صرف نوے میل ہے۔آپؐ نے قریش کے تجارتی قافلوں کو روکنے کے لئے کئی مہمیں ادھر بھیجیں۔خود ایک بڑی مہم لے کر گئے اور اس بڑے قافلے کا پیچھا کیا جو ابوسفیان لے کر شام جا رہا تھا' لیکن وہ بچ کر نکل گیا۔اسی طرح مکہ سے یمن جانے والے قافلے طائف سے ہو کر گزرتے تھے۔ ادھر بھی آپؐ نے ایک مہم بھیج دی۔ پھر آپؐ جہاں گئے وہاں کے قبیلوں سے آپؐ نے معاہدے کر لئے۔ یا تو وہ پہلے قریش کے حلیف تھے اب حضورﷺ کے ہو گئے' یا انہوں نے غیر جانبدارانہ حیثیت اختیار کر لی کہ نہ ہم قریش کے خلاف آپؐ کی مدد کریں گے' نہ آپؐ کے خلاف قریش کی مدد کریں گے۔ان دونوں طرح کے معاہدوں سے قریش کی طاقت کم ہوئی۔ اس طرح رسول اللہﷺ نے متذکرہ بالا دونوں مقاصد حاصل کر لئے۔

ہر قوم میں دو طرح کے انسان ہوتے ہیں۔ آج کی اصطلاح میں انہیں عقابی مزاج کے لوگ (Hawks) اور فاختائی مزاج کے لوگ (Doves) کہا جاتا ہے۔ مکہ میں بھی ہر دو طرح کے لوگ موجود تھے۔ جوشیلے اور مشتعل مزاج لوگوں (Hawks) میں ابوجہل اور عقبہ بن ابی معیط بہت نمایاں تھے' جبکہ ٹھنڈے مزاج اور بردبار طبیعت کے حامل لوگوں (Doves) میں عتبہ بن ربیعہ اور حکیم بن حزام نمایاں تھے۔ مقدم الذکر طبقے کا کہنا تھا کہ چلو اب مدینے پر حملہ کرو اور محمد (ﷺ) اور ان کے

ساتھیوں کا قلع قمع کر دو۔ جبکہ مؤخر الذکر اس طرح کے اقدام کے حق میں نہیں تھے۔ عتبہ بن ربیعہ بہت زیرک انسان تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد قریش سے کہا تھا کہ دیکھو محمدؐ اور اس کے ساتھی یہاں سے چلے گئے (ان کے خیال میں وہ بلا ان کے سر سے ٹل گئی)' اب مدینہ جا کر بھی محمد (ﷺ) آرام سے تو نہیں بیٹھے گا بلکہ اپنے دین کی تبلیغ کرے گا۔ اس سے عرب اس کے خلاف ہوں گے اور بقیہ عربوں سے اس کی کشمکش ہوگی۔ تو اگر باقی عرب کو محمد (ﷺ) نے فتح کر لیا تو ہمارا کیا نقصان ہے' وہ ہمارا قرشی بھائی ہے' اس کی جیت ہماری جیت ہے' اس کی فتح سے عرب پر ہماری حکومت قائم ہو جائے گی' اور اگر عربوں نے محمد (ﷺ) کو ہلاک کر دیا تو جو تم چاہتے ہو وہ ہو جائے گا بغیر اس کے کہ تم اپنے بھائیوں کے خون سے اپنی تلواریں آلودہ کرو۔ آخر ابوبکر کون ہے؟ ہمارا بھائی نہیں ہے کیا؟ عمر کون ہے؟ اور یہ عثمان کون ہے؟ بنوامیہ میں سے ہے۔ حمزہ کون ہے؟ عبدالمطلب کا بیٹا ہے۔ اور محمد (ﷺ) کون ہے؟ عبدالمطلب کا پوتا ہے۔ تم اپنی تلواروں سے ان کی گردنیں اڑاؤ گے؟ تم محمد (ﷺ) کو اور عربوں کو آپس میں نمٹنے دو۔ اگر محمد (ﷺ) جیت گیا تو ہمارا راج پورے عرب پر ہوگا۔ یہ وہ بات تھی جو فی الحقیقت ہو کر رہی۔ خلافتِ راشدہ کے بعد دورِ ملوکیت میں پھر وہی عرب تھے جن کی حکومتیں قائم ہوئیں' چاہے بنواُمیہ تھے' چاہے بنوعباس تھے۔ اس قدر گہری بات اُس شخص نے کہی جس نے اہلِ مکہ کو متاثر بھی کیا۔

ان فاختائی مزاج لوگوں (Doves) کا مکہ میں خاصا اثر و رسوخ تھا' لیکن دو واقعات ایسے وقوع پذیر ہو گئے کہ جنگجو اور مشتعل مزاج لوگوں (Hawks) کا پلڑا بھاری ہو گیا اور یہ Doves بالکل خاموش ہو گئے۔ ایک تو یہ کہ ابوسفیان کا وہ قافلہ جس کا حضور ﷺ نے پیچھا کیا تھا اور وہ بچ کر نکل گیا تھا' اب مالِ تجارت سے لدا پھندا شام سے واپس آ رہا تھا۔ ابوسفیان نے قریش کو SOS کال بھیج دی کہ مجھے خطرہ ہے کہ محمد (ﷺ) کے آدمی قافلے پر حملہ کریں گے اور ہمیں لوٹ لیں گے' لہٰذا فوری طور پر مدد بھیجی جائے۔ ابوسفیان کا پیغام لے کر ایک آدمی چیختا چلاتا ہوا مکہ پہنچا کہ تمہارا قبیلہ' تمہارا خاندان اور تمہارا مال خطرے میں ہے' لہٰذا فوراً مدد کو پہنچو۔ دوسری طرف ایک اور واقعہ ہو گیا۔ حضور ﷺ نے بارہ افراد کا ایک چھوٹا سا دستہ نخلہ بھیجا تھا جو طائف اور مکہ کے درمیان ایک مقام ہے اور انہیں ہدایت کی تھی کہ وہاں قیام کرو اور ہمیں وہاں سے مکہ کے لوگوں کی نقل و حرکت سے مطلع کرتے رہو۔ وہاں ایسی صورت حال پیش ہوئی کہ مکہ والوں کے ایک قافلے کے ساتھ ان کی مڈ

بھیڑ ہوگئی‘ جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاتھوں ایک مشرک مارا گیا‘ دو کو وہ گرفتار کر کے لے آئے اور ایک بھاگ گیا۔ مسلمان کئی اونٹوں کے اوپر لدا ہوا مال بطورِ غنیمت لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس پر حضور ﷺ ناراض ہوئے کہ میں نے تمہیں جنگ کا حکم نہیں دیا تھا۔ لیکن اب جو ہونا تھا‘ ہو چکا تھا۔ جو مشرک مسلمانوں کے ہاتھوں بچ کر بھاگا تھا وہ کپڑے پھاڑ کر چیختا چلاتا ہوا مکہ پہنچا کہ لوگو دیکھو محمد (ﷺ) کے آدمیوں نے ہمارا آدمی مار دیا۔ یہ دو خبریں بیک وقت مکہ پہنچیں‘ ایک شمال سے اور دوسری جنوب سے۔ ہجرت کے بعد اب تک مشرکین نے کسی مسلمان کو نہیں مارا تھا۔ ہجرت سے پہلے حضرت سمیہ اور حضرت یاسر رضی اللہ عنہما کو ابوجہل نے شہید کیا تھا‘ لیکن ہجرت کے بعد اہلِ مکہ کی طرف سے کوئی اقدام نہیں ہوا تھا۔

انقلابِ نبویؐ کا چھٹا مرحلہ: مسلح تصادم

متذکرہ بالا دو واقعات کی وجہ سے Doves کو خاموش ہونا پڑا اور اس کے نتیجے میں غزوۂ بدر سے محمد رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے چھٹے مرحلے یعنی مسلح تصادم کا آغاز ہو گیا۔ یہ رسول اللہ ﷺ اور قریش کے مابین دوطرفہ جنگ تھی جو قریباً چھ سال جاری رہی اور اس دوران حق و باطل کے مابین کئی معرکے ہوئے۔ غزوۂ بدر میں قریش کے ستر بڑے بڑے سردار مارے گئے اور چودہ صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوگئے۔ احد میں الٹا معاملہ ہو گیا کہ بعض صحابہؓ کی غلطی سے ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوگئے۔ تفاصیل کے لئے میری کتاب ’’منہج انقلابِ نبویؐ‘‘ کا مطالعہ کیجیے۔ یہ تو میں اس خاکے میں رنگ بھر رہا ہوں‘ لیکن آپ کو سیرت نہیں پڑھا رہا‘ فلسفۂ سیرت سمجھا رہا ہوں۔ قریشِ مکہ سے آپؐ کی چھ سالہ طویل جنگ ۱۷؍رمضان المبارک سن دو ہجری کو شروع ہوئی اور دس رمضان المبارک ۸ ہجری کو فتح مکہ پر اختتام پذیر ہوئی۔ اس دوران بہت سے اتار چڑھاؤ آئے۔ مختلف غزوات میں سینکڑوں صحابہ رضی اللہ عنہم کو جانوں کی قربانی دینی پڑی۔ غزوۂ احد میں حضور ﷺ خود بھی مجروح ہوئے اور دندانِ مبارک بھی شہید ہوئے۔ تلوار کا وار چہرہ مبارک پر پڑا تو جو خود آپؐ پہنے ہوئے تھے اس کی دو کڑیاں رخسار مبارک کی ہڈی کے اندر گھس گئیں۔ ایک صحابیؓ نے دانتوں سے پکڑ کر کھینچ کر نکالنا چاہا تو ان کے دانت اکھڑ گئے مگر وہ نہیں نکلیں۔ کسی طریقے سے انہیں نکالا گیا تو خون کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ اتنا خون بہا

کہ آپؐ بے ہوش ہو کر گر گئے اور مشہور ہو گیا کہ حضور ﷺ شہید ہو گئے۔ ستر صحابہ کرام ؓ شہید ہوئے' جن میں حضرت حمزہ ؓ بھی شامل تھے۔ ان کے حضور ﷺ کے ساتھ کئی رشتے تھے —— وہ آپ ﷺ کے چچا بھی تھے' خالہ زاد بھائی بھی اور دودھ شریک بھائی بھی' جو عربوں کے ہاں سگے بھائی شمار ہوتے تھے۔ پھر وہ آپ ﷺ کے بچپن کے ہم جولی اور دوست تھے۔ اور ان کی لاش اس حالت میں آئی کہ ناک کٹی ہوئی ہے' کان کٹے ہوئے ہیں' پیٹ چاک کر کے کلیجہ چبایا گیا ہے۔ چنانچہ جان لیجئے کہ انقلاب برپا کرنے کا یہ کام گھر بیٹھے نہیں ہوا۔ اس کے لئے بڑی قربانیاں دی گئی ہیں۔ بہرحال چونکہ یہ کام بھرپور تیاری کے بعد کیا گیا تھا لہٰذا چھ سال کے عرصے پر محیط اس مسلح تصادم کا نتیجہ فتح مکہ کی صورت میں نکلا اور انقلابِ نبویؐ کی تکمیل ہو گئی۔ ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾

فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے جو جنگیں لڑیں ان کی حیثیت ملٹری کی اصطلاح میں Mopping-up operation کی تھی' جس کے ذریعے مخالف قوتوں کا آخری قلع قمع کر دیا جاتا ہے۔ فتح مکہ پر اندرونِ عرب انقلاب کی تکمیل ہو گئی۔

انقلابِ نبویؐ کی توسیع و تصدیر

اب مجھے دو باتوں کی مزید وضاحت کرنی ہے۔ پہلی بات یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے صلح حدیبیہ سے قبل نہ کوئی مبلغ عرب سے باہر بھیجا' نہ اپنا کوئی خط یا پیغام کسی سربراہ حکومت کے نام بھیجا۔ دس سال تک سارا کام مکے میں ہی کیا۔ اس کے بعد طائف کا سفر فرمایا۔ انقلابی عمل کا خاصہ یہ ہے کہ یہ ابتداء میں پھیلتا نہیں ہے۔ مشنری اور تبلیغی کام خربوزے یا ککڑی کی بیل کی طرح زمین پر پھیلتا ہے' جبکہ انقلابی عمل ایک ہی مقام پر اپنی جڑیں جما کر اوپر اٹھتا ہے۔ جیسے آم کی گٹھلی پھٹتی ہے تو اس سے دو پتے نکلتے ہیں' اس سے آم کا پودا بنتا ہے جو تناور درخت بن کر برگ و بار لاتا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد مشنری انداز کی نہیں تھی بلکہ انقلابی انداز کی تھی۔ مکی زندگی کے ابتدائی دَور میں آپؐ کے پاس مال و دولت کی کمی نہ تھی۔ اُس وقت حضرت خدیجہؓ کی دولت موجود تھی جو انہوں نے آپؐ کی خدمت میں پیش کر دی تھی۔ اُس وقت آپؐ چاہتے تو قیصر و کسریٰ اور دوسرے حکمرانوں کو خطوط بھیج سکتے تھے کہ میں اللہ کا رسول ہوں' مجھ پر ایمان لاؤ! لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد آپ ﷺ نے عرب کے مختلف قبائل سے معاہدے کئے لیکن عرب سے باہر کوئی وفد نہیں بھیجا۔ وہ تو

جب صلح حدیبیہ ہو گئی اور قریش نے گویا آپ ﷺ کو مخالف قوت کے طور پر تسلیم (recognize) کرلیا‘ جسے قرآن حکیم نے فتح مبین قرار دیا تو آپ ﷺ نے کسریٰ‘ ہرقل‘ مقوقس‘ نجاشی اوران رؤسائے عرب کی طرف جو جزیرہ نمائے عرب کی سرحدوں پر آباد تھے اورانہوں نے اُس وقت تک اسلام قبول نہیں کیا تھا‘ اپنے دعوتی وتبلیغی نامہ ہائے مبارک چند صحابہ کرام ؓ کے ہاتھ روانہ کئے۔ان نامہ ہائے مبارک کے نتیجہ میں ملوک وسلاطین کی جانب سے مختلف ردِّعمل سامنے آئے۔ ملکِ غسان نے‘ جو ہرقل کے تابع تھا‘ آپ ﷺ کے سفیر حارث بن عمیر ؓ کوشہید کر دیا۔حضور ﷺ نے ان کے قصاص کے لئے لشکر تیار کر کے بھیجا اور غزوۂ موتہ کا معرکہ ہوا۔اس کے بعد پھر غزوۂ تبوک کا معاملہ ہوا۔اس طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہی میں تصدیر انقلاب (یعنی Exporting of Revolution) کے مرحلے کا آغاز بھی ہو گیا۔یعنی حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں نہ صرف اندرونِ ملکِ عرب انقلاب کی تکمیل ہوگئی بلکہ عرب سے باہر کام کا آغاز آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے کیا اور پھر یہ ذمہ داری امت کے سپرد فرمائی کہ تم نے اس کام کو آگے بڑھانا ہے۔

منہج انقلابِ نبویؐ کا حالاتِ حاضرہ پر انطباق

دوسری بات یہ کہ آج وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ گیا ہے اور حالات میں بہت تبدیلی آچکی ہے۔ لہٰذا اس وقت ایک بہت بڑا سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کے دور میں نبی اکرم ﷺ کے طریق انقلاب پر جوں کا توں عمل کیا جائے گا یا اس کے لئے کسی اجتہاد کی ضرورت ہے۔میرے خیال میں اوپر بیان کئے گئے پہلے پانچ مراحل میں قطعاً کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا انقلابی نظریہ آج بھی وہی نظریہ توحید ہے اور آج بھی ہمیں ایمان کی دعوت دینی ہے جس کا منبع وسرچشمہ قرآن ہے۔ یہ تصور درست نہیں ہے کہ ہم مسلمان ہیں تو ہمارے اندر ایمان تو موجود ہے۔اس لئے کہ اسلام اور شے ہے‘ ایمان اور شے ہے۔ ہم مسلمان اس لئے ہیں کہ مسلمان ماں باپ کے گھر پیدا ہو گئے ہیں۔ایمان ہمیں اپنے قلوب واذہان میں خود پیدا کرنا ہے۔توحید پر‘ آخرت پر‘ رسالت پر یقین والا ایمان ہماری اولین ضرورت ہے۔

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

رسول اللہ ﷺ کا آلۂ انقلاب قرآن تھا۔ آج بھی یہی قرآن ہمارا آلۂ انقلاب ہے۔ لہٰذا رجوع الی القرآن کی دعوت وسیع پیمانے پر عام کی جائے۔ میرے نزدیک قرآن کی حیثیت مقناطیس کی ہے جو سلیم الفطرت لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ جن لوگوں کی فطرت مسخ ہو چکی ہو ان پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ مقناطیس لوہے کے ٹکڑوں کو تو کھینچ لے گا لیکن لکڑی کے ٹکڑوں کو نہیں کھینچے گا۔ لہٰذا قرآن کے مقناطیس کو اس معاشرے میں پھیلانے کی ضرورت ہے۔ الحمد للہ کہ میں نے چالیس برس تک اس شہر لاہور میں قرآن کی چکی پھیری ہے۔ مجھے یہ خطاب بھی دے دیا گیا تھا کہ یہ قرآن کا قوّال ہے اور میں نے خوشی سے اس خطاب کو قبول کیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ؎

''ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیثِ دوست کہ تکرار می کنیم''

کے مصداق میں نے جو کچھ پڑھا تھا سب بھلا دیا۔ میڈیکل پڑھی تھی سب بھلا دی۔ ہاں یہ حدیثِ دوست ہے' اللہ کا کلام ہے' اس کی تکرار میں کر رہا ہوں۔ بہرحال پہلا زینہ یہی ہو گا۔ پھر جو لوگ اس میگنٹ کے ساتھ چمٹ کر آ جائیں انہیں بیعت کی بنیاد پر منظم کیا جائے' جو محمد رسول اللہ ﷺ ہمارے لئے بطور اُسوہ چھوڑ گئے ہیں۔ تنظیم کی بنیاد کسی انگریزی نظام پر نہ ہو' کوئی دو تین سال کی امارت کا معاملہ نہ ہو' کوئی انتخابِ امیر کا معاملہ نہ ہو' بلکہ جس داعی نے تمہیں دعوت دی اور تم نے اس کی بات کو صحیح تسلیم کیا' اس کی دعوت پر اعتماد کیا' اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ اس عہد کے ساتھ دے دو کہ ہم شریعت کے دائرہ کے اندر اندر آپ کا حکم مانیں گے۔ اپنا مشورہ ضرور دیں گے' لیکن فیصلہ آپ کا ہو گا۔ جو لوگ اس بنیاد پر جمع ہو جائیں اب ان کی تربیت کی جائے۔ قرآن ان کے اندر اتارا جائے۔ راتوں کو جاگنے کی تشویق دلائی جائے۔ اللہ کی راہ میں انفاقِ مال اور بذلِ نفس کی تلقین کی جائے۔ نفاق کو ختم کرنے والی شے انفاق ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ صبر محض (Passive Resistance) کا مرحلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ آج صبر محض کی شکل کیا ہو گی؟ ہم ابھی حکومت کے لئے کوئی خطرہ نہیں ہیں۔ مکہ کی چھوٹی سی آبادی میں تو سو پچاس آدمی بھی خطرہ بن کر نظر آ گئے تھے' لیکن یہاں پندرہ کروڑ میں دو چار ہزار آدمی ایسے ہوں

تو کیا فرق پڑتا ہے؟ لہٰذا ابھی ان پر حکومت کی طرف سے یا اس نظام کی طرف سے کوئی دارو گیر شروع نہیں ہوگی۔ البتہ ان کا امتحان شریعت پر عمل کرنے میں ہوگا۔ انہیں رشوت چھوڑنی ہوگی' لیکن اس سے اپنے گھر والے دشمن ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ وہ ناشتے میں پہلے پراٹھے اور انڈے کھاتے تھے' اب انہیں روکھی سوکھی پر گزارہ کرنا پڑے گا۔ سورۃ التغابن میں ارشاد ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ﴾ (آیت ۱۴) ''اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے تمہارے دشمن ہیں' پس ان سے بچ کر رہو''۔ آپ اپنے گھر میں شرعی پردہ نافذ کریں گے تو آپ کی پوری برادری آپ کا سوشل بائیکاٹ کر دے گی۔ تو یہ ہے وہ صبر محض (Passive Resistance) کا مرحلہ جس سے ابھی ہم گزر رہے ہیں' لیکن اللہ کرے کہ وہ وقت بھی آئے کہ اتنے لوگ مجتمع ہوں کہ حکومت کو ان سے اندیشہ لاحق ہو جائے کہ یہ اس نظام کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں۔ پھر دارو گیر ہوگی' دار و رسن کا معاملہ ہوگا۔

دورِ حاضر میں حالات واقعتاً اس درجے تبدیل ہو گئے ہیں کہ انقلاب کے آخری مرحلے یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) کے بارے میں اجتہاد کی واقعی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ نبی اکرم ﷺ کے دور میں ایک طرف مسلمان اور دوسری طرف کفار تھے' اور حربی کافر کی گردن مارنے میں کسی کو کیا جھجک ہو سکتی تھی۔ جبکہ آج صورت حال یہ ہے کہ اِدھر بھی مسلمان ہیں اور اُدھر بھی مسلمان۔ ہمارے حکمران جیسے بھی ہوں' ہیں تو مسلمان۔ بھٹو' بے نظیر' ضیاء الحق' نواز شریف اور پرویز مشرف سب مسلمان ہیں۔ دوسرے یہ کہ اُس زمانے میں طاقت کا فرق صرف تعداد کے اعتبار سے تھا۔ اِدھر ۳۱۳ رضا کار (volunteers) تھے تو اُدھر ایک ہزار رضا کار۔ اُدھر بھی باقاعدہ تربیت یافتہ مسلح فوج نہیں تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اُدھر ٹینک' توپیں' میزائل اور بم ہوں اور اِدھر مجاہدین صرف تلواریں لئے کھڑے ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کی فوج کا رسالہ دو گھوڑوں پر مشتمل تھا' اُدھر سو گھوڑوں پر مشتمل رسالہ تھا۔ چنانچہ تعداد میں فرق ضرور تھا' نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہ تھا۔

مزید برآں عمرانی ارتقاء (Social Evolution) کے نتیجے میں آج اس بات کا امکان موجود ہے کہ بغیر جنگ کے حکومت تبدیل کی جا سکتی ہے۔ آج یہ مانا جاتا ہے کہ ریاست اور ہے' حکومت اور ہے۔ شہری ریاست کے وفادار ہوتے ہیں' حکومت کے نہیں۔ حکومت کی تبدیلی تو عوام کا حق ہے۔ اُس وقت تک ابھی عمرانی ارتقاء اس سطح تک نہیں پہنچا تھا' لہٰذا حکومت اور ریاست گڈمڈ

تھے۔ اب یہاں پر بغیر جنگ کے حکومت تبدیل کرنے کے دو راستے ہیں' ایک الیکشن کا راستہ اور ایک احتجاجی تحریک (Agitation) کا راستہ۔ الیکشن کے راستے سے نظام نہیں بدل سکتا' خواہ الیکشن کتنا ہی شفاف اور منصفانہ ہو۔ اس سے تو صرف نظام کو چلانے والے ہاتھ بدل جاتے ہیں۔ اس لئے کہ آپ کے معاشرے میں طاقت کے جو ستون موجود ہیں الیکشن میں انہی کا انعکاس ہوگا۔ اگر ملک میں جاگیردارانہ نظام ہے تو کوئی جاگیردار ہی منتخب ہوکر آئے گا۔ اگر سرمایہ دارانہ نظام ہے تو کوئی سرمایہ دار ہی آئے گا۔ یہ تو شہروں میں کچھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے کہ کبھی کراچی میں جماعت اسلامی کی پوزیشن مستحکم ہوگئی تھی' کبھی ایم کیو ایم کی ہوگئی۔ کیونکہ شہروں میں نہ جاگیردار ہیں نہ قبائلی سردار۔ البتہ ہمارے دیہی علاقوں میں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام قائم ہے۔ سرمایہ دار اور جاگیردار الیکشن کے ذریعے منتخب ہوکر اقتدار میں آئیں گے تو کیا وہ جاگیرداری اور سرمایہ داری ختم کر دیں گے؟ اس طرح تو وہ اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماریں گے۔ تو جان لیجئے کہ الیکشن کسی نظام کو چلانے کے لئے ہوتا ہے' اسے بدلنے کے لئے نہیں ہوتا۔ امریکہ میں دو پارٹیز ہیں' ری پبلیکنز اینڈ ڈیموکریٹس۔ ان دونوں کے مابین امریکہ کے نظام کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ دونوں پارٹیوں کا دعویٰ صرف یہ ہے کہ ہم اس نظام کو اچھے انداز سے چلا سکتے ہیں۔ ان کے منشور میں فرق ہوگا تو ٹیکسیشن پالیسی' ہیلتھ پالیسی یا امیگریشن پالیسی کا ہوگا۔ برطانیہ میں کنزرویٹوز اور لیبر پارٹی کے نام سے دو پارٹیاں ہیں۔ نظام کے بارے میں ان کے مابین بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہاں' اگر امریکہ میں کمیونسٹ ہوں تو وہ نظام کے خلاف بولیں گے۔ چنانچہ سی ایٹل اور واشنگٹن میں گلوبلائزیشن کے خلاف ہونے والے مظاہرے یہ پتا دیتے ہیں کہ وہاں کمیونسٹ عنصر موجود ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے وہ لوگ الیکشن کا راستہ کبھی بھی اختیار نہیں کریں گے' الیکشن کے ذریعے ان کی کامیابی کا سوال ہی نہیں۔

موجودہ دور میں اقدام کی نوعیت

دریں حالات ایک ہی راستہ باقی ہے۔ وہ یہ کہ ایک پُر امن' منظّم عوامی تحریک اٹھے جو توڑ پھوڑ نہ کرے اور سرکاری یا غیر سرکاری املاک کو نقصان نہ پہنچائے۔ البتہ یہ لوگ خود جانیں دینے کو تیار ہوں۔ اس کو میں ''یک طرفہ جنگ'' سے تعبیر کرتا ہوں۔ یہ لوگ سڑکوں پر آ کر منکرات کے خلاف احتجاجی مظاہرے کریں۔ یہ لوگ حکومت پر اپنا موقف واضح کریں کہ ہم نے منکرات کے انسداد کے

لئے آپ سے بہت درخواستیں کیں، آپ کے آگے ہاتھ جوڑے کہ خدارا سود ختم کر دو، لیکن اب ہم picketing کریں گے، دھرنا دیں گے، بینکوں کا گھیراؤ کریں گے اور اس سودی نظام کو جیتے جی نہیں چلنے دیں گے۔ چلاؤ ہم پر گولیاں!

میرے خیال میں اس وقت انقلاب کے لئے یہی قابل عمل طریقہ ہے۔ اگر ہم مشتعل ہو کر اسلحہ اٹھائیں تو کس کے خلاف اٹھائیں گے؟ بری افواج یا ایئر فورس کے خلاف؟ کیا ہماری ماضی کی حکومتوں نے بلوچستان میں دو مرتبہ ایئر فورس استعمال نہیں کی؟ کیا ایئر فورس کے ذریعے سے حافظ الاسد نے ایک دن میں ہزاروں اخوان ختم نہیں کر دیئے تھے؟ اور ان کا مرکز بمباری کر کے تباہ و برباد نہیں کر دیا تھا؟ تو آج مقابلہ بہت غیر مساوی (unequal) ہے۔ جہاں ممکن ہو دو طرفہ جنگ بھی ہو سکتی ہے، کسی پہاڑی ملک میں کوئی چھاپہ مار جنگ بھی ہو سکتی ہے، یہ حرام نہیں ہے۔ دین کو قائم کرنے کے لئے حضور ﷺ نے جنگ لڑی ہے تو ہم بھی لڑ سکتے ہیں اور کلمہ گو کے خلاف بھی لڑ سکتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے موقف کے مطابق مسلمان حکمران اگر فاسق و فاجر ہوں تو ان کے خلاف بغاوت کی جا سکتی ہے۔ پہلے تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر زبان سے کیا جائے۔ اگر یہ زبان سے کہنا مؤثر ثابت نہ ہو تو پھر تلوار کے ذریعے سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کیا جا سکتا ہے۔ تو جنگ اگرچہ جائز ہے، لیکن موجودہ حالات میں عملاً ممکن نہیں ہے۔ آج کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف یک طرفہ جنگ ہی موزوں لائحہ عمل ہے۔

اگر کسی حکومت کے خلاف اس طرح کی ایک احتجاجی تحریک چلتی ہے تو ظاہر ہے اسے روکنے کی کوشش کی جائے گی۔ شروع میں فوج حکومت کا حکم مانے گی اور مظاہرین پر گولیاں چلائے گی۔ لیکن ایک وقت میں آ کر فوج ہاتھ اٹھا دے گی کہ ہم اپنے ہم وطنوں کا مزید قتل نہیں کر سکتے۔ یہ کوئی قابض فوج نہیں ہے، قومی فوج ہے، اور جو سامنے کھڑے ہیں وہ بھی کہیں اور سے نہیں آئے۔ ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر نے اگر سینکڑوں ہزاروں افراد بھون کر رکھ دیئے تھے تو اسے ان کا کیا دکھ تھا؟ وہ انگریز تھا اور مرنے والے ہندوستانی تھے، چاہے مسلمان ہوں چاہے ہندو یا سکھ ہوں۔ لیکن اپنی قوم کے لوگوں کو مارنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ایک حد تک تو حکم کی تعمیل کی جاتی ہے، پھر ایک وقت آتا ہے کہ جب اپنے فوجی افسر ہاتھ کھڑے کر دیتے ہیں۔ جیسے لاہور میں بریگیڈیئر محمد اشرف گوندل، اللہ تعالیٰ انہیں اجر و ثواب دے، کھڑے ہو گئے کہ اب ہم لوگوں پر مزید گولیاں نہیں چلائیں گے۔ پھر دو

اور بریگیڈیئر کھڑے ہو گئے اور بھٹو صاحب کو پیغام مل گیا۔ چند دن پہلے انہوں نے ٹیلی ویژن پر خطاب کرتے ہوئے اپنی کرسی کے بازو پکڑ کر اکڑتے ہوئے کہا تھا کہ میری یہ کرسی بہت مضبوط ہے۔ مجھے آج تک وہ نقشہ یاد ہے۔ لیکن جب لاہور سے پیغام پہنچ گیا کہ فوج کا اب یہ نقطہ نظر ہے تو وہ کرسی ڈول گئی۔ پھر انہوں نے پی این اے کو مذاکرات کا پیغام بھجوایا۔ بہرحال اسلامی انقلاب کے لئے جانیں تو دینی ہوں گی' اس کے بغیر یہ کام نہیں ہوگا۔

دورِ حاضر میں ہمارے سامنے ایرانیوں کی مثال موجود ہے کہ انہوں نے اپنی جانیں دے کر انقلاب برپا کر دکھایا۔ اگرچہ ایرانی انقلاب کو میں صحیح اسلامی انقلاب نہیں سمجھتا' بلکہ میرے نزدیک تو وہ ایک حقیقی انقلاب بھی نہیں تھا' اس لئے کہ وہ اپنی سرحدوں سے باہر نکل نہیں سکا' جبکہ ''تصدیر انقلاب'' ایک حقیقی انقلاب کا لازمی خاصہ ہے۔ ۸۵۔۱۹۸۴ء میں مَیں نے مسجد دارالسلام باغ جناح میں اس موضوع پر خطابات کئے تھے کہ کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے؟ اور پھر اس کے بعد ''منہج انقلابِ نبویؐ'' کے موضوع پر گیارہ تقریریں کی تھیں' جن کا خلاصہ آج آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ وہ تقریریں اب ''منہج انقلابِ نبویؐ'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ اگر آپ کے دل میں ذرا بھی کوئی جذبہ ابھرا ہے تو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔

وقت کی اہم ترین ضرورت

آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ طریق انقلاب واضح ہو جائے۔ آج مسلمانوں میں جذبے کی کمی نہیں ہے۔ ہزاروں لوگ جانیں دے رہے ہیں۔ اپنے جسموں سے بم باندھ کر اپنے جسموں کو اڑا رہے ہیں۔ کشمیر کے اندر جو جذبہ ابھرا اسے پوری دنیا نے دیکھ لیا۔ کشمیریوں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ تو لڑنے والی قوم ہے ہی نہیں' اب اس کے اندر جان پیدا ہو چکی ہے۔ پاکستان سے جا کر کتنے لوگوں نے وہاں پر جامِ شہادت نوش کر لیا۔ لیکن اسلامی انقلاب کا طریق کار یہ نہیں ہے۔ اس سے کہیں کامیابی نہیں ہوگی۔ اس طریقے سے آپ صرف اپنا غصہ نکال سکتے ہیں۔ آپ نے جا کر افریقہ میں امریکہ کے دو سفارت خانوں کو بم سے اڑا دیا' اس سے امریکی تو دس پندرہ مرے' جبکہ ۲۰۰ وہاں کے لوکل افریقی مر گئے۔ فائدہ کیا ہوا؟ بس یہی کہ آپ نے اپنا غصہ نکال لیا۔ تو ان

طریقوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ الیکشن سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس طرح اسلامی انقلاب کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ آپ کا خلوص اپنی جگہ' لیکن یہ طریقہ غلط ہے۔ اسلامی انقلاب کے لئے طریقہ محمدیؐ اختیار کرنا ہوگا۔ کیا حضورﷺ عرب میں الیکشن کے ذریعے سے کامیاب ہو سکتے تھے؟ قرآن تو کہتا ہے ﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ (الانعام: ۱۱۷) ''اگر تم زمین میں رہنے والوں کی اکثریت کی پیروی کرو گے تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے گمراہ کر کے چھوڑیں گے''۔ الیکشن میں تو صرف اکثریت اقلیت کا مسئلہ ہے۔ میں اس سے بھی بڑھ کر کہتا ہوں' کیا آیت اللہ خمینی الیکشن کے ذریعے ایران میں برسرِ اقتدار آ سکتے تھے؟ قطعاً ناممکن! خدا کے لئے اپنے آپ کو دھوکہ دینا چھوڑ دو۔ آج پوری امت عذابِ الٰہی سے صرف اس صورت میں نکل سکتی ہے کہ کم از کم کسی ایک ملک میں اللہ کے دین کو قائم کر کے پوری دنیا کو دعوت دے سکے کہ آؤ دیکھو' یہ ہے اسلام! اس کی برکتیں دیکھو —— اس کی سعادتیں دیکھو —— یہاں کی مساوات اور یہاں کا بھائی چارہ دیکھو —— یہاں کی آزادی دیکھو —— یہاں کا امن وامان دیکھو!! اگر ہم یہ نہ کر سکے تو پھر اللہ کا عذاب سخت سے سخت تر ہوگا۔ ع ''اور کچھ روز فضاؤں سے لہو برسے گا!'' عذاب کی شدت بڑھے گی' گھٹے گی نہیں۔ اور سب سے بڑھ کر عالمِ عرب پر عذابِ خداوندی کے کوڑے برسیں گے۔ اس لیے کہ ان پر اللہ کا بہت بڑا احسان ہوا تھا۔ رسولِ عربی محمد رسول اللہﷺ ان میں سے تھے ع ''یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!'' پھر یہ کہ ان کی زبان میں اللہ نے اپنی آخری کتاب نازل فرمائی۔ ہم تو چٹائی توڑ تعلیم حاصل کرنے کے بعد عربی سیکھ کر قرآن کو سمجھ سکتے ہیں' لیکن ان کی یہ مادری زبان ہے۔

بہرحال پاکستان کی بقا اسی میں ہے کہ یہاں اسلامی انقلاب آئے۔ یہی اس کی وجہ جواز ہے۔ ورنہ پاکستان کا حال تو اس وقت یہ ہے جیسے سورۃ الواقعہ کے آخری رکوع میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب کسی پر نزع کا عالم ہوتا ہے اور اس کے رشتے دار کھڑے ہوئے دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ وہ جا رہا ہے' لیکن بے بس ہوتے ہیں —— فرمایا: ﴿فَلَوْلَاۤ اِنْ كُنْتُمْ غَیْرَ مَدِیْنِیْنَ ﴿۸۶﴾ تَرْجِعُوْنَهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۸۷﴾﴾ ''پھر اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو تو اس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے اگر تم اپنے خیال میں سچے ہو؟'' اسی طرح میں کہہ رہا ہوں کہ یہ پاکستان جا رہا ہے۔ پھر آپ کے محل آپ کے نہیں' کسی اور کے ہوں گے۔ آپ کی ملیں' آپ کے کارخانے کسی اور کے ہوں گے ع ''دیکھنا ان

بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں!'' اگر یہاں اسلام نہ آیا تو پاکستان کو باقی رہنے کا حق حاصل نہیں رہے گا۔ میں نے ''موجودہ عالمی حالات کے پس منظر میں اسلام اور پاکستان کا مستقبل'' کے جامع عنوان کے تحت دو تقریریں کی تھیں ــــ (۱) موجودہ عالمی حالات کے پس منظر میں اسلام کا مستقبل (۲) کیا پاکستان کے خاتمے کی الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے؟ اور کیا ابھی نجات کی کوئی راہ کھلی ہے؟ــــ نجات کی واحد راہ یہ ہے کہ یہاں اسلامی نظام لایا جائے۔ لیکن اس کی خواہش اور جذبہ رکھنے والوں کے سامنے چونکہ طریق کار واضح نہیں ہے لہٰذا وہ اِدھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے ہیں۔

میں نے سیرتِ نبویؐ سے استفادہ کرتے ہوئے' اس سے استنارِ نُور کرتے ہوئے آپ کے سامنے وہ طریق انقلاب رکھ دیا ہے کہ اس کو اختیار کریں گے تو کامیابی کا امکان ہے' ورنہ آپ کا خلوص واخلاص اپنی جگہ پر' کامیابی ممکن نہیں۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

باب سوم

اسلامی نظم جماعت میں بیعت کی اہمیت

باب سوم

اسلامی نظمِ جماعت میں بیعت کی اہمیت

الحمدللہ! گزشتہ ابواب میں ہمارے سامنے فرائضِ دینی کے ضمن میں فریضۂ اقامتِ دین کی خصوصی اہمیت اور اُس کی ادائیگی کے لئے اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں واضح کردہ طریقۂ کار آچکے ہیں۔ اگلی بات یہ رہ جاتی ہے کہ اس اجتماعی جدوجہد کے لئے جو نظم وجود میں آئے اُس کی اساس وبنیاد کیا ہوگی اور کیا قرآن وسنت اس حوالہ سے ہماری کچھ رہنمائی کرتے ہیں؟

زیرِ نظر باب انہی مباحث پر مشتمل ہے۔ اس تمہید کے ساتھ کہ اس باب میں جن نصوص کا تذکرہ کیا گیا ہے اُن کا اولین اطلاق اصلاً تو اُس نظمِ اجتماعی پر ہوتا ہے جسے اسلامی ریاست یا خلافت یا امامت کہا جاتا ہے البتہ سلطانِ شرعی کی غیر موجودگی میں اُس کے قیام واحیاء کے لئے کام کرنے والے نظم کے لئے بھی ایک درجے میں اصولی رہنمائی کا اہم ذریعہ ہیں۔ جیسے اسلوبِ قرآنی میں پوری امت کو خطاب کرکے ارشاد ہوتا ہے كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران: ۱۱۰) (تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے نکالے گئے ہو، اچھائی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو) اور اگر پوری امت اس فریضۂ منصبی کو ادا کرنے سے غافل ہو

جو اُس کی ’’خیریّت‘‘ کا اصل سبب ہے یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر ،تو فرمایا گیا وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ (آل عمران:۱۰۴)(اور تمہارے درمیان ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کی تلقین کرے برائی سے روکے اور ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں)۔اسی مناسبت پر قیاس کر لیجئے الجماعت یعنی اہل سنت والجماعت اور غلبۂ دینِ حق اور شہادتِ حق کے لئے کوشاں جماعتوں اور تحریکوں کو۔

اسلامی جماعت کے نظم اور ہیئت تنظیمی کے حوالے سے بانی محترمؒ کا ایک اہم خطاب ’’اسلامی انقلاب کے لئے التزام جماعت اور لزوم بیعت‘‘ کے عنوان سے تنظیم اسلامی کے بنیادی لٹریچر کا حصہ ہے تاہم بانی محترمؒ نے اگست ۱۹۹۵ء کو امریکہ کے شہر شکاگو میں اس موضوع پر ’’اسلامی نظمِ جماعت میں بیعت کی اہمیت‘‘ کے عنوان سے بر زبانِ انگریزی ایک جامع خطاب فرمایا تھا۔اس خطاب کا اسلوب چونکہ زیادہ آسان فہم ہے لہٰذا اسی خطاب کے اردو ترجمے کو جسے بعد ازاں کتابچے کی صورت میں شائع کیا گیا، ذیل میں ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔(مرتب)

اسلامی نظم جماعت میں بیعت کی اھمیت

خطبۂ مسنونہ‘ متعلقہ آیاتِ قرآنیہ واحادیثِ نبویہ اوراد عیہ ماثورہ کے بعد:

محترم خواتین وحضرات! آپ کے علم میں ہے کہ آج مجھے ’’اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت اور اس کی اساس‘‘ کے موضوع پر خطاب کرنا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بنیادی طور پر قرآن حکیم کا طالب علم ہوں‘ اور چونکہ میں اپنے فہم کے مطابق اللہ کی کتاب کے علم اوراس کی حکمت کو عام کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں‘ لہٰذا آپ مجھے قرآن کا معلم بھی کہہ سکتے ہیں۔ تاہم آج کا خطاب اصلاً چند احادیثِ نبوی ﷺ کے حوالے سے ہوگا‘ اورصرف ثانوی درجے میں قرآنی آیات کا حوالہ آئے گا۔ یہ بات ان شاء اللہ ایک سادہ سی مثال سے واضح ہوجائے گی کہ میں احادیث کو کیوں بنیاد بنا رہا ہوں۔

سنتِ رسولؐ سے راہنمائی

ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن حکیم میں نماز کو قائم کرنے پر کس قدر زور دیا گیا ہے۔ اس عبادت کی اہمیت کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ نماز کے تمام عناصرِ ترکیبی کا ذکر متفرق طور پر قرآن حکیم میں آیا ہے...... جیسے قیام‘ رکوع‘ وضو اور تیمّم ...... لیکن نماز کی کوئی واضح شکل اوراس کا مکمل طریقہ قرآن میں کہیں نہیں ملتا۔ اقامتِ صلوٰۃ کی اہمیت تسلیم‘ لیکن اس کی عملی صورت کیا ہو؟ اس عملی صورت کو معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ ہم سنتِ رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کریں۔

اسی طرح کا معاملہ میرے آج کے موضوع کا ہے۔ اسلام میں اجتماعیت کی اساس اوراس کے عملی طریقہ کار کو معلوم کرنے کے لیے سنتِ نبویؐ ہی سے اصل راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں

کہ جہاں تک اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور مختلف عناصرِ ترکیبی کا تعلق ہے تو قرآن حکیم میں اس سے متعلق متعدد اشارے مل سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم چاہیں کہ ہمارے سامنے اس موضوع کا ایک مکمل اور مربوط خاکہ آ جائے اور اس کے عملی خدوخال واضح ہو جائیں تو یہ سنتِ نبویؐ کی طرف رجوع کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے میں جس روایت کی طرف آپ کی توجہات کو مرکوز کرنا چاہتا ہوں وہ مشکٰوۃ المصابیح (کتاب الامارۃ) میں مسند احمد بن حنبلؒ اور جامع ترمذیؒ کے حوالے سے موجود ہے۔ اس روایت کے الفاظ انتہائی اہم ہیں۔ حضرت حارث الاشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَنَا آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ، اللّٰہُ اَمَرَنِی بِھِنَّ : بِالْجَمَاعَۃِ، وَالسَّمْعِ، وَالطَّاعَۃِ، وَالْھِجْرَۃِ، وَالْجِھَادِ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ)) (۱)

''میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے۔ یعنی جماعت، سننا، اطاعت کرنا، ہجرت، اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا''۔

میرا گمان ہے کہ آپ میں سے اکثر نے یہ حدیث پہلی مرتبہ سنی ہوگی۔ اس روایت کا تقابل اگر آپ اس انتہائی مشہور روایت سے کریں جس میں اسلام کے پانچ ارکان کا ذکر ہے تو بظاہر ایک عجیب تضاد ہمارے سامنے آتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ: شَھَادَۃِ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ، وَاِقَامِ الصَّلَاۃِ، وَاِیْتَاءِ الزَّکَاۃِ، وَالْحَجِّ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ)) (۲)

''اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، (بیت اللہ کا) حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا''۔

(۱) سنن الترمذی، ابواب الامثال عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، باب ما جاء فی مثل الصلاۃ والصیام والصدقۃ۔ ومسند احمد، مسند الشامین: ۱۶۷۱۸ واللفظ لہ۔

(۲) صحیح البخاری، باب بنی الاسلام علی خمس۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ارکان الاسلام ودعائمہ العظام۔

آپ جانتے ہیں کہ اسلام کے پانچ ارکان کا تصور اسی حدیث سے اخذ کیا گیا ہے‘ اور یہ کہ یہ حدیث انتہائی عام ہے‘ بار بار دہرائی جاتی ہے‘ اور مختلف طریقوں سے اس کا حوالہ آتا ہے۔ حالانکہ اگر آپ اس روایت کے الفاظ پر غور کریں تو آپ صاف طور پر محسوس کریں گے کہ اس حدیث میں کوئی حکم نہیں دیا جا رہا۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے۔ یہ ایک حقیقت کا اظہار تو ہے لیکن کلام انشائیہ نہیں ہے‘ کوئی واضح حکم نہیں دیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف وہ روایت دیکھئے جس کا میں نے حوالہ دیا ہے‘ اس میں صریح الفاظ اور انتہائی تاکیدی اسلوب میں حضور ﷺ نے ہمیں پانچ باتوں کا حکم دیا ہے‘ یعنی جماعت‘ سمع و طاعت‘ ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کا۔ اس کے باوجود یہ حدیث وہ ہے جس سے لوگ بالعموم واقف نہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ اس روایت کے وجود ہی سے بے خبر ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس بے خبری کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔

اس موقع پر میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے ایک واقعہ بیان کروں۔ یہ تقریباً بیس برس[(۱)] پہلے کا واقعہ ہے۔ میرا اس حدیث کے ساتھ تعارف مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا مودودی مرحوم کے ذریعے ہوا۔ مولانا آزاد نے ۱۹۱۲ء میں اپنے جریدے ’’الہلال‘‘ میں اور مولانا مودودیؒ نے ۱۹۴۶ء میں مراد پور (سیالکوٹ) کی ایک تقریر میں (جو ’’شہادتِ حق‘‘ کے نام سے مطبوعہ موجود ہے) اس حدیث کا حوالہ دیا تھا۔ لیکن دونوں نے اس روایت کی سند اور حوالہ ذکر نہیں کیا کہ یہ حدیث کس کتاب سے لی گئی ہے۔ مجھے اس روایت میں خاصی دلچسپی تھی اور اسی تجسس کی وجہ سے میں نے ایک بڑے عالم دین سے رابطہ قائم کیا جو لاہور کے ایک دینی ادارے میں شیخ الحدیث تھے۔ چنانچہ میں نے ان سے اس حدیث کے ماخذ اور اسناد سے متعلق سوال کیا۔ جواب میں انہوں نے کہا کہ اس روایت کے الفاظ نامانوس سے محسوس ہو رہے ہیں‘ مجھے یاد نہیں کہ یہ الفاظ میری نظر سے گزرے ہوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ حدیث‘ جیسا کہ میں نے عرض کیا‘ مشکوٰۃ میں موجود ہے‘ جو علمِ حدیث کی پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کے باوجود ایک عالم نے‘ جو علمِ حدیث کے استاد اور اپنے فن میں ماہر سمجھے جاتے ہیں‘ اس روایت کو نامانوس قرار دیا۔ آخر کوئی وجہ تو ہے کہ ایک نہایت اہم روایت عام مسلمانوں ہی کے نہیں‘ علماء کے شعور سے بھی محو ہو گئی! اس وجہ کو سمجھنے کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

---

(۱) بانیٔ محترمؒ نے ۱۹۹۵ء میں یہ بات ارشاد فرمائی تھی، گویا آج اس واقعے کو ۳۶ برس بیت چکے ہیں۔ [2011ء] (مرتب)

اسلام ’’مذہب‘‘ کیونکر بنا؟

اسلام عام معنوں میں مذہب نہیں بلکہ دین ہے۔ مذہب کا لفظ عموماً نہایت محدود مفہوم میں مستعمل ہے‘ یعنی چند عقائد (dogma) ‘ پرستش یا عبودیت کے طریقے (rituals) اور چند سماجی رسومات (social customs)۔اس سے زیادہ یا اس سے آگے بڑھ کر مذہب کی کوئی حیثیت تسلیم نہیں کی جاتی۔ چنانچہ جہاں تک سماجی‘ معاشی اور سیاسی نظام کا تعلق ہے تو آج کے دَور میں یہ مان لیا گیا ہے کہ ان تمام اُمور کا کوئی تعلق کسی مذہب یا کسی آسمانی ہدایت سے نہیں ہونا چاہیے۔اس کے برعکس ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا دین...... دین اسلام......ایک مکمل نظامِ حیات فراہم کرتا ہے اور یہ کہ اس میں ذاتی اور اجتماعی زندگی دونوں کے لیے مکمل ہدایات موجود ہیں۔ بدقسمتی سے مسلمان اُمت کے زوال کی وجہ سے یہ بنیادی حقیقت بھی ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ کے بعد سے زوال کا جو عمل شروع ہوا‘ وہ رفتہ رفتہ یہاں تک پہنچا کہ دین کا یہ مفہوم کہ وہ ہمیں ایک کامل سماجی‘ معاشی اور سیاسی نظام بھی فراہم کرتا ہے‘ ہمارے اجتماعی شعور سے محو ہوگیا‘ اور ہم اسلام کو بھی معروف معنوں میں صرف ایک مذہب سمجھنے لگے۔

اس سلسلے میں مغربی استعمار کی غلامی کا بھی اہم کردار ہے۔ یہ وہ دور تھا جب عیسائیت جیسے ’’مذہب‘‘ سے ہمارا سابقہ پیش آیا۔جیسا کہ آپ جانتے ہیں‘ مسیحیت میں کوئی قانون یا شریعت نہیں ہے۔ پورا مذہب محض چند عقائد‘ چند اخلاقی تعلیمات اور تھوڑے بہت تصوف پر مشتمل ہے۔ نظامِ اجتماعی کی بات تو بہت دور کی ہے‘ مسیحیت میں تو کوئی قانون تک موجود نہیں ہے۔مغرب کی غلامی کے دور میں ہم نے بھی یہی لفظ یعنی’’مذہب‘‘ اختیار کرلیا‘ اور باوجود یکہ اس کا اصل انطباق تو مسیحیت پر ہوتا ہے‘ ہم نے اسلام کو بھی ایک ’’مذہب‘‘ کہنا اور سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان ملکوں پر مغربی قانون اور استعماری نظام کا غلبہ تھا‘ نظامِ اجتماعی کے کسی بھی گوشے کا تعلق اسلام سے باقی نہ رہا تھا‘ بلکہ ہر کام ہمارے غیر ملکی آقاؤں کی مرضی کے مطابق ایک لادینی نظام کے تحت ہوتا تھا۔ نظامِ اسلام جب ایک ٹھوس اور واقعی حقیقت کی صورت میں موجود نہ رہا تو آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کے مصداق دین کا یہ تصور کہ وہ ایک مکمل نظام بھی ہے‘ ہماری نظروں سے غائب ہوگیا۔نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کا اپنا ایک مکمل اور قابل عمل سیاسی‘ سماجی اور معاشرتی نظام بھی ہے تو بہت سے مسلمان بھی چونک جاتے ہیں۔

صدیوں کے مسلسل زوال کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسلام کا بحیثیتِ دین تصور ہی ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ چنانچہ مغربی استعمار کی غلامی کے دور میں بھی ہم مسلمانوں کو عقائد‘ نماز‘ روزے‘ زکوٰۃ‘ حج وغیرہ کی پوری آزادی تھی۔ ہمیں اجازت تھی کہ بچے کی پیدائش پر عقیقہ کریں‘ شادی کے موقع پر نکاح کا طریقہ اختیار کریں‘ فوتیدگی کی صورت میں تجہیز و تکفین کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تمام چیزیں...... عقائد‘ عبادات‘ رسومات...... تو ہماری نظروں میں رہیں‘ لیکن چونکہ اس دورِ غلامی میں ہمارا سماجی‘ معاشی اور سیاسی نظام برقرار نہ رہا‘ لہٰذا اسلام کے یہ پہلو ہمارے اجتماعی شعور سے غائب ہو گئے۔

ہجرت کا وسیع تر تصور

اب میں چاہوں گا کہ زیر بحث حدیث کے الفاظ پر غور کر لیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے جن پانچ باتوں کا حکم فرمایا ہے ہم ان کو عکسی ترتیب سے سمجھنے کی کوشش کریں گے‘ جس کی وجہ آگے چل کر واضح ہو جائے گی۔ آخری دو باتیں ہیں ہجرت اور جہاد۔ یہ دونوں دراصل ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اکثر ہم کسی بات کے منفی پہلو کو پہلے بیان کرتے ہیں اور مثبت کو بعد میں۔ مثلاً لا الٰہ الا اللہ میں بھی نفی پہلے ہے‘ اثبات بعد میں۔ پہلے تمام خداؤں کی نفی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی الوہیت کا اقرار ہے۔ اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ ہجرت ایک ہی حقیقت کا منفی پہلو ہے‘ اور اسی فریضہ کے مثبت پہلو کا نام جہاد ہے۔ ہجرت کا مطلب ہے کسی شے کو ترک کر دینا‘ اور جہاد کا مفہوم ہے کسی شے کے لیے کوشش کرنا۔ چنانچہ یہ دونوں فرائض حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔

ہجرت اور جہاد دونوں کے کئی مراحل اور درجات ہیں‘ لیکن میں آپ کے سامنے ان دونوں فرائض کے ابتدائی اور پھر آخری مراحل بیان کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ ابتدائی اور آخری مراحل سمجھ لینے کے بعد آپ درمیانی مراحل کا اندازہ خود ہی لگا لیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک بار یہ سوال پوچھا گیا کہ کون سی ہجرت سب سے افضل ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ: ((اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ عَزَّوَجَلَّ)) (۱) یعنی سب سے افضل ہجرت یہ ہے کہ تم ہر اُس شے کو چھوڑ دو جو تمہارے پروردگار کی نظر میں ناپسندیدہ ہے۔ اب آپ ذرا اس حدیث مبارک کے نتائج پر غور کریں۔ اگر کوئی شخص آج یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ ہر اُس شے کو ترک کر دے گا جو اللہ کو پسند نہیں تو گویا آج ہی سے اس کی ''ہجرت'' کا آغاز ہو

(۱) سنن النسائی‘ کتاب البیعة‘ باب هجرة البادی۔

جائے گا۔ اگر اس کے کاروبار میں سود کا کوئی حصہ ہے تو اسے چھوڑنا پڑے گا' اور اگر اس کی معاشرت میں کہیں احکامِ شریعت سے تجاوز ہو رہا ہے تو اس طرزِ معاشرت کو ترک کرنا پڑے گا' خواہ اُس شخص کو اپنے دوستوں اور عزیزوں کے استہزاء بلکہ مخالفت ہی کا نشانہ کیوں نہ بننا پڑے۔ چنانچہ ہجرت کا پہلا مرحلہ تو یہ ہے کہ انسان ہر اُس شے کو ترک کر دے جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

اب اس نکتے کو سمجھئے کہ ہجرت کا آخری مرحلہ یا ہجرت کے عمل کا نقطۂ عروج کیا ہے؟ اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد ہم سب پر فرض ہے۔ اگر اس جدوجہد کے دوران ایسا موقع آ جاتا ہے کہ وطن اور گھر بار چھوڑ کر کسی خاص مقام پر جمع ہونے کی ضرورت پیش آ جائے تاکہ باطل کے خلاف آخری حملے کے لیے قوت فراہم کی جا سکے تو یہ ہجرت کی انتہائی شکل ہوگی۔ اگر ایسا موقع آ جاتا ہے تو ہر اُس شخص کے لیے جو اقامتِ دین کی جدوجہد میں مصروف ہو' یہ لازم ہوگا کہ وہ اپنے گھر' اپنی جائیداد' اپنے دوستوں اور رشتہ داروں بلکہ اپنے محبوب وطن تک کو چھوڑ کر اللہ کے دین کے لیے نکل آئے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نقل مکانی اپنا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے یا کسی بہتر اور آسودہ ماحول کی تلاش کے لیے نہیں' بلکہ صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے ہوگی۔

اس ہجرت کا تصور کیجئے جو نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف فرمائی تھی۔ انہوں نے اپنے گھروں اور اپنے مال و متاع کو چھوڑا' اپنے آباء و اَجداد کا شہر چھوڑا' انہوں نے وہ سرزمین چھوڑی جہاں ان کے باپ دادا کی ہڈیاں دفن تھیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے دنیا کا سب سے قیمتی اور مقدس مقام' خانہ کعبہ' تک چھوڑ دیا۔ تصور کیجیے کہ یہ ہجرت کس غرض کے لیے تھی؟ کیا یہ لوگ اپنا معیارِ زندگی بلند کرنا چاہتے تھے؟ کیا انہیں بہتر کاروباری مواقع کی تلاش تھی؟ کیا وہ دولت و جائیداد کے اعتبار سے پھلنا اور پھولنا چاہتے تھے؟ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی شے بھی ان کو مطلوب نہ تھی۔ ان کی یہ ہجرت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تھی' اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے تھی۔ اس کے علاوہ کوئی اور مقصد ان کے سامنے نہ تھا۔

جہاد کے مختلف مراحل

اب اس تصویر کے دوسرے رخ پر اپنی توجہ کو مرکوز کیجیے۔ جہاد کا پہلا مرحلہ کیا ہے اور اس کی آخری منزل کون سی ہے؟ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا جہاد سب سے افضل ہے؟ حضور ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ سب سے افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس کے خلاف کشمکش

کرواور اسے اللہ تعالیٰ کا مطیع بنا دو۔ اسی طرح ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اصل مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ نفس سے کیا مراد ہے؟ انسان کے وجود میں ایک شے تو اس کی فطرت ہے جو اس کی روح سے عبارت ہے' اور دوسرا اس کا نفسِ حیوانی ہے جو اس کے جبلی تقاضوں سے عبارت ہے۔ یہ حیوانی اور جبلی تقاضے اندھے ہیں' انہیں حرام وحلال سے غرض نہیں' بلکہ صرف اپنی تسکین چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ان خواہشات کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو انسان لامحالہ گناہ اور فسق و فجور کے راستے پر پڑ جاتا ہے' لہٰذا لازم ہے کہ ہم ان خواہشات کے خلاف کشمکش کریں اور انہیں اللہ تعالیٰ کے احکامات کے تابع بنائیں۔ یہ کوشش اصل میں حضور ﷺ کے قول کے مطابق جہاد کی پہلی سیڑھی ہے۔

اب اس بات کو سمجھئے کہ جہاد کا آخری مرحلہ یا جہاد کا نقطۂ عروج کیا ہے؟ اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد ہم سب پر فرض ہے۔ اگر اس جدوجہد کے دوران ایسا موقع آ جاتا ہے کہ ہر وہ شخص جو اس جدوجہد میں مصروف ہو اس کے لیے لازم ہو جائے کہ وہ کفر اور شرک کی طاقتوں کے خلاف لڑنے کے لیے میدان میں آ جائے تو یہ جہاد کا آخری مرحلہ ہوگا۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''اگر ایک مسلمان اس حال میں مر جاتا ہے کہ اس نے نہ تو اللہ کی راہ میں کسی جنگ میں حصہ لیا اور نہ اس کے دل میں اس کی خواہش پیدا ہوئی تو وہ ایک قسم کے نفاق کی حالت میں مرا''(۱)۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو ایمانِ حقیقی حاصل ہو اور اسے یہ علم ہو کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد اس پر فرض ہے' تو یہ آپ سے آپ لازم آ جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کرنے کی ایک شدید خواہش بھی اس کے دل میں موجود ہو۔ البتہ یہ عین ممکن ہے کہ اس شخص کی زندگی میں ایسے مسلح تصادم کا موقع ہی نہ آئے۔ جیسے کہ حضور ﷺ کے بہت سے صحابہؓ ایسے تھے جو ہجرت سے پہلے ہی وفات پا گئے۔ گویا ان کی زندگیوں میں قتال فی سبیل اللہ کا موقع ہی نہیں آیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس راہ میں لڑنے کی شدید آرزو ان کے دلوں میں یقیناً موجود تھی۔ اس لیے کہ اگر یہ آرزو کسی کے دل میں موجود نہ ہو تو اس کے ایمان ہی کی نفی کر دی گئی ہے۔

ہجرت و جہاد کی شرطِ لازم: التزامِ جماعت

یہاں یہ سوال اپنے سامنے رکھئے کہ کیا ہجرت اور جہاد کے یہ فرائض ایک منظّم اور متحد جماعت کے بغیر بھی ادا کیے جا سکتے ہیں؟ کیا کوئی شخص اپنی انفرادی حیثیت میں ہجرت اور جہاد کا حق ادا کر سکتا

(۱) صحیح مسلم' کتاب الجهاد' باب ذم من مات ولم یغز ولم یحدث نفسه بالغزو۔ عن ابی هریرة ؓ۔

ہے؟ آپ اپنے نفس اَمارہ کے خلاف تو کشمکش تنہا رہ کر بھی کر سکتے ہیں‘ لیکن کیا اللہ کے دین کی اقامت اس طرح ممکن ہے؟ کیا کوئی فرد اپنی ذاتی حیثیت میں اتنا طاقتور ہوسکتا ہے کہ وہ اسلام کے نظامِ عدل اجتماعی کو محض اپنے زورِ بازو سے نافذ کر سکے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب صرف نفی میں ہی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اگر ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ کا حق ادا کرنا ہے تو یہ کام ایک منظّم جماعت کے بغیر ناممکن ہے۔ اگر اقامت دین کی جدوجہد فرض ہے تو یہ فرض ایک منظّم جماعت کے بغیر محض انفرادی طور پر ادا نہیں کیا جا سکتا‘ اس کے لیے ایک جماعت کا ہونا لازم ہے۔ چنانچہ زیر مطالعہ حدیث میں یہ نکتہ خاص طور پر قابل غور ہے کہ حضور ﷺ نے سب سے پہلے جس بات کا مسلمانوں کو حکم دیا وہ التزام جماعت ہے۔ یعنی مسلمانوں کے لیے یہ شے لازم کی گئی کہ وہ اپنے آپ کو ایک جماعت کی شکل میں منظّم رکھیں۔ یہ جماعت اور اس کا نظم اس لیے مطلوب ہے کہ آخری دو فرائض یعنی ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ کو کما حقہٗ ادا کیا جا سکے۔ اس نکتے کی مزید وضاحت کے لیے میں چاہوں گا کہ آپ کے سامنے چند اور احادیث بھی آ جائیں جن میں جماعت کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

امام ترمذیؒ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب ؓ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ، وَإِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ، وَهُوَ مِنَ الِاثْنَيْنِ أَبْعَدُ)) (۱)

”جماعت کو لازم پکڑو‘ اور تم تنہا مت رہو‘ اس لیے کہ اکیلے شخص کا ساتھی شیطان بن جاتا ہے‘ لیکن اگر دو (مسلمان) ساتھ رہیں تو وہ دُور ہو جاتا ہے۔“

اس حدیث میں حضور ﷺ نے مسلمانوں کو واضح طور پر خبردار کیا ہے کہ اگر ایک مسلمان جماعت سے الگ رہتا ہے تو شیطان اسے اپنا شکار بنا لیتا ہے اور صراطِ مستقیم سے بھٹکا دیتا ہے۔

ایک دوسری روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((يَدُ اللّٰهِ مَعَ الْجَمَاعَةِ وَمَنْ شَذَّ شَذَّ إِلَى النَّارِ)) (۲)

”اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ جو شخص خود کو جماعت سے کاٹ لیتا ہے وہ آگ میں ڈالا جائے گا۔“

مراد یہ ہے کہ اللہ کی مدد اور حمایت مسلمانوں کی اجتماعیت کے لیے ہے نہ کہ افراد کے لیے۔ اگر

---

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب الفتن عن رسول اللّٰہ ﷺ‘ باب ما جاء فی لزوم الجماعة۔

(۲) سنن الترمذی‘ ابواب الفتن عن رسول اللّٰہ ﷺ‘ باب ما جاء فی لزوم الجماعة۔

ایک شخص اجتماعیت سے خود کو کاٹ لیتا ہے تو پہلی حدیث کی رُو سے وہ شیطان کے لیے نرم چارہ ثابت ہوتا ہے جو اسے صراطِ مستقیم سے بھٹکا دیتا ہے' اور اس طرح آخرت میں ایسا شخص جہنم کا مستحق بنتا ہے۔

اس سلسلے کی تیسری روایت اصل میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے (اور علم حدیث کی رو سے یہ بھی ''حدیث'' ہی ہے)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((اِنَّـهُ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ وَلَا جَمَاعَةَ اِلَّا بِاِمَارَةٍ وَلَا اِمَارَةَ اِلَّا بِطَاعَةٍ))(۱)

''یہ ایک حقیقت ہے کہ جماعت کے بغیر اسلام نہیں ہے' اور امارت کے بغیر جماعت نہیں ہے' اور امارت کا کوئی فائدہ نہیں اگر اس کے ساتھ اطاعت نہ ہو''۔

دین میں اجتماعیت کی اہمیت

آگے بڑھنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے ہمارے دین کے مزاج کی ایک جھلک آ جائے۔ میں نے شروع میں اس اہمیت کی طرف اشارہ کیا تھا جو ہمارا دین نماز کو دیتا ہے۔ مردوں کے لیے فرض نمازیں باجماعت ادا کرنا لازم کیا گیا ہے' سوائے اس کے کہ کوئی حقیقی عذر لاحق ہو۔ جماعت کی شکل میں نماز ادا کرنا دراصل اس امر کی ایک علامت ہے کہ اسلام تمام معاملات میں ایک طرح کا عمومی نظم چاہتا ہے۔

باجماعت نماز میں کیا ہوتا ہے؟ ایک امیر یا امام ہے جس کی تمام نمازیوں کو پیروی کرنا ہوتی ہے۔ کسی نمازی کو اجازت نہیں کہ وہ نماز کا کوئی رکن امام سے پہلے ادا کر لے۔ اگر کوئی شخص امام سے پہلے اپنا سر سجدے سے اٹھا لے تو اس کی نماز ٹوٹ جائے گی۔ انتہا یہ ہے کہ اگر امام نماز پڑھانے میں کوئی غلطی کر بیٹھتا ہے تو آپ کو اس کی اجازت تو ضرور ہے کہ سبحان اللہ کہہ کر اسے متوجہ کریں' لیکن اگر وہ اپنی غلطی پر قائم رہتا ہے تو آپ کو جماعت چھوڑ دینے کی ہرگز اجازت نہیں۔ یہاں تک کہ اگر آپ کو سو فیصد یقین ہو کہ امام سے غلطی کا صدور ہو رہا ہے تب بھی آپ جماعت چھوڑ کر الگ نہیں ہو سکتے' بلکہ ضروری ہے کہ آپ لازماً جماعت کے ساتھ رہیں اور امام کی غلطی میں بھی اس کی پیروی کریں۔ جماعت کی اہمیت یہ ہے کہ آپ کو اس کے ساتھ اپنے آپ کو پیوستہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے خواہ آپ اپنے امام سے اختلاف ہی کیوں نہ رکھتے ہوں۔

دوسری مثال اسلام کے سماجی نظام سے لیجیے' جس کی بنیاد ''نکاح'' کے ادارے کے ذریعے

---

(۱) سنن الدارمی' المقدمۃ' باب فی ذھاب العلم۔

استوار ہوتی ہے۔ نکاح کیا ہے؟ ایک عورت اس بات کا اقرار کرتی ہے کہ وہ شریعت کے دائرے کے اندر اندر اپنے شوہر کی اطاعت کرے گی اور اپنے آپ کو نکاح کے لیے پیش کرتی ہے۔ ایک مرد اس پیشکش کو قبول کرتا ہے اور اس طرح نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔ غور کیجیے کہ فی الواقع اگر آپ کو ایک مضبوط اور صحت مند خاندانی نظام تشکیل دینا ہے تو یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اطاعت فی المعروف اور نظم کو بھرپور طریقے سے قائم کیا جائے۔ اسی لیے اسلام نے بیوی پر لازم کیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کی اطاعت کرے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ بیوی اپنے شوہر سے اختلاف کر سکتی ہے' اس کی رائے بدلنے کی کوشش کر سکتی ہے' وہ اپنے شوہر کو مشورہ یا تجویز دے سکتی ہے' وہ دلائل کے ذریعے بات کر سکتی ہے یا استدعا اور درخواست کر سکتی ہے' لیکن اگر وہ اپنے شوہر کی اطاعت پر کاربند نہیں تو یہ رویہ اسلامی تعلیمات کے منافی سمجھا جائے گا۔

ایک تیسری مثال لیجیے۔ نبی مکرم ﷺ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ اگر دو افراد بھی اکٹھے سفر کر رہے ہوں تو انہیں چاہیے کہ وہ اپنے میں سے زیادہ تجربہ کار اور باعلم شخص کو امیر مقرر کر لیں' جو دوسرے مسافر کی رہنمائی کرے۔ اسی طرح اگر دو افراد ساتھ ہوں اور نماز ادا کرنے کا موقع آ جائے تو ان میں سے ایک کو امام بن جانا چاہیے اور دوسرے کو مقتدی۔ ان مثالوں سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں اجتماعیت کو کس قدر اہمیت دی گئی ہے۔ نیز ان سے اسلام میں اجتماعی زندگی کے نظام پر روشنی پڑتی ہے' جو ہمارا اگلا موضوع ہے۔

نظم جماعت کی مختلف شکلیں

اسلام میں اجتماعی زندگی کے مزاج کو درست طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے سامنے اس نظام کا خاکہ بھی رہے جو دنیا میں عموماً اختیار کیا جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کی دنیا میں کئی طرح کے ادارے' جماعتیں' انجمنیں وغیرہ قائم کی جاتی ہیں۔ یہ سب اجتماعیت ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں دو امور نہایت اہم ہوتے ہیں' اوّلاً تاسیسی یادداشت جس میں اس ادارے' جماعت' یا انجمن کے اغراض و مقاصد بیان کیے جاتے ہیں اور ثانیاً اس کا دستور۔ جہاں تک دستور کا تعلق ہے' ہم دیکھتے ہیں کہ قریب قریب ایک جیسے قواعد وضوابط ہیں جو مختلف قسم کے اداروں کے دساتیر میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ رکنیت کی شرائط ہوتی ہیں۔ پھر ارکان کسی صدر یا چیئر مین کو

منتخب کرتے ہیں۔ پھر مجلس عاملہ یا شوریٰ کے انتخاب کے لیے قواعد ہوتے ہیں۔ آخر میں اختیارات کی تقسیم کا معاملہ طے کیا جاتا ہے اور Checks and balances کا نظام وضع ہوتا ہے۔ اس قسم کی جماعتیں نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتی ہیں۔ اس طریق کار میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جسے قرآن یا سُنّت کی بنیاد پر غلط کہا جا سکے۔ تنظیم یا اجتماعیت کی یہ صورتیں قطعی طور پر جائز اور مباح ہیں۔

جو نکتہ میں واضح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگرچہ جماعت سازی کا یہ نظام جو آج دنیا میں عام طور پر پایا جاتا ہے خلافِ اسلام نہیں، تاہم اس نظام کے حق میں کوئی دلیل نہ قرآن مجید سے ملتی ہے اور نہ سنّتِ رسول ﷺ سے۔ اس کے باوجود میری رائے یہی ہے کہ یہ طریقہ غیر اسلامی یا غیر شرعی ہرگز نہیں۔ یہ رائے دراصل فقہ کے ایک بنیادی اصول پر مبنی ہے، یعنی ہر کام مباح اور جائز سمجھا جائے گا جب تک کہ اس کا حرام ہونا کسی شرعی دلیل سے ثابت نہ کر دیا جائے۔

اس کے برعکس جماعت سازی کا جو طریقہ ہمیں قرآن پاک سے ملتا ہے، جو حضور ﷺ کی سیرت اور سنت سے ملتا ہے اور جو اُمت مسلمہ کی تیرہ سو سالہ تاریخ میں ملتا ہے، وہ اس طریقے سے بالکل مختلف ہے جو آج کی دنیا میں عموماً رائج ہے۔

اسلامی اجتماعیت کی دو بنیادی اصطلاحات

آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ اسلامی اجتماعیت سے متعلق بعض بنیادی اصطلاحات کو سمجھ لیا جائے۔

ا۔ امیر: اس ضمن میں پہلی اصطلاح ہے امیر۔ امیر سے کیا مراد ہے؟ آپ کے علم میں ہے کہ لفظ امیر سے ملتا جلتا ایک اور لفظ اردو میں مستعمل ہے، یعنی آمر۔ آمر کا لفظ انگریزی لفظ Dictator کے مترادف کے طور پر بولا جاتا ہے اور یہ لفظ کبھی بھی اچھے معنوں میں نہیں آتا۔ اگر آپ کسی قائد یا رہنما کو ''آمر'' کہہ دیں یا اس کے رویے کو ''آمرانہ'' قرار دیں تو گویا یہ ایک شدید تنقید سمجھی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم آج ایک ایسے دَور میں سانس لے رہے ہیں جو جمہوریت اور عوام کی حاکمیت کا دور ہے، اور اس ماحول میں کوئی بھی ایسی شے پسندیدہ نہیں سمجھی جاتی جو سلطانئ جمہور کے اونچے تصورات سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ لیکن نوٹ کیجیے کہ امیر کا لفظ آمر کے مقابلے میں کہیں زیادہ گاڑھا ہے۔

عربی زبان کی باریکیوں سے واقفیت رکھنے والے اس نکتے کو اچھی طرح سمجھ لیں گے کہ جب کوئی شخص ایک کام کر رہا ہوں تو اسے ''فاعل'' کہتے ہیں، مثلاً قادر، عالم، آمر وغیرہ، لیکن جب اس

کام کو کرنے کی صلاحیت اور صفت اس شخص میں مستقل طور پر پائی جائے اور اس کی شخصیت کا مستقل جزو بن جائے تو پھر اسے ''فعیل'' کہتے ہیں' مثلاً قدیر' علیم' اور امیر۔ چنانچہ دوبارہ نوٹ کیجیے کہ جس حدیث کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں اس میں قائد یا رہنما کے لیے لفظ ''امیر'' استعمال ہوا ہے جو آمر سے کہیں زیادہ گاڑھا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں: ''جس نے میری اطاعت کی اس نے اصل میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ جس نے (میرے مقرر کیے ہوئے) امیر کی اطاعت کی اس نے گویا میری اطاعت کی اور جس نے (میرے مقرر کیے ہوئے) امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی''۔(۱)

ظاہر ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں بنفسِ نفیس موجود تھے تو آپؐ خود ہی مسلمانوں کے امیر بھی تھے' فوج کے سپہ سالار بھی تھے' اور سربراہِ حکومت بھی تھے۔ لیکن اُس وقت بھی آپؐ کے مقرر کردہ امراء کا ایک پورا سلسلہ موجود تھا اور یہ امراء مختلف سطحوں پر نگران اور قائد تھے۔ مثال کے طور پر اگر کسی غزوے کا موقع ہو تو ظاہر ہے کہ فوج کے سپہ سالار تو حضور ﷺ خود ہی تھے' لیکن پھر آپؐ کے تحت دوسرے امراء بھی مقرر ہوتے تھے' مثلاً میمنہ کا امیر' میسرہ کا امیر' وغیرہ۔ پھر ان بڑی شاخوں کے آگے چھوٹی شاخیں اور ان میں سے ہر ایک کے لیے الگ امیر کا تقرر ہوتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد امراء کی ایک پوری زنجیر تھی اور اس زنجیر کو برقرار رکھنا ضروری تھا۔ اگر اس سلسلے میں کہیں کوئی خرابی ہوتی تو لازماً منفی نتائج برآمد ہوتے۔ چنانچہ یہی چیز غزوۂ اُحد میں پیش آئی۔

غزوۂ احد میں رسول اللہ ﷺ نے پچاس تیراندازوں کا ایک دستہ ایک پہاڑی درّے پر مقرر فرمایا اور حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو اس کا امیر بنایا۔ آپ ﷺ کا حکم تھا کہ تم یہاں سے ہرگز مت ہلنا' یہاں تک کہ اگر تم دیکھو کہ تمام مسلمان مارے گئے ہیں تب بھی تم اپنی جگہ مت چھوڑنا۔ جنگ کے دوران جب تیراندازوں نے دیکھا کہ دشمن مغلوب ہو گیا ہے تو انہوں نے اپنے امیر یعنی حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کے روکنے کے باوجود اپنی جگہ چھوڑ دی۔ میری رائے یہ ہے کہ تیراندازوں نے حضور ﷺ کے حکم کی تاویل کی' اور یہ سمجھا کہ حضور ﷺ کا حکم صرف اس صورت میں تھا اگر مسلمانوں کو شکست کا سامنا

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجھاد والسیر' باب تعامل من وراء الامیر ویتقی بہ۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ......

ہوتا' لیکن یہاں تو ہمیں فتح مل رہی ہے۔ چنانچہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان صحابہؓ نے حضور ﷺ کی نہیں بلکہ اپنے مقامی امیر کی حکم عدولی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کے گھڑ سواروں نے موقع غنیمت جان کر مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کر دیا اور شدید نقصان پہنچایا۔ پینتیس صحابہؓ کی غلطی کی وجہ سے ستر صحابہ شہید ہوئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمان افواج پر واضح کر دیا کہ نظم کی کیا اہمیت ہے اور امیر کا حکم نہ ماننے کی کس طرح سزا ملتی ہے۔

غور کیجیے کہ اسلام نظم اور تنظیم کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کا معاملہ تو یہ تھا کہ آپ کو براہِ راست خود رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا تھا۔ بعد میں صورت حال یہ رہی کہ مسلمان خود اپنے خلیفہ یا امیر کو باہمی مشورے کے ذریعے منتخب کرتے تھے۔ لیکن ایک حدیث کے مطابق' جس کے راوی حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ ہیں حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ (اے مسلمانو!) تم پر سمع و طاعت لازم ہے خواہ کوئی غلام ہی تمہارا امیر بن بیٹھے[1] (یعنی مسلمانوں کی مرضی کے بغیر) بشرطیکہ وہ تمہیں کوئی خلافِ شریعت حکم نہ دے۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں اجتماعیت اور نظم کی کیا اہمیت ہے کہ اگر کوئی شخص زبردستی حکومت پر قبضہ کر لیتا ہے تب بھی شریعت کے دائرے کے اندر اس کی اطاعت کی جائے گی۔ مقصد یہ ہے کہ غیر ضروری فتنہ وفساد سے اُمت کو بچایا جائے۔ امیر کے حکم کی نافرمانی صرف اسی صورت میں جائز ہے اگر وہ واضح طور پر شریعت سے تجاوز کرے' اور مسلح بغاوت اسی صورت میں صحیح ہوگی اگر ایک پائیدار تبدیلی برپا کر دینے کے لیے کافی طاقت فراہم ہو چکی ہو۔

---

(۱) حضرت عرباض بن ساریہؓ سے مروی یہ روایت حافظ ابن قیمؒ نے ''اعلام الموقعین'' (۱۱۹/۴) میں اور حافظ منذریؒ نے ''الترغیب والترھیب'' (۶۰/۱) میں درج کی ہے اور علامہ البانیؒ نے ''صحیح الترغیب والترھیب'' میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اسے امام نوویؒ نے اپنی ''اربعین'' میں ترمذی اور ابوداؤد کے حوالے سے درج کیا ہے (حدیث ۲۸)۔ اس روایت کے الفاظ ہیں: ((اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَاِنْ تَأَمَّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ...... الخ)) ''یعنی'' میں تمہیں خدا ترسی کی نصیحت کرتا ہوں اور سننے اور ماننے کی' خواہ تم پر ایک غلام ہی امیر بن بیٹھے......'' لیکن ترمذی اور ابوداؤد کے علاوہ سنن ابن ماجہ' مسند احمد اور سنن دارمی میں بھی عرباض بن ساریہؓ کی روایت جن الفاظ میں نقل ہوئی ہے ان میں ''تأمّر علیکم'' کے الفاظ شامل نہیں ہیں۔ تاہم امام نوویؒ نے صحیح مسلم کی شرح میں اسی مضمون کی ایک اور حدیث مبارک ((وَلَوِ اسْتُعْمِلَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ یَقُوْدُکُمْ بِکِتَابِ اللّٰهِ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِیْعُوْا)) کے ذیل میں لکھا ہے کہ ''ایک غلام اگر غلبہ حاصل کر کے از خود امیر بن بیٹھے اور امورِ سلطنت کتاب وسنت کے مطابق انجام دے تو اس کی اطاعت لازم ہے۔ البتہ عام حالات میں جبکہ امیر کا انتخاب مسلمانوں کی آزادانہ رائے سے ہو رہا ہے' کسی غلام کو امیر منتخب کرنا درست نہیں ہوگا''۔

خود سے امیر بن جانے کی ایک صورت اور بھی ممکن ہے' مثلاً میں بھی امیر ہوں' حالانکہ کسی نے مجھے منتخب نہیں کیا ہے۔ میں پاکستان میں ایک انقلابی جدوجہد کے ذریعے اسلام کا نظامِ عدل اجتماعی' یا دوسرے لفظوں میں نظامِ خلافت' قائم کرنا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ مجھ اکیلے کے بس کی بات نہیں۔ مجھے ساتھی اور اعوان وانصار درکار ہیں۔ میں عوام میں اپنے خیالات کو عام کرتا ہوں اور پھر یہ پکار لگاتا ہوں کہ مَنۡ اَنۡصَارِیۡ اِلَی اللّٰہِ؟ کون لوگ اس کام میں میرے دست و بازو بننے کو تیار ہیں؟ کون لوگ اللہ کی حاکمیت کو بالفعل قائم کرنے کے کام میں میری مدد کریں گے؟ اب جو افراد بھی مجھ سے اتفاق کرتے ہیں اور میرے بتائے ہوئے طریق کار کو درست سمجھتے ہیں' وہ میرے ساتھ مل جاتے ہیں' میرے ساتھی اور اعوان وانصار بن جاتے ہیں۔ اس طرح کی جماعت اُوپر سے نیچے کی طرف بڑھتی ہے۔ چونکہ لوگ میری پکار پر جمع ہوئے ہیں لہٰذا میں خود بخود امیر بن جاتا ہوں' اور کسی قسم کے انتخاب کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اب آپ ان چار اقسام کے امراء کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اولاً وہ امیر جسے کوئی بڑا امیر کسی خاص علاقے یا کسی مخصوص گروہ کا قائد مقرر کرے۔ مثلاً وہ امراء جنہیں رسول اللہ ﷺ نے مقرر فرمایا تھا۔ ثانیاً وہ امیر جسے مسلمان باہمی مشورے اور رضامندی سے اپنا حاکم منتخب کریں۔ مثلاً خلفائے راشدینؓ۔ ثالثاً وہ شخص جو مسلمانوں کی مرضی کے بغیر حکومت پر قبضہ کر کے ان کا حاکم بن جائے۔ مثلاً مسلمانوں کی تاریخ کے اکثر بادشاہ اور آج کے دور کے فوجی حکمران۔ رابعاً وہ شخص جو اسلام کے لیے کسی جدوجہد کا آغاز کرنا چاہے اور اس میں اسے دوسرے مسلمانوں کی مدد اور ان کے تعاون کی ضرورت ہو۔ یہ شخص ابتدا میں داعی کے طور پر کام کرتا ہے اور لوگوں کو جمع کرنے کے لیے پکار لگاتا ہے۔ جب لوگ جمع ہو کر اس کے ساتھی بن جاتے ہیں تو وہ ان کا فطری امیر بن جاتا ہے۔

۲۔ <u>سمع وطاعت</u>: امیر کے بعد دوسری اصطلاح جس کے مفہوم کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے' وہ ہے ''سمع وطاعت''۔ واضح رہے کہ جس طرح ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' بظاہر دو کام ہیں لیکن اصلاً ایک ہی اصطلاح بنتے ہیں' اسی طرح سمع وطاعت بھی قرآن حکیم کی ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے دونوں اجزاء باہم پیوست ہیں اور جدا نہیں کیے جاسکتے ہیں۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ سمع وطاعت دراصل فوج کے نظم کو ظاہر کرنے کی خاص اصطلاح بھی ہے۔ ایک عام سپاہی کا فرض یہ ہے وہ سنے اور اطاعت کرے۔ یعنی یہ کہ وہ اپنے سے بالاتر افسر سے احکامات وصول کرے اور ان پر عمل پیرا ہو۔

اسے اس کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنے کمانڈر سے بحث کرے اور اس کے حکم کی علت یا مقصد دریافت کرے۔ ظاہر ہے کہ ایک جنگ کے دوران وہی سپاہی کارآمد ثابت ہوں گے جو کیا اور کیوں کی بحث میں پڑنے کے بجائے اپنے افسر کے احکامات کو سنیں اور عمل کریں۔ فوج کا یہی وہ نظم ہے جسے ایک مشہور انگریزی نظم Charge of the Light Brigade میں بیان کیا گیا ہے۔ کسی لڑائی کے دوران صورت حال یہ ہوئی کہ فوج کے ایک دستے کو آگے بڑھنے کا حکم ملا' لیکن دشمن کی توپیں ہر طرف موجود تھیں۔ ہر سپاہی سمجھ رہا تھا کہ آگے بڑھنے کا حکم صریحاً کسی غلطی کا نتیجہ ہے' لیکن اس کے باوجود کسی نے بحث نہیں کی' کسی نے وضاحت طلب نہیں کی' اور کسی نے حکم کے صحیح یا غلط ہونے کا سوال نہیں اٹھایا۔ سب نے حکم کی تعمیل کی اور سب کے سب مارے گئے۔

Their's not to reason why,
Their's but to do and die!

اس موقع پر میں قرآن مجید کے تین مقامات کا حوالہ دینا چاہتا ہوں' تاکہ سمع وطاعت کی جو اہمیت اسلام کے نظامِ زندگی میں ہے وہ پوری طرح واضح ہو جائے۔

﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴿۲۸۵﴾﴾ (البقرۃ)

''......اور کہہ اُٹھے کہ ہم نے سنا اور قبول کیا' ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۷﴾﴾ (المائدۃ)

''اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر اور عہد اس کا جو تم سے ٹھہرایا تھا جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور مانا' اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' بیشک اللہ خوب جانتا ہے دلوں کی بات۔''

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ﴾

(التغابن:١٦)

''سو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جہاں تک ہو سکے' اور سنو اور مانو' اور خرچ کرو اپنے بھلے کو......''

اسلام میں نظم جماعت کی اساس

جیسا کہ میں نے عرض کیا' جماعت سازی کا جو طریقہ ہمیں قرآن میں ملتا ہے' رسول اللہ ﷺ کی سُنّت میں نظر آتا ہے' اور اُمتِ مسلمہ کی تیرہ سو سالہ تاریخ میں جس کی مثالیں ملتی ہیں وہ صرف ایک

ہے۔ یہ طریقہ بیعت کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔سوال یہ ہے کہ بیعت سے کیا مراد ہے؟

عربی میں بَاعَ یَبِیعُ کے معنی ہیں بیچنا۔اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ بیچنے کا عمل دو طرفہ ہوتا ہے۔اس لیے کہ اس کی اصل ''تبادلہ'' ہے۔مثلاً آپ روپے دے کر آٹا حاصل کر لیتے ہیں' اور کرنسی کی ایجاد سے پہلے ایک جنس کے تبادلے میں دوسری جنس حاصل کی جاتی تھی۔ یہاں اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ آپ روپے کو قیمت سمجھیں اور آٹے کو جنس یا آٹے کو قیمت قرار دیں اور روپے کو جنس کہہ لیں۔وجہ یہ ہے کہ جہاں بھی بیچنے کا عمل ہو گا وہاں خریدنے کا عمل بھی لامحالہ ہو گا۔

اس تفصیل سے میرا مقصد یہ ہے کہ آپ سورۃ التوبہ کی اس آیت کے اصل مفہوم کو اور اس آیت کی شان اور عظمت کو سمجھ سکیں:

﴿اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَ اَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ فَیَقۡتُلُوۡنَ وَ یُقۡتَلُوۡنَ ۟ وَعۡدًا عَلَیۡہِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰىۃِ وَ الۡاِنۡجِیۡلِ وَ الۡقُرۡاٰنِ ؕ وَ مَنۡ اَوۡفٰی بِعَہۡدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِہٖ ؕ وَ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۱۱۱﴾﴾ (التوبة)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے خرید لی ہیں مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے۔ وہ لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں' پھر قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ وعدہ ہو چکا اللہ کے ذمہ پر سچا تورات اور انجیل اور قرآن میں' اور کون ہے جو اپنے وعدے کا پورا کرنے والا ہو اللہ سے بڑھ کر؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اُس سے کیا ہے' اور یہی ہے بڑی کامیابی۔''

یہ آیت قرآن مجید کی اہم ترین آیات میں سے ایک ہے۔ بدقسمتی سے آج ہماری زندگیوں میں اس آیت کی وہ اہمیت نہیں رہی جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں اس کو حاصل تھی۔ یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ مؤمن اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ایک خرید و فروخت کا معاملہ ہوتا ہے۔اس سودے میں اللہ تعالیٰ خریدار ہے اور مؤمن فروخت کرنے والا ہے۔ایمان لانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو' اپنی صلاحیتوں اور اوقات کو' اپنے وسائل اور اموال کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں کھپا دینے کے لیے آمادہ ہے' اور ان تمام قربانیوں کے عوض اس سے موت کے بعد کی زندگی میں جنت کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ یہ وہ سودا ہے جو مؤمن اور اللہ تعالیٰ کے مابین انجام پاتا ہے۔اس سودے کے نتیجے میں اہل ایمان اللہ کے راستے میں جنگ کرتے ہیں' تا کہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو۔اس جنگ میں وہ اللہ کے

دشمنوں کو بھی قتل کرتے ہیں اور خود بھی قتل ہوتے ہیں۔

یہ سودا جو ایک مؤمن اور اللہ تعالیٰ کے مابین ہوتا ہے نقد کا نہیں بلکہ ادھار کا معاملہ ہے۔ مؤمن سے مطالبہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اسے اللہ کی راہ میں صرف کر دے۔ اور جواباً اسے ملتا کیا ہے؟ محض ایک وعدہ! اللہ کی طرف سے یہ وعدہ کہ اسے اس کی محنت اور قربانی کا صلہ آخرت میں ملے گا۔ ظاہر ہے کہ اس معاملے کو دیکھ کر کوئی بھی شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ اس معاملے میں کافی خطرہ (risk) نظر آتا ہے۔ اگر میں اپنا سب کچھ یہاں اللہ کی راہ میں قربان کر دوں اور موت کے بعد مجھے اس کا صلہ نہ ملے تب تو یہ گھاٹے کا سودا ہوا۔ اس طرح تو میں دنیا میں بھی نقصان میں رہا اور آخرت میں بھی۔

ظاہر ہے کہ ادھار کے سودے میں شکوک وشبہات کا پیدا ہو جانا فطری امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہایت شدّ ومدّ کے ساتھ فرمایا ہے کہ اس وعدے کا پورا کرنا اس نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ لہٰذا کسی کو اس معاملے میں ہرگز متزلزل نہ ہونا چاہیے۔ یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے اور وہ لازماً اسے پورا کرے گا۔ اس نے یہ وعدہ تین مرتبہ کیا ہے' تورات میں' انجیل میں' اور پھر قرآن مجید میں۔ اور اللہ سے زیادہ اپنے قول کا سچا اور وعدے کا پورا کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟ لہٰذا اس سودے پر جو تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہے خوشیاں مناؤ۔ تم سے جو کچھ قربان کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ نہایت حقیر شے ہے' اور جس کا وعدہ کیا جا رہا ہے وہ ابدی راحت ہے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے جو کسی انسان کو حاصل ہو سکتی ہے۔

سورۃ التوبہ کی یہ آیت لفظ اِشْتَرٰی سے شروع ہو کر بَیْعِکُمْ پر ختم ہوتی ہے۔ ان دونوں الفاظ میں کیا فرق ہے؟ اِشْتَـــرٰی کا مطلب ہے خریدنا' اور بیع سے مراد وہ تبادلہ ہے جو دو اشخاص کے مابین ہوتا ہے اور جسے ہم ''خرید وفروخت'' کہتے ہیں۔ عربوں کا عام رواج تھا کہ جب ان کے درمیان خرید وفروخت کا معاملہ ہوتا تو وہ پہلے تو قیمت اور جنس کی خوبیوں یا خامیوں کے متعلق بحث کرتے' اور جب معاملہ طے پا جاتا تو وہ ہاتھ ملا کر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اب کوئی فریق سودے سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ یہ آخری معاہدہ' جس کی علامت کے طور پر ہاتھ ملائے جاتے تھے' مبایعت کہلاتا ہے' اور یہی وہ چیز ہے جو بیعت کی بنیاد بنی۔

قرآن وسنت میں بیعت کا ثبوت

یہاں اہم بات یہ ہے کہ یہ سودا اصل میں تو اللہ تعالیٰ اور مؤمن کے درمیان ہوتا ہے' لیکن چونکہ

اللہ تعالیٰ بذاتہٖ اور براہِ راست یہ سودا نہیں کرتا‘ لہٰذا ہمیں ایک درمیانی فریق کی ضرورت پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤمن کی جان و مال کا خریدار ہے‘ اور مؤمن اس سودے کے لیے تیار ہے‘ لیکن یہ سودا کس طرح انجام پائے گا؟ مؤمن کو کون بتائے گا کہ اسے کب اور کس طرح اپنی جان اور اپنے مال کو پیش کرنا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ مکی زندگی کے بارہ برسوں میں حکم یہ تھا کہ کوئی مزاحمت یا جوابی کارروائی نہیں کرنا ہے۔ پھر مدینہ میں جا کر حکم ملا کہ اب تصادم اور جنگ کا مرحلہ آ گیا ہے۔ لیکن یہ تمام احکام کس نے دیے؟ اس موقع پر تنظیم اور امیر اور سمع و طاعت کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔

یہ سارا معاملہ فی الواقع بہت منطقی اور سادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ خریدار ہے‘ مؤمن اپنے جان و مال کو جنت کے عوض فروخت کر رہا ہے‘ اور ان دونوں کے درمیان رسول اللہ ﷺ تھے۔ اصل خریدار تو اللہ تعالیٰ ہے‘ لیکن اطاعت کا وعدہ حضور ﷺ سے کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں آتا ہے:

﴿اِنَّ الَّـذِیۡـنَ یُـبَایِعُوۡنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰهَ ؕ یَـدُ اللّٰهِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡهِمۡ ۚ فَـمَنۡ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنۡكُثُ عَلٰی نَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ اَوۡفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیۡهُ اللّٰهَ فَسَیُؤۡتِیۡهِ اَجۡرًا عَظِیۡمًا۝۱۰﴾ (الفتح)

’’(اے نبیؐ) جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہوگا‘ اور جو اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ عنقریب اسے بڑا اجر عطا فرمائے گا۔‘‘

معلوم ہوا کہ یہ اصل میں ایک سہ فریقی معاہدہ ہے‘ جان و مال کا سودا تو اللہ تعالیٰ اور مؤمن کے درمیان طے پایا‘ لیکن اطاعت کا وعدہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ سے ہوا۔ مطلب یہ کہ گویا مؤمن رسول اللہ ﷺ سے عرض کرتا ہے کہ میری زندگی اور میرا مال آپؐ کی خدمت میں پیش ہیں‘ جس طرح آپ حکم دیں گے ویسے ہی ان چیزوں کو قربان کر دوں گا۔ اس میں آخری مقصد رضائے الٰہی کا حصول اور اُخروی کامیابی ہے۔

وہ بیعت جو رسول اللہ ﷺ نے مسلمان مَردوں سے لی تھی‘ اس کا ذکر قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے‘ اگرچہ احادیث میں اسے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تاہم وہ بیعت جو حضور ﷺ نے خواتین سے لی تھی‘ اس کا ذکر واضح الفاظ میں قرآن حکیم میں موجود ہے۔

﴿یٰۤـاَیُّـهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الۡمُؤۡمِنٰتُ یُبَایِعۡنَكَ عَلٰۤی اَنۡ لَّا یُشۡرِكۡنَ بِاللّٰهِ شَیۡـًٔا وَّلَا

يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾

(الممتحنة)

''اے نبیؐ! جب تمہارے پاس مؤمن عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کے لیے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی' چوری نہ کریں گی' زنا نہ کریں گی' اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی' اور اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی' اور کسی امر معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی' تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو' یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا رحم کرنے والا ہے''۔

سیرتِ نبویؐ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے بعد جو سب سے اہم بیعت ہوئی ہے وہ ''بیعتِ رضوان'' ہے' جو رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ سے متصلاً قبل صحابہؓ سے لی تھی۔ تاہم ہجرت سے پہلے کی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ دو نہایت اہم مواقع پر بیعت ہوئی ہے۔ یعنی جب یثرب سے آنے والوں نے حضور ﷺ سے قول و قرار کیا۔

منیٰ کا جو مقام مکہ سے قریب ترین ہے وہ وادیٔ عقبہ ہے' جہاں حج کے موقع پر یثرب کے چھ افراد نے رسول اللہ ﷺ سے ملاقات پر اسلام قبول کیا۔ اگلے برس ان میں سے پانچ افراد دوبارہ حج پر آئے اور سات مزید افراد کو ہمراہ لائے۔ اس موقع پر ان بارہ افراد نے حضور ﷺ سے وہ قول و قرار کیا جسے بیعتِ عقبہ اولیٰ کہا جاتا ہے۔ اس بیعت کے الفاظ وہی تھے جو بیعت النساء کے حوالے سے سورۃ الممتحنہ میں وارد ہوئے ہیں۔ اس سے اگلے برس بہتر مرد اور دو خواتین یثرب سے آئے اور انہوں نے حضور ﷺ سے وہ عہد کیا جسے بیعتِ عقبہ ثانیہ کہتے ہیں۔ اس دوسری بیعت کے الفاظ نہایت اہم ہیں' جنہیں ہم ابھی بیان کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے مختلف اوقات میں کئی قسم کے عہد لیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب بھی کسی مضبوط وعدے کی ضرورت پیش آئی تو حضور ﷺ نے ہمیشہ بیعت ہی کا معاملہ فرمایا۔ چنانچہ علم حدیث کے ایک عظیم عالم امام نسائیؒ نے دس مختلف اقسام کی بیعتوں کا ذکر کیا ہے جو حضور ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے لی تھیں: (۱) سمع و طاعت کی بیعت (۲) ہمیشہ سچ بولنے پر بیعت (۳) اس بات پر بیعت کہ حضور ﷺ کو صحابہ میں سے کسی کو بھی ترجیح دینے کا اختیار ہوگا (۴) اس بات کا عہد کہ ہم میدانِ جنگ سے نہ بھاگیں گے (۵) اس بات کا وعدہ کہ ہم جہاد کریں گے (۶) اس بات پر بیعت کہ ہمیشہ عدل پر مبنی بات کہیں گے

(۷) ہر مسلمان کی خیر خواہی کی بیعت (۸) اللہ کے راستے میں جان قربان کرنے پر بیعت (۹) اس بات کا عہد کہ ہم حضور ﷺ کے حکم پر اپنے گھروں کو چھوڑ دیں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وعدہ لینے اور نظم قائم کرنے کا واحد طریقہ جو ہمیں رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور سُنّت سے ملتا ہے وہ بیعت پر مبنی ہے۔ چنانچہ غزوۂ احزاب کے موقع پر جب صحابہ رضی اللہ عنہم خندق کھود رہے تھے تو ان کی زبانوں پر یہ شعر جاری تھا:

نَحْنُ الَّذِينَ بَايَعُوا مُحَمَّدًا عَلَى الْجِهَادِ مَابَقِينَا اَبَدًا [(۱)]

اسلامی تاریخ میں بیعت کا مقام

میں عرض کر چکا ہوں کہ اُمت مسلمہ کی تیرہ سوسالہ تاریخ میں جماعت سازی کے لیے صرف بیعت ہی کی اساس ملتی ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد جو نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوا اس کی بنیاد بیعت ہی تھی۔ پھر جب صحابہؓ نے محسوس کیا کہ خلافت کا ادارہ رفتہ رفتہ ملوکیت میں تبدیل ہو رہا ہے اور انہوں نے اس زوال کو روکنے کے لیے جدوجہد کی تو اس میں بھی بیعت کا طریقہ ہی اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما دونوں کی جدوجہد بیعت کی اساس پر ہوئی۔ اس کے بعد جب ملوکیت نے اپنے پنجے پوری طرح گاڑ لیے تب بھی خلفاء (اصل میں ملوک) اپنی حکومت کو بیعت کی بنیاد پر ہی استوار کرتے رہے۔

اصولی طور تو اسلام میں مذہب وسیاست کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے' لیکن عملاً ہم دیکھتے ہیں کہ عہد ملوکیت میں یہ تقسیم نمایاں ہونے لگی تھی۔ نتیجتاً بیعت کا ادارہ بھی دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ بادشاہ عوام سے سیاسی اطاعت کا وعدہ بیعت کے ذریعے لیتے تھے' لیکن ساتھ ہی اسلامی معاشرے میں افراد کے تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن کے لیے صوفیائے کرامؒ بھی لوگوں سے روحانی اور اخلاقی اطاعت کا وعدہ لینے لگے' اور یہ شے بیعت ارشاد کہلائی۔

بیعتِ ارشاد سے کیا مراد ہے؟ ایک شخص محسوس کرتا ہے کہ اسے کسی بزرگ رہنما کی ضرورت ہے جو اسے ایک بہتر مسلمان بننے میں مدد دے۔ اس مقصد کے تحت وہ کسی ایسے متقی شخص کے ساتھ اپنے

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب التحریض علی القتال۔ وصحیح مسلم' کتاب الجهاد والسیر' باب غزوة الاحزاب۔ (ترجمہ: ''ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد ﷺ سے بیعت کی ہے...... اس بات پر کہ جہاد کو جاری رکھیں گے جب تک زندہ ہیں۔'')

آپ کو وابستہ کرنا چاہتا ہے جو خود اپنے نفس کا تزکیہ کر چکا ہو اور دوسروں کی اس راہ میں رہنمائی کر سکتا ہوں۔ یہ وابستگی بیعت کی صورت میں ہوتی ہے۔ یعنی مرید یا سالک کسی بزرگ سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ آپ مجھ سے علم‘ تجربے اور تقویٰ میں بہت آگے ہیں‘ لہٰذا آپ میری رہنمائی فرمائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے‘ میں اس معاملے میں آپ کی اطاعت کروں گا اور آپ میرے اخلاق اور میری روحانی ترقی کی نگرانی فرمائیں گے۔ یہ وہ شے ہے جسے بیعتِ ارشاد کہا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کے طویل انحطاط اور زوال کے نتیجے میں آج صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ جب بیعت کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو عموماً ایک عام مسلمان کے سامنے بیعتِ ارشاد ہی کا تصور آتا ہے۔ یہ بھی واضح رہنا چاہیے کہ بیعتِ ارشاد کے لیے قرآن مجید میں جواز بیعت النساء کی صورت میں موجود ہے‘ جس کا مقصد بھی یہی تھا جو بیعت ارشاد کا ہوتا ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ گزشتہ صدی میں مسلمانوں کو غیر ملکی استعمار سے نجات دلانے کے لیے جتنی بھی عسکری تحریکیں چلیں‘ ان سب کی بنیاد بیعت ہی تھی۔ چنانچہ ہندوستان میں سید احمد بریلویؒ کی تحریکِ شہیدین‘ لیبیا میں محمد بن علی السنوسی کی سنوسی تحریک‘ اور سوڈان میں محمد احمد المہدی کی تحریک‘ سب میں نظم کی بنیاد بیعت ہی تھی۔ موجودہ صدی میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جب ۱۹۱۳ء اپنی جماعت یعنی حزب اللہ قائم کی‘ تو بیعت ہی کو اس کی اساس کے طور پر اختیار کیا۔ اسی طرح الاخوان المسلمون کے بانی ارکان نے شیخ حسن البناء شہیدؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی‘ جو مرشدِ عام کہلاتے تھے۔ اس موقع پر میں چاہتا ہوں کہ آپ کے سامنے موجودہ صدی کا ایک نہایت اہم واقعہ بیان کروں جو اکثریت کے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے۔ جمعیت علمائے ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس نومبر ۱۹۲۰ء میں منعقد ہوا تھا۔ اس کی صدارت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے کی‘ اور علماء سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ سب مل کر ابوالکلام آزاد کو اپنا متفقہ قائد تسلیم کر لیں‘ ان سے بیعت کریں‘ اور ہندوستان میں آزادی اور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے منظم جدوجہد کا آغاز کیا جائے۔ بدقسمتی سے اس تجویز کو علماء میں پذیرائی حاصل نہ ہوئی۔

موجودہ صدی کی ایک اور تحریک جو بیعت کی بنیاد پر منظم ہوئی تھی وہ قادیانیت کے فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے تھی۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں ۵۰۰ علماء اکٹھے ہوئے‘ جن میں سے اکثریت کا تعلق دیوبندی مکتب فکر سے تھا‘ اور انہوں نے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو ’’امیر شریعت‘‘ مان کر ان سے

بیعت کی۔ اگرچہ مولانا بہت نمایاں مذہبی عالم نہ تھے‘ اس کے باوجود ان سے بیعت کرنے والوں میں مولانا احمد علیؒ لاہوری اور مولانا انور شاہ کاشمیریؒ جیسے جید علماء بھی شامل تھے۔

غرضیکہ اُمت کی تیرہ سو سالہ تاریخ کی گواہی ہمارے سامنے موجود ہے کہ جہاں بھی کسی منظّم جدوجہد کے لیے جماعت سازی کی ضرورت پیش آئی وہاں ہمیشہ بیعت ہی کے طریقے کو اختیار کیا گیا۔ خواہ معاملہ حکومت بنانے کا ہو‘ یا اسلامی اصولوں کو نظامِ حکومت میں دوبارہ رائج کرنے کا ہو‘ تزکیۂ نفوس اور اصلاحِ باطن کا مسئلہ ہو‘ یا مسلمانوں کے علاقوں کو غیر مسلموں سے آزاد کرانے کی جدوجہد ہو‘ ہر بار افراد کو جمع کرنے اور منظّم کرنے کے لیے صرف بیعت کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس میں واحد استثناء مولانا مودودیؒ کی جماعت اسلامی کا ہے جو بیعت کی بنیاد پر قائم نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اُمت کی تاریخ کے ۱۳ سو برسوں کا حوالہ دیا ہے‘ کیونکہ چودھویں صدی میں ایک بڑی تحریک کا دستوری بنیاد کو اختیار کرنے کا معاملہ بھی موجود ہے۔

تنظیم اسلامی میں شمولیت کی بیعت

جہاں تک میرا تعلق ہے‘ تو میں نے تنظیم اسلامی بیعت کی بنیاد پر قائم کی ہے۔ تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لیے جو بیعت ہے اس کے الفاظ ایک مستند حدیث سے لیے گئے ہیں۔ یعنی بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر یثرب سے آنے والوں نے رسول اللہ ﷺ سے جن الفاظ میں بیعت کی‘ انہی الفاظ کو ایک تبدیلی کے ساتھ ہم نے اختیار کیا ہے۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ اس حدیث کے الفاظ میں ایک حزب اللہ قائم کرنے کے لیے پورا منہج اور طریقہ کار موجود ہے‘ یعنی ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت کو قائم کرنے کا پورا نقشہ اس حدیث سے مستنبط کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کوئی جماعت بنا رہے ہیں تاکہ سماجی سطح پر فلاح و بہبود کا کام کیا جا سکے تو کسی بھی قسم کا دستوری ڈھانچہ اختیار کیا جا سکتا ہے‘ لیکن جہاں معاملہ ہو ایک انقلابی جماعت کے قیام کا‘ جسے غیر معمولی نظم اور اندرونی ہم آہنگی درکار ہوتی ہے‘ تو یہ جماعت صرف بیعت کی بنیاد پر قائم ہونی چاہیے۔

پیش نظر حدیث حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے‘ اور امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ دونوں نے اسے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ بیعت کے الفاظ ایسے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے ان کے ذریعے تنازعات کے تمام دروازے بند فرما دیے ہیں۔ عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((بَایَعْنَا رَسُولَ اللّٰہِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ‘ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ‘ وَالْمَنْشَطِ

وَالْمَكْرَهِ، وَعَلٰی اَثَرَةٍ عَلَیْنَا، وَعَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ، وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا، لَا نَخَافُ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ)) (۱)

''ہم نے اللہ کے رسول ﷺ سے بیعت کی کہ ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے' خواہ آسانی ہو یا مشکل' خواہ ہماری طبیعت آمادہ ہو یا ہمیں اس پر جبر کرنا پڑے' اور خواہ دوسروں کو ہمارے اوپر ترجیح دے دی جائے۔ ہم اصحابِ اختیار سے جھگڑیں گے نہیں' لیکن سچ بولیں گے جہاں کہیں بھی ہم ہوں گے' اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے بے پرواہ رہیں گے۔''

غور کیجیے کہ جہاں بھی کوئی اجتماعی جدوجہد ہو رہی ہو اور کسی خاص مسئلے پر فیصلہ کرنا پڑے تو بے شمار آراء سامنے آتی ہیں اور بہت سے مختلف بلکہ متضاد حل پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن قائد کو صرف ایک ہی فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع پر جن ارکان کی رائے کے مطابق فیصلہ ہو جائے وہ اس پر عمل کرنے میں انشراح اور آمادگی محسوس کریں گے' اور جن کی مرضی یا رائے کے خلاف فیصلہ ہو جائے وہ عمل درآمد کے معاملے میں انقباض محسوس کریں گے۔ حضور ﷺ نے تنازعات اور نظم کی خلاف ورزی کے اس امکان کو اس طرح ختم کیا کہ صحابہؓ سے یہ عہد لے لیا کہ وہ ہر حال میں اطاعت کریں گے' خواہ جو حکم انہیں ملا ہو وہ اس سے سو فیصد متفق ہوں یا نہ ہوں' خواہ حکم پر عمل کرنے میں وہ دل کی آمادگی پائیں یا انہیں اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے۔

اسی طرح اصحابِ اختیار کو مقرر کرنے کا معاملہ بھی ایسا ہے جہاں بہت سے اختلافات اُبھر سکتے ہیں۔ اگر کسی باصلاحیت مگر نو وارد رُکن کو کسی اہم عہدے پر فائز کر دیا جائے تو پرانے اراکین میں ناراضگی پیدا ہو سکتی ہے۔ تنازع کے اس دروازے کو بند کرنے کے لیے حضور ﷺ نے صحابہؓ سے یہ عہد لیا کہ مختلف عہدے یا ذمہ داری کے مناصب دینے کے معاملے میں کُل اختیار میرا ہو گا' اور یہ کہ وہ لازماً سمع و طاعت کی روش پر قائم رہیں گے' خواہ وہ یہ محسوس کریں کہ دوسروں کو ان پر ترجیح دی جا رہی ہے۔

یہ بات نہایت اہم ہے کہ ''سمع و طاعت'' کی اصطلاح سے غیر معمولی نظم کا جو نقشہ ذہنوں میں اُبھرتا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک اسلامی انقلابی جماعت کے ارکان بلا سوچے سمجھے اور اپنے ذہن

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاحکام، باب کیف یبایع الامام الناس، وکتاب الفتن، باب قول النبی ﷺ ستـرون بعدی امورًا تنکرونها۔ وصحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب طاعۃ الامیر فی غیر معصیۃ ......

اور عقل وفہم کی صلاحیتوں کو بالائے طاق رکھ کر امیر کی اطاعت کرتے رہیں گے۔ ان کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ جس بات کو حق سمجھتے ہوں اس کا برملا اظہار کریں' اور امراء کے طرزِ عمل یا حکمت عملی میں کوئی غلط شے دیکھیں تو اپنی زبانوں پر تالے ڈال کر نہ بیٹھے رہیں۔ چنانچہ بیعت کے الفاظ میں ہے کہ ''اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا'' (ہم سچ کہیں گے جہاں کہیں بھی ہم ہوں گے)۔ ظاہر ہے کہ بیعت کی بنیاد پر تنظیم بنانے کا مطلب یہ ہے کہ آخری فیصلے کا اختیار ایک فرد کے پاس ہوگا' یعنی تمام بحث وتمحیص اور گفتگو اور مشاورت ہو جانے کے بعد جب فیصلے کا وقت آئے گا تو یہ فیصلہ ووٹوں کی گنتی سے نہیں بلکہ امیر کی مرضی سے ہوگا۔

تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لیے بیعت کے جو الفاظ اختیار کیے گئے ہیں' اس کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں ایک شخص شعوری طور پر یہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ پھر وہ اللہ سے اپنے تمام سابقہ گناہوں کی معافی مانگتا ہے اور مستقبل میں گناہوں سے اجتناب کا پختہ وعدہ کرتا ہے۔ دوسرے حصے میں وہ اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کرتا ہے کہ وہ ہر اُس شے کو چھوڑ دے گا جو اللہ کو ناپسند ہے' اور یہ کہ وہ اس کے راستے میں مقدور بھر جدوجہد کرے گا' اپنے مال سے بھی اور جان سے بھی' تا کہ اس کے دین کو قائم کیا جا سکے۔ تیسرے حصے میں وہ تنظیم اسلامی کے امیر کے ساتھ یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ ان کے تمام احکام کو سنے گا اور ان پر عمل کرے گا' بشرطیکہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہوں۔ یہ آخری شق' یعنی اطاعت ''فی المعروف'' ہوگی نہ کہ مطلق' وہ اضافہ ہے جو ہم نے بیعتِ عقبہ ثانیہ کے الفاظ میں کیا ہے۔

بیعت کی تاکیدی اہمیت

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ مَاتَ وَلَیْسَ فِی عُنُقِہٖ بَیْعَۃٌ مَاتَ مِیْتَۃً جَاھِلِیَّۃً)) (۱)

''جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہ تھا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔''

یعنی ایسا شخص حقیقی معنوں میں ایک مسلمان کی موت نہیں مرا۔ یہ حدیث بالکل واضح ہے' لیکن ہم میں سے اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی لاحق ہے کہ اگر ہم کسی متقی شخص کے ساتھ اپنے آپ کو بیعتِ ارشاد کے ذریعے وابستہ کر لیں تو اس حدیث پر عمل ہو جائے گا۔ یہ خیال بالکل غلط ہے! مذکورہ حدیث میں بیعت

(۱) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب وجوب ملازمۃ جماعۃ المسلمین عند ظھور المسلمین......

سے مراد وہ بیعت ہے جو اُمت کی مجموعی ہیئت سے تعلق رکھتی ہے' اور اس کی صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ کم از کم شرائط پوری کرنے والی اسلامی ریاست یا نظامِ خلافت قائم ہو تو خلیفۃ المسلمین یا امیر المؤمنین کے ہاتھ پر بیعت کی جائے گی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو مسلمانوں پر ایسی ریاست اور ایسا نظام بالفعل قائم کرنے کے لیے کوشش فرض ہو جاتی ہے' اور اس جدّ وجہد کے لیے جو حزب اللہ قائم ہو گی' اس کے امیر سے بیعت کی جائے گی۔

ظاہر ہے کہ نظامِ خلافت آسانی سے قائم ہو جانے والی شے تو نہیں ہے' بلکہ اس کے لیے ہمیں جدوجہد کرنا پڑے گی اور بڑی بڑی قربانیاں دینا پڑیں گی۔ اپنا وقت' صلاحیتیں' اور وسائل کھپانے پڑیں گے۔ دنیا میں کوئی بھی بڑا کام اجتماعی جدوجہد کے بغیر نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اگر اسلامی ریاست قائم نہیں ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اسے قائم کرنے کے لیے کوشش کریں' اور یہ کوشش ایک مضبوط اور منظّم جماعت ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے نہ کہ انفرادی طور پر۔ اور ایک مضبوط اور منظّم جماعت صرف بیعت ہی کے اصول کو اختیار کر کے وجود میں لائی جا سکتی ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک ہی ایسی صورت ہے جس میں ایک مسلمان کو بیعت کے بغیر زندگی گزارنے کی اجازت ہے۔ یعنی فتنے اور فساد کی وہ کیفیت جس میں کسی کو کسی کا ہوش نہ ہو' کسی کو معلوم نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے' ایسے میں کس کا ساتھ دینا چاہیے اور کیا کرنا چاہیے۔ اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ آپ فتنہ وفساد کے عہد میں رہ رہے ہیں' اور اس لیے بیعت سے مستثنیٰ ہیں' تو جان لیجیے کہ ایسی حالت میں آپ کے لیے جائز نہیں کہ کسی مہذب معاشرے میں رہیں' بلکہ ضروری ہے کہ آپ ہر شے کو چھوڑ کر کسی جنگل میں جا بسیں۔ لیکن اگر آپ ایک نارمل زندگی گزار رہے ہیں' شہری زندگی اور ٹیکنالوجی کے تمام فوائد اور سہولتوں سے مستفید ہو رہے ہیں اور پھر بھی آپ کا خیال ہے کہ فتنہ وفساد کی وجہ سے آپ کو بیعت سے استثناء مل گیا ہے تو یہ خیال محض خود فریبی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ہمت دے کہ ہم حق کو اختیار کریں خواہ وہ کسی جگہ سے ملے' اور ہمیں توفیق دے کہ ہم مسلمان جئیں اور مسلمان مریں۔ اور توفیق دے کہ ہم وہ کام کریں جو اسے پسند ہوں۔ آمین OO

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلماتOO

(ا)

عقائد

اور

بنیادی دینی تصوّرات

چند ضمیمے

تنظیم اسلامی کے

متفرق دستاویزات

اس کتاب کے آخر میں چند ضمیمے ملحق کئے جارہے ہیں جن کی تفصیل اس طرح ہے کہ سب سے پہلے اہل سنت والجماعت کے اُن عقائد اور بنیادی تصورات کو پیش کیا گیا ہے جو کہ بانی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے تحریر کردہ ہیں اور اول روز سے تنظیم اسلامی کے اساسی لٹریچر کا لازمی حصہ رہے۔

الحمدللہ، ہم ان مجمع علیہ افکار سے —— جن کی پشت پر چودہ صدیوں کا تواتر وتعامل موجود ہے —— انحراف کو دین میں بگاڑ اور کجی کے مترادف سمجھتے ہیں اور اپنی بساط کے مطابق انہی پر کاربند ہیں۔ بانی محترمؒ کے قلم سے نکلی ہوئی یہ قیمتی تحریر ہر اس طالب حق کے لئے ایک بہترین تحفہ ہے جو یہ جاننا چاہے کہ عقائد اور کلام کے مباحث میں —— جو قدیم و جدید کتبِ اہل سنت میں موجود ہے —— وہ راہِ حق وصواب کیا ہے جو اہل سنت والجماعت نے اختیار کی۔

ایک اشاعت کے موقع پر بانی محترمؒ نے اس تحریر کا پس منظر واضح کرتے ہوئے جو سطور قلمبند فرمائیں انہیں یہاں نقل کیا جا رہا ہے:

''یہ بھی اصلاً راقم ہی کی تحریر پر مشتمل ہے جو جولائی ۷۴ء اور مارچ ۷۵ء کے درمیانی عرصے میں سپرد قلم ہوئیں۔ اس کی ترتیب وتسوید میں راقم نے جماعت اسلامی کے دستور سے بھی استفادہ کیا اور بعض علماء سے بھی مشورہ کیا جن میں مولانا سید وصی مظہر ندویؒ قابل ذکر ہیں......

اس کی پہلی شق ایمان مجمل اور ایمان مفصل پر مشتمل ہے۔ جن کی تشریح میں اہل سنت کے عقائد اختصاراً لیکن جامعیت کے ساتھ آ گئے ہیں۔ واضح رہے جماعت اسلامی کے دستور میں ان کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

دوسری شق کلمۂ طیبہ اور کلمۂ شہادت پر مشتمل جس کی تشریح کے سلسلے میں جماعت اسلامی کے دستور سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ توحیدِ الٰہی اور رسالتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اقرار کے مضمرات ومقدرات کو دستور جماعت میں بلاشبہ نہایت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔ (اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ تحریر اصلاً مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی ہے۔ واللہ اعلم) البتہ ایک جانب اس میں سے وہ الفاظ حذف کر دیئے گئے جن پر علمائے کرام کی جانب سے شدید اعتراضات کئے گئے تھے، اور دوسری جانب عظمت صحابہ رضی اللہ عنہم اور حجیتِ خلافتِ راشدہ سے متعلق شقوں کا اضافہ کیا گیا اس لئے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نبی اکرم ﷺ کی تعلیم، تربیت اور تزکیے کا شاہکار ہونے کے اعتبار سے تعظیم وتوقیر کے بھی مستحق ہیں ---- اور بفحوائے قرآنی ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ '' اور ''فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ'' آنحضور ﷺ کے رفقاء واحباب اور اعوان و انصار ہونے کی بنا پر اس کا استحقاقِ کامل بھی رکھتے ہیں کہ آنحضور ﷺ کے ہر امتی کے دل میں ان کے لئے شدید محبت اور احسان مندی کے جذبات موجود ہوں---- اور

خلافتِ راشدہ چونکہ اصلاً خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی حیثیت رکھتی ہے، لہٰذا اُس کے دوران میں جن امور پر اُمت کا اجماع ہوگیا انہیں دین کے دستوری اور قانونی نظام میں حجت کی حیثیت حاصل ہے ـــــــــ اس طرح عظمتِ صحابہؓ اور حجیتِ خلافتِ راشدہ کو گویا نبی اکرم ﷺ کی رسالتِ مبارکہ کے ساتھ تتمے اور ضمیمے کی حیثیت حاصل ہے!

تیسری اور چوتھی شقیں شرک، کفر اور ذمائمِ اخلاق سے برأت، اور جملہ ذنوب و معاصی سے توبہ واستغفار پر مشتمل ہیں۔ جن کے ضمن میں جہاں کفر اور شرک کی حقیقت اور اُن کی اقسام کی مختصر مگر جامع وضاحت آ گئی ہے، وہاں فرائض و واجباتِ دینی اور محرمات و منہیاتِ شرعی کا اجمالی تذکرہ بھی ہوگیا ہے۔

پانچویں اور چھٹی شق دو معاہدوں پر مشتمل ہیں: پہلا عہد اللہ سے کہ میں نے اپنا رُخ ہر جانب سے یکسو ہو کر صرف تیری جانب کرلیا ہے اور اب میری نماز اور قربانی کی طرح میرا جینا اور مرنا بھی صرف تیرے لئے ہوگا ـــــــــ اور دوسرا عہد تنظیمِ اسلامی سے کہ میں اس کے نظم کی پابندی اور اس کے ایسے جملہ احکام کی اِطاعت جو شریعت کی کسی واضح نص کے خلاف نہ ہوں ''سمع وطاعت'' کی ٹھیٹھ اسلامی روح کے مطابق کروں گا!

ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ تنظیم کے عقائد اور بنیادی نظریات کی متذکرہ بالا چھ شقوں کا تعلق اُن تین اہم دینی اصطلاحات سے ہے جو ''تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت'' کے عنوان سے چند آیاتِ قرآنیہ کے ساتھ ابتداء ہی سے جلی طور پر شائع ہوتی رہی ہیں: یعنی تجدید ایمان، توبہ اور تجدیدِ عہد!۔ چنانچہ پہلی دو شقوں کا تعلق تجدید ایمان سے ہے، درمیانی دو کا توبہ سے اور آخری دو کا تجدید عہد سے!!

اللہ تعالیٰ ہم سب کے قلوب و اذہان کو ایمانِ حقیقی اور یقین و معرفت کے نور سے منور فرمائے، ہمیں جملہ فرائض و واجبات کے التزامِ تام اور منکرات و منہیات سے اجتنابِ کلی کی توفیق عطا فرمائے، اور اپنے جملہ عہُود وعقود کے ایفائے کاملہ کی ہمت عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!''

اس کے بعد تنظیم اسلامی کے کچھ اہم اساسی و تنظیمی دستاویزات پیش کئے گئے ہیں جن کے بغیر یہ کتاب فی الواقع نامکمل محسوس ہوتی۔ تنظیم اسلامی کے موجودہ کام اور انتظامی ڈھانچے کے سمجھنے کے لئے یہ دستاویزات بے حد مفید ہیں---- یعنی تنظیم اسلامی کا منشور، نظام العمل، بیعت فارم کا عکس اور آخر میں اس ذاتی احتسابی رپورٹ بک کا عکس شامل اشاعت کیا گیا ہے جو ہر رفیقِ تنظیم کو ذاتی استعمال کے لئے دی جاتی ہے۔ جس سے وہ اپنے انفرادی واجتماعی امور کی اصلاح وترقی میں مدد لے سکتا ہے۔

ضمیمہ جات کے حوالے سے یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بعض دستاویزات جو انتظامی نوعیت کے ہیں ان میں مرکز تنظیم اسلامی کی جانب سے وقت کے ساتھ ساتھ ترمیم واضافے کا عمل جاری رہتا ہے۔ فی الحال تازہ ترین ایڈیشن شاملِ اشاعت کئے جا رہے ہیں۔ جن میں آئندہ کی اشاعتوں میں حسب ضرورت ترمیم واضافے کا امکان بہر حال موجود رہے گا۔ (مرتب)

عقائد
اور
بنیادی دینی تصورات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تنظیم اسلامی کے بنیادی دینی تصورات ـــــ یعنی عقائد ـــــ اہل سنت والجماعت کے مطابق ہیں، جن کی رُو سے: ہر عاقل و بالغ مسلمان خواہ وہ مرد ہو یا عورت، پر لازم ہے کہ وہ:

(۱) پورے شعور وادراک کے ساتھ اقرار کرے کہ:

”اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ، اِقْرَارٌ م بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ“

یعنی میں یقین رکھتا ہوں اللہ پر جیسا کہ وہ اپنے اسماء وصفات سے ظاہر ہے اور قبول کرتا ہوں اس کے جملہ احکام، اقرار کرتا ہوں زبان سے اور تصدیق کرتا ہوں دل سے! ـــــ اور

”اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ“

یعنی میں یقین رکھتا ہوں اللہ پر، اور اس کے فرشتوں پر، اور اس کی کتاب پر، اور اس کے رسولوں پر، اور یوم آخر پر، اور تقدیر پر کہ اس کی بھلائی اور بُرائی سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد جی اُٹھنے پر۔

تشریح: اسلام کی اساس ایمان پر قائم ہے اور ایمان کی تعبیر کے لئے ایمان مجمل اور ایمان مفصّل کے مندرجہ بالا الفاظ جو سلف سے منقول ہیں، حد درجہ موزوں بھی ہیں اور نہایت جامع و مانع بھی۔ اس لئے کہ ان میں ایمانیات کی تفصیل کے علاوہ دو اہم اور بنیادی نکتے بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایمان زبانی اقرار (جو اُس قانونی ایمان یعنی اسلام کا رکن اولین ہے جس پر تمام دنیوی معاملات کا دارومدار ہے اور جس پر اسلامی ہیئت اجتماعی کی بنیاد قائم ہوتی ہے) اور تصدیق قلبی (جس پر اُس حقیقی

ایمان کا دارومدار ہے جس کی بناء پر آخرت میں کوئی شخص مومن قرار پائے گا) دونوں کا مجموعہ ہے اور دوسرے یہ کہ علمی ونظری اور اصولی اعتبار سے ایمان حقیقتاً ایمان باللہ ہی کا نام ہے۔ بقیہ تمام ایمانیات اسی اصل کی فروع اور اسی اجمال کی تفصیل ہیں۔ چنانچہ ایمان بالآخرت بھی اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حکمت وعدل کا مظہر ہے اور ایمان بالرسالت بھی اس کی صفاتِ ربوبیت وہدایت ہی کی توسیع۔

اللہ وہ زندہ جاوید ہستی ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا ـــــ وہ اَلْاَحَد ہے یعنی ہر اعتبار سے تنہا اور اکیلا، چنانچہ نہ کوئی اس کی ذات میں شریک ہے نہ صفات میں، نہ حقوق میں نہ اختیارات میں، نہ اس کا کوئی ہم جنس ہے نہ ہم کفو، نہ ہم سر ہے نہ ہم پلّہ، نہ ضد ہے نہ ندّ نہ مثل ہے نہ مثال ـــــ وہ الصَّمَد ہے یعنی وہ پورے سلسلہ کون ومکان کا مبدع بھی ہے اور موجد بھی، خالق بھی ہے اور باری بھی، صانع بھی ہے اور مصور بھی اور اسی کی توجہ وعنایت اسے تھامے ہوئے بھی ہے اور قائم کئے ہوئے بھی۔

وہ پاک اور منزہ ومبرا ہے ہر عیب، ہر نقص، ہر کمی، ہر ضعف، ہر احتیاج، ہر غلطی اور ہر کوتاہی سے، گویا وہ سبوح بھی ہے اور القدوس بھی ـــــ اور جامع ہے تمام محاسن وکمالات کا، اور ہر خیر اور خوبی کا بدرجہ تمام وکمال، گویا وہ الغنی بھی ہے اور الحمید بھی، کسی کو کوئی قوت وطاقت حاصل نہیں بجز اس کے اذن واجازت کے، گویا وہی، العلی بھی ہے اور العظیم بھی اور المتعال بھی ہے اور الکبیر، المتکبر بھی۔ ''سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ'' اس کی ذات وراءُ الوراء ثم وراءُ الوراء ہے اور اس کی ماہیت اور کنہ کو کوئی نہیں جان سکتا اور اس کی معرفت کی واحد راہ اس کے اسماء وصفات کے واسطے ہی سے ہے۔ چنانچہ تمام اچھے نام اسی کے ہیں اگرچہ متعین طور پر اس کے اسماءِ حسنیٰ وہی ہیں جو قرآن اور حدیث نبویؐ میں وارد ہوئے ـــــ اسی طرح وہ تمام صفات کمال سے بتمام وکمال متصف ہے جن میں سے اہم ترین آٹھ ہیں یعنی (۱) حیات، (۲) علم، (۳) قدرت، (۴) ارادہ، (۵) سمع، (۶) بصر، (۷) کلام اور (۸) تکوین، چنانچہ وہی الحی بھی ہے اور القیوم بھی اور السمیع بھی ہے اور البصیر بھی ﴿عَلٰی کُلِّ شَیءٍ قَدِیر﴾ بھی ہے اور ﴿بِکُلِّ شَیءٍ عَلِیم﴾ بھی ﴿فَعَالٌ لِّمَا یُرِید﴾ بھی ہے اور ﴿اِنَّمَا اَمْرُهُ اِذَا اَرَادَ شَیئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهُ کُنْ فَیَکُوْن﴾ کی شان کا حامل بھی ـــــ مزید برآں اس کی جملہ صفات اس کی ذات ہی کے مانند مطلق ولامتناہی ہیں نہ کہ محدود ومقید، اور قدیم ہیں نہ کہ حادث اور ذاتی ہیں نہ کہ کسی اور کی عطا کردہ۔

فرشتے وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نور سے تخلیق فرمایا۔ وہ صاحب تشخص وجود کے حامل ہیں نہ کہ مجرد قوائے طبعیہ، ان کا نہ مذکر ہونا معلوم ہے نہ مونث، وہ خدا سے قرب ضرور رکھتے

ہیں لیکن الوہیت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، وہ اللہ کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم انہیں بارگاہِ خداوندی سے ملے، وہ اللہ کے احکام کی تنفیذ بھی کرتے ہیں اور خالق ومخلوق کے مابین پیغام رسانی بھی، چنانچہ وہی انبیاء ورُسل تک وحی لاتے رہے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے لیکن چار بہت مشہور بھی ہیں اور جلیل القدر بھی۔ یعنی حضرت جبرائیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل علیہم السلام۔

اللہ کی کتابوں میں سے بھی چار ہی معلوم ومعروف ہیں، یعنی توراۃ جو حضرت موسیٰؑ کو عطا ہوئی اور زبور جو حضرت داؤدؑ کو عطا ہوئی اور انجیل جو حضرت عیسیٰؑ کو عطا ہوئی اور قرآن جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا، جو اللہ کی آخری کتاب اور نوعِ انسانی کے نام اللہ کا آخری اور مکمل پیغام ہے، جس کے بعد کوئی اور کتاب نازل نہ ہوگی اور جو من وعن محفوظ موجود ہے اور ہمیشہ رہے گا جبکہ باقی تینوں کتابیں ردوبدل اور تغیر و تحریف کا ہدف بن چکی ہیں، گویا اب قرآن ہی اُن کا مصدق بھی ہے اور مھیمن بھی ـــــــ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے پیغمبروں کے صحیفے عطا ہوئے جن میں سے کچھ اب دنیا میں سرے سے موجود ہی نہیں ہیں، باقی محرف اور مبدل ہیں۔

اللہ کے رسول نوعِ انسانی کے وہ برگزیدہ افراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بنی آدم تک اپنا پیغام پہنچانے کے لئے وقتاً فوقتاً چنا اور پسند فرمایا۔ وہ انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے اور سب گناہ سے پاک یعنی معصوم تھے، ان کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے، قرآن مجید میں جن کے نام مذکور ہیں ان کے سوائے کسی اور کو یقین کے ساتھ نبی یا رسول قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ان میں سے پانچ حد درجہ اولوالعزم اور نہایت عالی مرتبہ ہیں یعنی حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ـــــــ ان میں سے بعض کو بعض پر بعض پہلوؤں سے جزوی فضیلت حاصل ہے لیکن جملہ انبیاء ورُسل پر فضیلت کُلی سید ولد آدم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے، جو خاتم النبیین بھی ہیں اور آخرالرسل بھی اور جن کے بعد وحی نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کُلی طور پر بند ہو چکا ہے۔

انبیاء ورُسل کی تائید وتقویت کے لئے اللہ تعالیٰ عام مادی ضوابط کو عارضی طور پر معطل کر کے گویا عادی قانون کو توڑ کر اپنی آیات ظاہر کرتا اور معجزات دکھاتا رہا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بے شمار حسی معجزے عطا ہوئے لیکن آپ کا اہم ترین اور عظیم ترین معجزہ معنوی ہے یعنی قرآن حکیم۔

یوم آخر وہ دن ہے جس میں تمام انسان دوبارہ زندہ ہو کر عدالت خداوندی میں محاسبے اور جزاوسزا کے

فیصلے کیلئے پیش ہوں گے جس کے نتیجے میں یا جنت میں یا جہنم میں داخلہ ہوگا ـــــ اس دن اقتدار مطلق اور اختیار کلی صرف اللہ واحد وقہار کے ہاتھ میں ہوگا نہ کسی کو کسی جانب سے کوئی مدد مل سکے گی، نہ کوئی کچھ دے دلا کر چھوٹ سکے گا، نہ کوئی سفارش ہی خدا کی پکڑ سے بچا سکے گی۔ انبیاء ورُسل ،صلحاء واتقیاء، ملائکہ وارواح اور سب سے بڑھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مراتب عالیہ کے اظہار واعلان اور ان کے اعزاز واکرام کے لئے شفاعت کی اجازت دی جائے گی اور گناہ گار اہل ایمان کے حق میں ان کی شفاعت قبول بھی ہوگی لیکن نہ وہ خدا کی مرضی اور منشاء کے خلاف کچھ کہیں گے اور نہ ہی خدا کی صفت عدل باطل ہوگی۔

تقدیر کے خیر وشر کا من جانب اللہ ہونا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اور مخلوقات میں سے کسی کے بس میں نہیں کہ بغیر اس کی اجازت محض اپنے ارادے سے کچھ کر سکے۔ لہٰذا یہاں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے خواہ وہ کسی کو بھلا لگے یا بُرا، اللہ کے اذن ہی سے ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو خدا کا عاجز ولاچار ہونا لازم آتا ہے۔ مزید برآں، وہ ''عَالِمُ مَاکَانَ وَمَایَکُوْنُ'' بھی ہے۔ چنانچہ اس پورے سلسلہ کون ومکان میں جو کچھ ماضی میں ہوا، یا حال میں ہو رہا ہے یا مستقبل میں ہوگا سب اس کے علم قدیم میں پہلے سے موجود ہے، اگرچہ اس کا یہ علم جبرِ محض کو مستلزم نہیں ـــــ گویا، ایمان بالقدر، دراصل اللہ تعالیٰ کی دو صفات یعنی قدرت اور علم کے مضمرات اور مقدرات ہی کو ماننے کا نام ہے۔

بعث بعد الموت سے مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوگا نفخۂ اُولیٰ ہوگا جس کے نتیجے میں کائنات کا پورا موجودہ نظام درہم برہم ہو جائے گا اور سب پر ایک عمومی موت طاری ہو جائے گی۔ پھر جب اللہ کا اذن ہوگا نفخۂ ثانیہ ہوگا اور سب جی اُٹھیں گے اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر تا قیامِ قیامت پیدا ہونے والے آخری انسان تک سب میدان حشر میں جمع کئے جائیں گے!

(ب) کلمہ طیبہ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' کے جملہ مضمرات ومقدرات کے فہم وشعور کے ساتھ گواہی دے کہ:

''اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ''

یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوائے کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔

تشریح: اس شہادت کے جزو اوّل کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان اور جو کچھ آسمان وزمین میں ہے سب کا خالق، پروردگار، مالک اور تکوینی وتشریعی حاکم صرف اللہ ہے، ان میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ گویا ''اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ'' اور ''لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ''۔

اس حقیقت کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ:

۱۔ انسان اللہ کے سوا کسی کو ولی و کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا، فریاد رس اور حامی و ناصر نہ سمجھے، کیونکہ کسی دوسرے کے پاس کوئی اقتدار ہے ہی نہیں۔

۲۔ اللہ کے سوا کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے والا نہ سمجھے، کسی سے تقویٰ اور خوف نہ کرے، کسی پر توکل نہ کرے، کسی سے اُمیدیں وابستہ نہ کرے، کیونکہ تمام اختیارات کا مالک تنہا وہی ہے۔

۳۔ اللہ کے سوا کسی سے دُعا نہ مانگے، کسی کی پناہ نہ ڈھونڈے، کسی کو مدد کے لئے نہ پکارے۔ کسی کو خدائی انتظامات میں ایسا دخیل اور زورآور بھی نہ سمجھے کہ اس کی سفارش قضائے الٰہی کو ٹال سکتی ہو، کیونکہ خدا کی سلطنت میں سب بے اختیار رعیت ہیں، خواہ فرشتے ہوں یا انبیاء یا اولیاء۔

۴۔ اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے، کسی کی پرستش نہ کرے، کسی کو نذر نہ دے اور کسی کے ساتھ وہ معاملہ نہ کرے جو مشرکین اپنے معبودوں کے ساتھ کرتے رہے ہیں، کیونکہ تنہا ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔

۵۔ اللہ کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک الملک اور مقتدرِ اعلیٰ تسلیم نہ کرے، کسی کو باختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز نہ سمجھے، کسی کو مستقل، بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے اور اُن تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے جو ایک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت اور اُس کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں، کیونکہ اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو مالکیت اور حاکمیت کا حق نہیں پہنچتا۔ نیز اس عقیدے کو قبول کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ:

۶۔ انسان اپنی آزادی و خودمختاری سے دست بردار ہو جائے، اپنی خواہش نفس کی بندگی چھوڑ دے اور اللہ کا بندہ بن کر رہے جس کو اس نے الٰہ تسلیم کیا ہے۔

۷۔ اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک مختار نہ سمجھے، بلکہ ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان، اپنے اعضاء اور اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو بھی اللہ کی مِلک اور اس کی طرف سے امانت سمجھے۔

۸۔ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ سمجھے اور اپنی قوتوں کے استعمال اور اپنے برتاؤ اور تصرفات میں ہمیشہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھے کہ اُسے قیامت کے روز اللہ کو ان سب چیزوں کا حساب دینا ہے۔

۹۔ اپنی پسند کا معیار اللہ کی پسند کو اور اپنی ناپسندیدگی کا معیار اللہ کی ناپسندیدگی کو بنائے۔

۱۰۔ اللہ کی رضا اور اس کے قرب کو اپنی تمام سعی و جہد کا مقصود اور اپنی پوری زندگی کا محور ٹھہرائے۔ گویا اللہ تعالیٰ ہی اس کا محبوب حقیقی اور مطلوب و مقصودِ اصلی بن جائے۔

۱۱۔ اپنے لئے اخلاق میں، برتاؤ میں، معاشرت اور تمدن میں، معیشت اور سیاست میں، غرض زندگی کے

ہر معاملے میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت تسلیم کرے اور ہر اُس طریقے اور ضابطے کو رد کر دے جو اللہ کی شریعت کے خلاف ہو۔

اس شہادت کے جزو ثانی سے واضح ہوتا ہے کہ سید وُلدِ آدم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپؐ اللہ کے بندے ہیں اور دوسرے یہ کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ پہلی حیثیت کے اعتبار سے آپ عبدیت کاملہ کے مقام پر فائز ہیں اور آپؐ کی اس حیثیت کے علم اور اعتراف سے شرک کی ان جملہ اقسام کا کامل سدّ باب ہو جاتا ہے جن میں سابقہ امّتیں اپنے اپنے انبیاء ورُسل کے فرطِ احترام، شدّتِ عقیدت اور غلو محبت کے باعث ملوث ہوگئیں اور دوسری حیثیت کے اعتبار سے آپ ﷺ کے فرقِ مبارک پر ختم نبوت اور ختمِ رسالت کا تاج بھی ہے اور آپ کے دستِ مبارک میں شہنشاہِ ارض وسماء کی جانب سے اِتمام نعمتِ شریعت اور تکمیل دینِ حق کا فرمانِ شاہی بھی۔ گویا سلطانِ کائنات کی طرف سے رُوئے زمین پر بسنے والے انسانوں کو جس آخری نبی ﷺ کے ذریعہ سے مستند ہدایت نامہ اور ضابطہ قانون بھیجا گیا اور جس کو اس ضابطہ کے مطابق کام کر کے ایک مکمل نمونہ قائم کر دینے پر مامور کر دیا گیا، وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اس امر واقعی کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ انسان کو جملہ مخلوقات میں شدید ترین محبت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہو اور آپؐ کی اطاعت اور اتباع ہی زندگی کا اصل طریق بن جائے گویا:

۱۔ انسان ہر اُس تعلیم اور ہر اُس ہدایت کو بے چون و چرا قبول کرے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔

۲۔ اس کو کسی حکم کی تعمیل پر آمادہ کرنے کے لئے اور کسی طریقہ کی پیروی سے روک دینے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہو کہ اس چیز کا حکم یا اس چیز کی ممانعت رُسولِؐ خدا سے ثابت ہے۔

۳۔ رسولِ خدا کے سوا کسی کی مستقل بالذات پیشوائی و رہنمائی تسلیم نہ کرے۔ دوسرے انسانوں کی پیروی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے تحت ہو، نہ کہ ان سے آزاد۔

۴۔ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں خدا کی کتاب اور اُس کے رسولؐ کی سُنّت کو حجت اور سند اور مرجع قرار دے، جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ کتاب وسنت کے مطابق ہو اسے اختیار کرے، جو اس کے خلاف ہو اسے ترک کر دے، اور جو مسئلہ بھی حل طلب ہو اسے حل کرنے کے لئے اُسی سرچشمہ ہدایت کی طرف رجوع کرے۔

۵۔ تمام عصبیتیں اپنے دل سے نکال دے خواہ وہ شخصی ہوں یا خاندانی یا قبائلی ونسلی، یا قومی ووطنی، یا فرقی و

گروہی، کسی کی محبت یا عقیدت میں ایسا گرفتار نہ ہو کہ رسول ﷺ خدا کے لائے ہوئے حق کی محبت و عقیدت پر وہ غالب آ جائے یا اس کی مدِّ مقابل بن جائے۔

۶۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والے کسی شخص کو نہ تو کسی بھی معنی میں نبی یا رسول سمجھے نہ معصوم اور نہ ہی کسی کا یہ منصب اور مرتبہ سمجھے کہ اس کے ماننے پر انسان کا مومن و مسلم سمجھا جانا منحصر ہو۔

نیز اسی کے متضمّنات کی حیثیت سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ:

۷۔ یہ تسلیم کیا جائے کہ آپؐ نے جو نظام قائم فرمایا، اور جو خلافتِ راشدہ کے دوران بتمام و کمال قائم رہا، وہی دینِ حق اور نظامِ اسلامی کی صحیح ترین اور واحد مسلّمہ تعبیر ہے۔ گویا خلافتِ راشدہ فی الواقع ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' تھی اور خلفائے اربعہ یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ اور علی حیدر رضی اللہ تعالیٰ عنہم و ارضاھم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ''خلفائے راشدین و مہدیین'' ہیں جن کی سنت آنحضورؐ کے بعد دین میں حجت کا درجہ رکھتی ہے۔

۸۔ یہ یقین رکھا جائے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جنہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپؐ کی تعلیم اور تزکیہ وتربیت سے براہِ راست فیض یاب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی من حیث الجماعت پوری اُمت میں افضلیت مطلقہ کے حامل ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی غیر صحابی کسی صحابی سے افضل نہیں ہوسکتا۔ ان کی محبت جزوِ ایمان ہے، ان کی تعظیم وتوقیر دراصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر ہے اور ان سے بغض وعداوت اور ان کی تحقیر وتوہین درحقیقت آنحضورؐ سے بغض وعداوت اور آپؐ کی تحقیر وتوہین ہے —— ان کے مابین جزوی فضیلت کے بہت سے پہلو ہوسکتے ہیں لیکن فضیلت کلّی متعین طور پر اس طرح ہے کہ تمام صحابہؓ میں ایک اضافی درجۂ فضیلت حاصل ہے حضراتِ اصحاب بیعت رضوان کو، پھر ان پر ایک مزید درجہ فضیلت حاصل ہے حضرات اصحاب بدر کو، پھر ان پر ایک اور درجہ فضیلت کے حامل ہیں حضرات عشرۂ مبشرہ اور ان میں فضیلت مطلقہ حاصل ہے، حضراتِ خلفاء اربعہ کو جن کی افضلیت علیٰ ترتیب الخلافت ہے یعنی افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق ہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ، پھر درجہ ہے حضرت عمر فاروقؓ کا، پھر مقام ہے حضرت عثمان غنیؓ کا اور پھر مرتبہ ہے حضرت علی حیدرؓ کا!

مزید برآں صحابہ کرامؓ کُل کے کُل ''عدول'' ہیں اور ان کے مابین اختلاف ونزاع نفسانیت کی بناء پر نہیں بلکہ خطائے اجتہادی کی بنا پر ہوا۔ چنانچہ مشاجراتِ صحابہؓ کے باب میں محتاط ترین روش تو یہ ہے کہ ''کفِ لِسان'' سے کام لیا جائے اور کامل سکوت اختیار کیا جائے تاہم کوئی حقیقی اور واقعی ضرورت ہی لاحق ہوجائے تو ایک کو ''مصیب''، یعنی صحیح مؤقف پر اور دوسرے کو ''مخطی''، یعنی راہِ خطائے اجتہادی پر تو قرار دیا

جا سکتا ہے لیکن کسی کو بھی سبّ وشتم یا الزام واتہام کا ہدف بنانا جائز نہیں ہے!

(ج) ہر قسم کے کفر اور جملہ انواع واقسام شرک اور تمام رذائل و ذمائم اخلاق سے شعوری طور پر اعلانِ براءت کرے، بایں الفاظ کہ:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیٓ اَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اُشْرِكَ بِكَ شَيْئًا وَّ اَنَا اَعْلَمُ بِهٖ وَاَسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا اَعْلَمُ بِهٖ تُبْتُ عَنْهُ وَتَبَرَّاْتُ مِنَ الْكُفْرِ وَالشِّرْكِ وَالْكِذْبِ وَالْغِيْبَةِ وَالْبِدْعَةِ وَالنَّمِيْمَةِ وَالْفَوَاحِشِ وَالْبُهْتَانِ وَالْمَعَاصِیْ كُلِّهَا

یعنی ''اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ تیرے ساتھ کسی کو جانتے بوجھتے شریک کروں اور تجھ سے مغفرت کا طلب گار رہوں اگر کبھی بے سمجھے بوجھے ایسا ہو جائے اور میں اعلان براءت کرتا ہوں ہر نوع کے کفر سے، شرک سے، جھوٹ سے، غیبت سے، بدعت سے، چغلخوری سے، بے حیائی کے کاموں سے، بہتان طرازی سے اور جملہ نافرمانیوں سے۔''

تشریح: ایمان کی طرح کفر کی بھی دو قسمیں ہیں ایک کفر حقیقی یا کفر قلبی اور دوسرے کفرِ قانونی یا کفرِ ظاہری ــــــ کفرِ حقیقی یا کفر قلبی کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری وناشکری اور اس تعالیٰ کی ہر معصیت اور ہر نافرمانی پر ہو جاتا ہے لیکن جہاں تک اُس کفر قانونی یا کفر شرعی کا تعلق ہے جس کی بناء پر کسی کی تکفیر کر کے اس کا رشتہ ملتِ اسلامی سے منقطع کر دیا جائے تو وہ ضروریات دین میں سے کسی کے انکار ہی سے لازم آتا ہے، مجرد بے عملی یا، نافرمانی حتیٰ کہ کبائر کے ارتکاب سے بھی لازم نہیں آتا۔

اسی طرح شرک کی بھی بے شمار اقسام ہیں بعض شرک اعتقادی ہیں اور بعض صرف عملی، بعض جلی ہیں اور بعض خفی، تاہم جملہ انواع واقسام شرک کا ایک احصاء اور احاطہ اس طرح ممکن ہے کہ ایک شرک فی الذّات ہے یعنی یہ کہ کسی کو کسی اعتبار سے خدا کا ہم جنس، یا ہم کفو بنا دیا جائے جس کا کامل رد ہے سورہ اخلاص میں۔ دوسرے شرک فی الصفات ہے یعنی کسی کو کسی صفت کے اعتبار سے خدا کا مثل یا مثیل بنا دیا جائے جس کا نہایت مکمل سدباب ہے آیت الکرسی میں، اور تیسرے شرک فی الحقوق ہے جس کی جامع ترین تعبیر شرک فی العبادت ہے جس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کوئی خدا سے بڑھ کر یا اُس جتنا محبوب و مطلوب ہو جائے اور یہ بھی کہ کسی کو علی الاطلاق مطاع مان لیا جائے یعنی اس کی اطاعت خدا کی اطاعت سے آزاد تسلیم کر لی جائے، اور یہ بھی کہ عام مادی قانون اور ظاہری قواعد وضوابط کے دائرے سے باہر کسی سے استعانت اور استمداد واستغاثہ کیا جائے یا اس سے دُعا کی جائے اور اسے پکارا جائے (عام مادی قوانین کے تحت بھی اگر کسی کے بارے میں یہ خیال ہو کہ محض اپنی قوت اور ارادے سے کسی کو نفع یا ضرر پہنچا سکتا ہے تو یہ شرک فی الصفات کی ایک قسم یعنی شرک فی القدرت اور شرک فی التصرف ہوگا)

مزید برآں شرک کی اسی نوع کے ذیل میں آتے ہیں ریا اور سمعہ بھی اور کسی کے لئے کسی بھی نیت سے ان مراسم عبودیت کو بجالانا بھی جو صرف اللہ کے لئے خاص ہیں جیسے سجدہ اور نذر!

رذائل و ذمائم اخلاق کی مکمل فہرست دینا ممکن نہیں تاہم اگر انسان ان سے اجتناب کرے جو اُوپر بیان ہوئے تو دوسروں کا سدباب خود بخود ہو جائے گا۔

(د) سابقہ زندگی کے تمام گناہوں پر نہایت الحاح وزاری سے بارگاہِ خداوندی میں مغفرت کا طلبگار رہو اور آئندہ کے لئے کامل خلوص و اخلاص کے ساتھ توبہ کرے ان الفاظ کے ساتھ کہ:

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّی مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ اَذْنَبْتُـهُ عَمَدًا اَوْ خَطَأً سِرًّا اَوْ عَلَانِيَةً وَّ اَتُوْبُ اِلَيْهِ مِنَ الـذَّنْبِ الَّـذِیْ اَعْـلَـمُ وَمِـنَ الـذَّ نْبِ الَّذِیْ لَا اَعْلَمُ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ وَسَتَّارُ الْعُيُوْبِ وَغَفَّارُ الذُّنُوْبِ

''یعنی میں اللہ سے معافی کا خواستگار ہوں تمام گناہوں پر خواہ میں نے جان بوجھ کر کیے ہوں یا غیر ارادی طور پر، اور خواہ چھپ چھپا کر کیے ہوں خواہ علانیہ طور پر، اور خواہ وہ میرے علم میں ہوں خواہ میرے علم میں نہ ہوں۔ اے اللہ تو ہی تمام غیبوں کا جاننے والا اور تمام عیبوں کی پردہ پوشی کرنے والا اور تمام گناہوں کی بخشش فرمانے والا ہے!''

تشریح: توبہ صرف زبان سے کلماتِ توبہ کے ادا کر دینے یا ان کے ورد یا وظیفہ بنا لینے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ گناہ پر حقیقی ندامت اور واقعی پشیمانی اور معصیت سے کلی اجتناب کے عزمِ مصمّم کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں رجوع کرنے اور گناہ و معصیت کو بالفعل ترک کر دینے کا نام ہے یہ تین شرائط ان کوتاہیوں کے ضمن میں کافی ہیں جو حقوق اللہ کے باب میں ہوں، حقوق العباد سے تعلق رکھنے والے معاصی کے لئے ایک چوتھی اضافی شرط یہ ہے کہ جس کسی پر زیادتی ہوئی ہو اس کی تلافی کی جائے یا اس سے معافی حاصل کی جائے۔

بنابریں توبہ کی صحت کے لئے لازم ہے کہ جو شخص تنظیمِ اسلامی میں شمولیت کا خواہاں ہو وہ:

۱۔ جملہ فرائض دینی کی پابندی اختیار کرے اور تمام کبائر سے فی الفور مجتنب ہو جائے۔ بالخصوص ارکان اسلام کی پوری پابندی کرے۔ چنانچہ نماز قائم کرے (مردوں کے لئے التزام جماعت بھی ضروری ہے) رمضان المبارک کے روزے رکھے، صاحبِ نصاب ہو تو باقاعدہ حساب کے ساتھ پوری زکوۃ ادا کرے اور صاحبِ استطاعت ہو اور تا حال حج بیت اللہ نہ کیا ہو تو فوراً نیت کرے اور جلد از جلد فریضہ حج ادا کرے۔

۲۔ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا زیادہ سے زیادہ اتباع کرے اور ایسی تمام بدعات اور رسومات کو ترک

کر دے جن کا ثبوت قرونِ مشہود لہا بالخیر میں نہ ملتا ہو۔

تشریح: ان بدعات و رسومات کا زیادہ زور شادی بیاہ، پیدائش، عقیقہ، ختنہ، سالگرہ، فوتیدگی اور تہواروں کے مواقع پر ہوتا ہے۔ ان سب میں لازم ہوگا کہ اپنے معاملات کو زیادہ سے زیادہ قرونِ اولیٰ کے مطابق بنایا جائے اور بعد کے اضافوں کو ترک کر دیا جائے۔

۳۔ اپنی معاشرت میں جملہ اسلامی احکام کی پابندی کرے خصوصاً ستر اور حجاب کے شرعی احکام پر عمل پیرا ہو۔

۴۔ اگر کوئی ایسا ذریعہ معاش رکھتا ہو جو معصیت فاحشہ کے ذیل میں آتا ہو جیسے چوری، ڈاکہ، سود، زنا، شراب، رقص و سرور، شہادتِ زور، رشوت، خیانت، جوا اور سٹہ وغیرہ تو اسے ترک کر دے۔

تشریح: اس بات کا تو بظاہر احوال کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ وہ لوگ تنظیم اسلامی میں شمولیت کے خواہاں ہوں جن کی معاش چوری یا ڈاکہ، شراب کی تیاری یا اس کی فروخت وغیرہ، عصمت فروشی یا رقص و سرور ایسے قبیح کاموں سے متعلق ہوں تاہم اگر اللہ تعالیٰ ایسے کسی کاروبار سے متعلق کسی فرد کو اصلاح کی توفیق دے تو یہ بھی اس کی رحمت سے بعید نہیں۔ بہرصورت ان تمام کاموں کی حرمت اور قباحت و شناعت ہمارے معاشرے میں معلوم و معروف ہے ـــــ البتہ بعض حرام چیزیں کچھ اس طرح ہمارے معاشرے میں جاری و ساری ہوگئی ہیں کہ عام لوگ یا تو ان کی قباحت سے ہی آگاہ نہیں رہے یا انہوں نے کسی مجبوری کے عذر کی بنیاد پر اُن کو اپنے لئے مباح کر لیا ہے۔ ان میں سے مکروہ ترین چیز ہے سُود، جس سے باز نہ آنے پر قرآن حکیم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اعلان جنگ کی وعید سناتا ہے اور دوسرے نمبر پر ہے رشوت اور سرکاری حیثیت اور اختیار کا ناجائز استعمال اور ان پر مستزاد ہیں بیع و شرا کی بعض ناجائز صورتیں اور سرکاری محاصل (انکم ٹیکس ڈیوٹی وغیرہ) سے بچنے کے لئے اخفاء و کذب بیانی۔

ہمیں خوب اندازہ ہے کہ اس وقت جو خدا ناشناس اور عاقبت ناآشنا نظام پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے اور پورا انسانی معاشرہ بحیثیت مجموعی جس فسادِ اخلاقی میں مبتلا ہے اس کے پیش نظر ان تمام چیزوں سے کامل اجتناب نہایت مشکل اور صبر آزما کام ہے لیکن تنظیم اسلامی جن مقاصد کے لئے قائم کی جارہی ہے اس کے پیش نظر لازم ہے کہ اس سے عملی وابستگی کے لئے وہی لوگ آگے بڑھیں جو رخصتوں اور حیلوں پر عمل کرنے کے بجائے عزیمت اور صبر و توکل کو اپنا شعار بنائیں اور ہر اس ذریعہ معاش کو ترک کرنے کی کوشش کریں جس میں حرام کی آمیزش ہو۔ اس معاملے میں سردست حسب ذیل تصریحات پر اکتفا کی جاتی ہے۔

(i) سود لینا اور دینا قطعاً حرام ہیں لہٰذا بنکوں یا دیگر اداروں سے نہ کبھی کوئی رقم کسی بھی غرض کے لئے سود پر قرض لینا جائز ہے نہ سیونگ اکاؤنٹ یا فکسڈ ڈیپازٹ یا نقد رقم پر معینہ منافع کی کسی بھی

دوسری صورت میں سرمایہ لگانا درست ہے۔ چنانچہ بنکوں سے صرف عام سروسز جیسے ترسیل زر یا لاکرز سے انتفاع یا زیادہ سے زیادہ کرنٹ اکاؤنٹ رکھنے کی سہولت حاصل کی جاسکتی ہے۔

(ii) کسی ایسے کاروباری ادارے کی ملازمت جائز نہیں ہے جس میں سود کو غالب عنصر کی حیثیت حاصل ہو جیسے بنک اور انشورنش کمپنیاں۔

(iii) رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہیں۔ البتہ کسی ایسی صورت میں کہ کسی ظالم اہل کار یا صاحب اختیار کو اپنا جائز حق وصول کرنے کے لئے کچھ مجبوراً دینا پڑے تو اس کا شمار استحصال بالجبر میں ہوگا۔ رشوت میں نہیں۔ البتہ یہ صرف اُسی صورت میں ہوگا کہ نہ کوئی ناجائز انتفاع مطلوب ہو، نہ کسی سرکاری قانون اور پابندی سے بچنا مقصود ہو اور نہ ہی کسی اور کے جائز حقوق پر زد پڑتی ہو۔

(iv) سرکاری محاصل کے ضمن میں جتنی رعائتیں مروجہ قانون کے اندر اندر ممکن ہوں ان سے بڑھ کر کسی ایسی صورت کو اختیار کرنا درست نہیں ہے جس میں کذب، فریب اور شہادت زور شامل ہوں۔

(v) کاروبار کی مختلف صورتوں میں سے بھی جن جن میں بیع فاسد یا جوئے یا سٹے یا احتکار وغیرہ کا عنصر شامل ہو اس سے بچنا لازم ہے۔

(vi) اگر اس کے قبضے میں ایسا مال یا جائیداد ہو جو حرام طریقے سے آیا ہو یا جس میں حق داروں کے تلف کردہ حقوق شامل ہوں تو اس سے دستبردار ہو جائے اور اہل حقوق کو ان کے حق پہنچا دے۔ البتہ یہ عمل صرف اس صورت میں کرنا لازم ہے جب کہ حق دار بھی معلوم ہوں اور وہ مال بھی معلوم و متعین ہو جس میں ان کا حق تلف ہوا ہے۔ بصورت دیگر توبہ اور آئندہ کے لئے طرز عمل کی اصلاح کافی ہوگی۔

(۵) گہرے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اعلان کرے کہ وہ ہر طرف سے یکسو ہو کر صرف اللہ کا ہو کر رہے گا، رضائے الٰہی ہی اس کا اصل مقصود و مطلوب ہوگی اور نجات و فلاحِ اُخروی کا حصول ہی اس کا اصل نصبُ العین ہوگا ــــــ اور جس طرح اس کی نماز اور قربانی صرف اللہ کے لئے ہوگی اسی طرح اس کے جسم وجان، مال ومنال حتیٰ کہ زندگی اور موت سب اللہ ہی کے لئے ہوں گے۔ یعنی:

اِنِّی وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ O

ــــ اور ــــ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ O لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ O

تشریح: ہر ذی شعور مسلمان کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اللہ کی محبت سے سرشار ہو کر اپنی پوری زندگی اس کی کامل اطاعت میں دے دے (جو لازماً اطاعتِ رسولؐ ہی کے واسطے سے ہوگی!) اسی رویے کا نام عبادتِ

رب ہے جو ہر انسان سے اللہ کا پہلا مطالبہ ہے اور جس کی طرف نوعِ انسانی کو دعوت دینے کے لئے تمام انبیاء ورسل مبعوث ہوئے اور جو از روئے قرآن جنوں اور انسانوں کا عین مقصدِ تخلیق ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس پر لازم ہے کہ اپنی صحت وقوت، فرصت وفراغت، صلاحیت واستعداد، مال ودولت، اور وسائل و ذرائع کا زیادہ سے زیادہ حصہ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل، دعوت الی اللہ اور تبلیغ دین، نصرتِ دین خدا اور رسولؐ اور حمایت واقامتِ دین، اور شہادتِ حق علی الناس اور اظہارِ دینِ حق علی الدین کلّہٖ کے لئے وقف کر دے اور اس کے لئے محنت ومشقت، انفاق و ایثار، ترک واختیار، ابتلا وآزمائش، صبر ومصابرت، استقامت ومقاومت ـــــ الغرض ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کے جملہ مراحل کے لئے مقدور بھر ہمت وعزیمت کی راہ اختیار کرے۔ یہ تمام فرائض ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت واستعداد اور مطابقِ وسعت وقوت عائد ہوتے ہیں اور ان کی انجام دہی میں ہی بندے کی وفاداری کا اصل امتحان ہے!

(۵) خدا کو حاضر وناظر جانتے ہوئے اور ”**اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا**“ کے پیشِ نظر پورے احساسِ مسؤلیت کے ساتھ عہد کرے کہ اپنے فرائضِ دینی کی انجام دہی کے لئے وہ نبی اکرم ﷺ کے فرمان مبارک کہ ”**اَنَا اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ**“ کے مطابق تنظیم اسلامی کے نظم کی پوری پابندی کرے گا۔

تشریح: یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ تنظیم اسلامی نہ عام معنی میں دنیوی یا سیاسی جماعت ہے نہ محدود مفہوم میں مذہبی تنظیم بلکہ یہ ایک ہمہ گیر 'دینی جماعت' ہے لہٰذا اگرچہ یہ خیال کرنا تو غلطی ہی نہیں عظیم گمراہی ہوگی کہ یہ اُس ''الجماعت'' کے حکم میں ہے جس میں شمولیت اسلام میں داخلے اور جس سے علیحدگی کفر کے مترادف ہے اور جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ”**مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ**“، یعنی جو اس سے علیحدہ ہوگا وہ علیحدہ ہی جہنم میں جھونک دیا جائے گا ـــــ تاہم اس کے نظم کو عام معاشرتی وثقافتی انجمنوں یا طبقاتی وپیشہ ورانہ تنظیموں یا سیاسی وقومی جماعتوں کے قواعد وضوابط کی پابندی پر بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کی ''اطاعت فی المعروف'' ـــــ ''سمع وطاعت'' کے خالص اسلامی اور ٹھیٹھ دینی اُصول کے مطابق تمام شرکائے تنظیم پر واجب ہے۔

☆☆☆

(ب)

منشور

منشور

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ○

﴿وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمدؐ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق (اسلام) کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اس کو کُل کے کُل دین (یا تمام ادیان پر)﴾

(توبہ:۳۳۔الصّف:۹۔الفتح:۲۸)

تنظیم اسلامی کا تعارف اور اس کا انقلابی منشور

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں دین حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر نظامِ خلافت کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

☆ — ☆ — ☆

اسلامی انقلاب یعنی قیام نظام خلافت

کے لئے تنظیم اسلامی کے پیش نظر

طریق کار

یہ ہے کہ............جولوگ

اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح

کے حصول کیلئے سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار ہوں، وہ

سب سے پہلے خود پوری طرح مسلمان اور حقیقی معنی میں اللہ تعالیٰ کے بندے بنیں اور اپنی ذات اور اپنے دائرہ اختیار میں شریعت اسلامی نافذ کریں اور اس کے لئے اپنے نفس کے خلاف بھی جہاد کریں اور بگڑے ہوئے ماحول سے بھی مردانہ وار کشمکش کریں اور دوسروں کو بھی مقدور بھر اس کی دعوت دیں۔

باہم دینی اخوت اور ایمانی رشتوں میں بندھ کر آپس میں نہایت رحیم وشفیق جب کہ دین کے باغیوں اور مخالفوں کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔

کسی ایسے شخص کے ہاتھ پر ہجرت و جہاد اور سمع وطاعت فی المعروف کی بیعت کر کے ایک جماعتی نظام میں منسلک ہو جائیں جس کی رائے کی پختگی اور خلوص واخلاص پر انہیں پورا اعتماد ہو۔

اور اس طرح جو اجتماعی قوت وجود میں آئے وہ

ابتدائی مراحل کے طور پر:

- جب تک یہ قوت مناسب مقدار میں تن من دھن کے ساتھ جمع نہ ہو جائے۔
- اسی دعوت وتربیت اور تنظیم کی توسیع اور مضبوطی کی کوشش میں لگے رہیں اور سب سے زیادہ توجہ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی اصلاح اور تزکیہ پر مرکوز رکھیں۔
- اس دوران میں تحریر وتقریر کے ذریعے بھلائی کی دعوت دیتے رہیں اور برے کاموں سے روکتے رہیں لیکن نہ ملکی انتخابات میں حصہ لیں اور نہ ہی کسی سیاسی ہنگامے میں فریق بنیں۔
- اس پورے عرصے میں کسی نکتہ چینی اور تمسخر سے بددل نہ ہوں، نہ کسی جبر وتشدد سے خوف کھائیں بلکہ کامل صبر وتحمل سے کام لیں اور ہرگز کوئی جوابی کارروائی نہ کریں۔
- اور جب مناسب قوت فراہم ہو جائے تو راست اقدام کے طور پر:
- اسلام نے جن برائیوں کی نشاندہی کی ہے ان کا قلع قمع کرنے کے لئے کمر کس لیں۔
- اس کے لئے جلسوں، جلوسوں، مظاہروں اور ناکہ بندیوں کی شکل میں اپنی طاقت کے مظاہرے کے لئے تمام جدید ذرائع استعمال کریں، اس شرط کے ساتھ کہ یہ سب کچھ پُر امن ہو اور اس میں ان کی جانب سے کوئی تشدد نہ ہو۔
- اور اگر ان پر تشدد کیا جائے تو کمال صبر واستقلال کا مظاہرہ کریں حتیٰ کہ اس راہ میں جان دے دینے کو سب سے بڑی کامیابی سمجھیں۔

اس پیہم کشمکش اور جہاد فی سبیل اللہ میں

یا حق کا بول بالا ہو جائے یا شہادت کی موت نصیب ہو جائے۔

تنظیم اسلامی کے امیر

حافظ عاکف سعید

ہیں جن کے ہاتھ پر تنظیم اسلامی کے رفقاء نے ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ اور سمع وطاعت فی المعروف کی بیعت کی ہے۔

ہجرت نبی اکرم ﷺ کے فرمان کی رو سے ہجرت کا آغاز ترک معاصی سے ہو جاتا ہے، البتہ دل میں نیت رکھنی لازم ہے کہ اگر غلبہ دین حق کی جدوجہد میں ضروری ہوا تو اہل وعیال، گھر بار اور ملک و وطن سے بھی ہجرت اختیار کرلوں گا۔

جہاد اسی طرح آنحضور ﷺ کے فرمان کے مطابق اصل جہاد تو اپنے نفس سے کرنا ہوتا ہے، تاہم دین کی دعوت وتبلیغ اور غلبہ واقامت کی جدوجہد میں جان اور مال کھپانے کی جملہ صورتیں جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہیں۔ البتہ دل میں یہ آرزو رکھنی ضروری ہے کہ کبھی خالص اللہ کے دین کے لئے قتال کی نوبت آئے تو اس میں حصہ لوں اور اللہ کی راہ میں گردن کٹا کر شہادت کا رتبہ حاصل کرلوں۔

سمع وطاعت سے مراد ہے حکم سننا اور اس پر بے چون وچرا عمل کرنا۔ یہ معاملہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے تو غیر مشروط ہے لیکن آپ ﷺ کے بعد کسی بھی انسان کے لئے ''فی المعروف'' کی پابندی کے ساتھ مشروط ہے۔ یعنی یہ کہ اس کا حکم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کسی واضح اور صریح حکم کے خلاف نہ ہو، البتہ اس سے باہمی مشاورت کی نفی نہیں ہوتی جو نہایت ضروری اور لازمی ہے۔

بیعت ایک معاہدہ ہے جس کی بہت سی قسمیں نبی اکرم ﷺ اور سلف صالحین سے منقول و ماثور ہیں۔ اس بیعتِ جہاد سے بیعتِ ارشاد وسلوک کی نفی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ دونوں بیعتیں جدا جدا بھی ہوسکتی ہیں اور یکجا بھی۔

سماجی سطح پر

- چونکہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اس لئے نسل، رنگ، زبان، پیشے اور جنس کی بنیاد پر نہ کوئی اونچا ہوگا نہ نیچا، بلکہ عزت اور شرافت کا معیار صرف تقویٰ اور پرہیزگاری ہوں گے۔
- پردے کے شرعی احکام نافذ کر کے خواتین کی عزت اور وقار کی پوری حفاظت کی جائے گی۔ اسلام کے خاندانی نظام اور غیر مخلوط تصور معاشرت کے تحت خواتین کو حقوق و معاشی کفالت کی پوری ضمانت حاصل ہوگی تاکہ وہ پوری یکسوئی کے ساتھ آئندہ نسل کی بہترین تربیت کر سکیں۔
- خواتین کو ملکیت اور وراثت کے اسلامی حقوق حاصل ہوں گے۔ انہیں غیر مخلوط ماحول میں تعلیم، صحت اور گھریلو صنعتوں کے میدان میں اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانے کی پوری آزادی ہوگی۔
- شریعتِ اسلامی کے ہمہ پہلو نفاذ سے بدامنی کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا اور رشوت، غبن، قتل، چوری اور ڈاکے کے ساتھ ساتھ زنا اور تہمتِ زنا کی بھی جڑ کٹ جائے گی۔
- سماجی برائیوں جیسے فضول خرچی، نمود و نمائش کے لئے بے تحاشا دولت ضائع کرنے اور شادی بیاہ کی ہندوانہ رسموں کا خاتمہ ہو جائے گا۔
- مفت اور جلد از جلد انصاف مہیا ہوگا اور جھوٹی گواہی کا خاتمہ ہو جائے گا۔
- سب کے لئے ایک ہی جیسا نظام تعلیم ہوگا۔ اس میں قدیم و جدید اور دینی و دنیوی تعلیم کا بہترین امتزاج ہوگا۔ تعلیم میٹرک تک مفت ہوگی۔

معاشی سطح پر

- ریاست ہر شہری کی بنیادی ضروریات یعنی غذا، لباس، رہائش، تعلیم اور علاج کی ضامن ہوگی۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے مسلمانوں سے زکوٰۃ اور عشر اور غیر مسلموں سے جزیئے کی وصولی کا نظام

نافذ ہوگا۔

- مخلوق خدا کی خدمت کرنے، اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور ضرورت مند افراد کو بغیر سود قرضہ دینے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔
- سود کی لعنت کا مکمل طور پر خاتمہ ہو جائے گا۔ جوئے، سٹے، لاٹری، دوطرفہ آڑھت اور خرید و فروخت کی تمام حرام صورتوں کو ختم کر کے سرمایہ داری کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔
- شریعت اسلامی کی حدود کے اندر اندر انفرادی ملکیت اور آزاد معاشی جدوجہد کی فضا برقرار رہے گی۔ اس مثبت مسابقت کی فضا سے صنعت و تجارت کو ترقی ہوگی اور پیداوار میں اضافہ ہوگا۔
- مزدور اور کارخانہ دار کے درمیان اسلامی بھائی چارے اور عدل و انصاف کے علاوہ باہمی سوداکاری میں مزدور کو ریاست کی جانب سے کفالت کی ضمانت حاصل ہوگی۔
- جاگیرداری کی لعنت کا مکمل خاتمہ ہوگا جس سے زمینداری کی ساری بُرائیاں ختم ہو جائیں گی۔ اس سلسلے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ اور امام مالک رحمۃ اللہ کے متفقہ فتوے سے بھی مدد لی جاسکتی ہے جس کی رو سے مزارعت کی اکثر قسمیں حرام ہیں یا حضرت عمرؓ کے اس اہم فیصلے کو بھی بنیاد بنایا جاسکتا ہے جو عراق کی مفتوحہ زمینوں کے ضمن میں انہوں نے اختیار کیا، جس کی رُو سے اس علاقے کی اراضی انفرادی ملکیت نہیں بلکہ اسلامی ریاست یعنی بیت المال کی ملکیت قرار پائیں۔

سیاسی سطح پر

- حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہوگی، چنانچہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جاسکے گا۔ اعلیٰ عدالتوں کو پورا اختیار ہوگا کہ اس قانون کو منسوخ کر دیں جو قرآن وسنت کے خلاف ہو۔
- ریاست کے کامل شہری صرف مسلمان ہوں گے چنانچہ کلیدی عہدوں پر صرف مسلمان فائز ہوسکیں گے۔ اور ان کے حقوقِ شہریت بالکل مساوی ہوں گے (تاہم ذمہ داریوں کے لئے اضافی شرائط ملحوظ

رکھی جائیں گی) اور وہ اسلام کے اصول مشاورت کے مطابق باہمی مشورے سے ملک کے نظام کو چلائیں گے۔

- تمام شہری قانون کی نظر میں برابر ہوں گے اور کوئی شخص حتیٰ کہ خلیفہ یا امیر یا صدر یا وزیر اعظم بھی قانون سے بالاتر نہ ہوگا۔
- ریاست کے غیر مسلم شہریوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کا پورا ذمہ لیا جائے گا اور انہیں کامل معاشی اور مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ چنانچہ وہ اپنی عبادت گاہوں میں اپنے مذہب کے مطابق رسومات کی ادائیگی اور اپنی آئندہ نسلوں کی تعلیم وتربیت کے حقدار ہوں گے، البتہ انہیں مسلمانوں میں تبلیغ کا حق حاصل نہیں ہوگا۔
- واحدانی یا فیڈرل یا کنفیڈرل نظام ریاست ......اور اسی طرح اماراتی یا صدارتی یا پارلیمانی طرز حکومت میں سے کسے اختیار کیا جائے، اس کا فیصلہ عوام کی کھلی رضامندی پر منحصر ہوگا۔ اس لئے کہ ان میں سے کوئی بھی دینی اعتبار سے نہ لازمی ہے، نہ حرام یا ناجائز۔
- علاقائی یا نسلی وقبائلی روایات میں سے جو شریعت اسلامی سے متصادم نہ ہوں انہیں پورا تحفظ حاصل ہو گا۔ اسی طرح علاقائی زبانوں کے حقوق کی حفاظت ہوگی البتہ سب سے زیادہ زور عربی زبان کی تعلیم وترویج پر دیا جائے گا۔

اس طرح پاکستان، شورائیت کے اصولوں پر مبنی دور حاضر کی جدید اسلامی فلاح ریاست کا نمونہ بن سکے گا اور ”ثم تكون خلافة على منهاج النبوة“ کا مصداق بن سکے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس عظیم مقصد کے لئے تن من دھن لگانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

(ج)

دستور

دستور

دفعہ 1 : مقصد،نصب العین اور تنظیمی اساس

1.1 تنظیم اسلامی نہ معروف معنی میں سیاسی جماعت ہے، نہ مذہبی فرقہ، بلکہ ایک اصولی، اسلامی، انقلابی جماعت ہے جو پہلے پاکستان اور بالآخر کل روئے زمین پر اللہ کے دین کے غلبے، یعنی اسلام کے نظام عدل اجتماعی کے قیام، یا بالفاظ دیگر ''اسلامی انقلاب'' اور اس کے نتیجے میں ''**نظام خلافت علیٰ منہاج النبوۃ**'' کے قیام کے لئے کوشاں ہے۔

1.2 انفرادی سطح پر اس کے جملہ شرکاء کا اصل نصب العین صرف رضائے الٰہی اور نجات اُخروی کا حصول ہے۔

1.3 اس کے اساسی نظریات اور بنیادی دینی تصورات ایک علیحدہ کتابچے میں تفصیل کے ساتھ قرارداد تاسیس مع توضیحات، بنیادی عقائد مع تشریحات اور فرائض دینی کے جامع تصور کے خلاصے کے ذریعے بیان ہوگئے ہیں جنہیں تنظیم کے اساسی فکر اور رہنما اصولوں کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کتابچے کا نام ''تعارف تنظیم اسلامی'' ہے۔ مزید برآں طریقہ کار کے حوالے سے کتاب ''منہج انقلاب نبویؐ'' کو بھی تنظیم کے اساسی فکر کی حیثیت حاصل ہے۔

1.4

1.4.1 تنظیم اسلامی کی تنظیمی اساس شخصی بیعت پر قائم ہے۔ حافظ عاکف سعید ولد ڈاکٹر اسرار احمدؒ کو تنظیم اسلامی کے تاحیات امیر کی حیثیت حاصل ہے اور تنظیم میں شمولیت ان کے ساتھ ذاتی طور پر بیعت جہاد کا تعلق استوار کر کے ہی ہوسکتی ہے۔

1.4.2 اسی طرح اگر کوئی شخص پہلے سے کسی شیخ طریقت سے بیعت ارشاد میں منسلک ہو لیکن

وہ تنظیم اسلامی میں بھی شمولیت کا خواہاں ہو تو اسے اچھی طرح سمجھ لینا ہوگا کہ تنظیم کی ''بیعت جہاد'' بیعت ارشاد پر فائق رہے گی۔ مزید براں، چونکہ تنظیم کے نزدیک اصل محمدیؐ سلوک واحسان بھی وہی ہے جس پر تنظیم عمل پیرا ہے (اور جس کی وضاحت ''مروجہ تصوف یا سلوک محمدیؐ یعنی احسان اسلام؟'' نامی کتابچے میں کر دی گئی ہے۔) لہٰذا کسی بھی ایسے رفیق/ رفیقہ تنظیم کو جو پہلے سے کسی بیعت ارشاد میں منسلک نہ ہو نئے سرے سے اس نوع کا تعلق قائم کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

1.4.3 تنظیم اسلامی کی سربراہی اور راہنمائی اصلاً امیر تنظیم کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ فیصلہ کا اختیار بھی ان کو حاصل ہوگا لہٰذا امیر تنظیم حسبِ موقع وضرورت دستور/ نظام العمل کی کسی دفعہ یا تمام دفعات کو کلی یا جزوی طور پر ساقط یا ان میں کمی بیشی کر سکیں گے۔

دفعہ 2: امیر تنظیم کی نیابت اور خلافت

2.1 امیر تنظیم کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں اپنا جانشین مقرر کر دیں۔ جو امیر تنظیم کی ازخود دستبرداری (کسی مجبوری یا معذوری کی بنا پر) کی صورت میں یا وفات کے بعد امیر تنظیم ہوں گے۔ بصورت دیگر ان کی وفات پر نئے امیر تنظیم کا انتخاب مرکزی مجلس مشاورت ۷ دن کے اندر اتفاق رائے یا اختلاف کی صورت میں کثرت رائے سے کرے گی۔ آراء کے مساوی ہونے کی صورت میں ناظم اعلیٰ (یا بصورت تقرری نائب امیر) کو اضافی ووٹ کا حق حاصل ہوگا۔ نئے امیر کے تقرر تک ناظم اعلیٰ (یا بصورت تقرری نائب امیر) قائم مقام امیر ہوں گے، لیکن مذکورہ بالا تمام صورتوں میں صرف وہی لوگ تنظیم میں شامل سمجھے جائیں گے جو نئے امیر سے بیعت کر لیں۔

2.2 امیر تنظیم اگر ضرورت محسوس کریں تو تنظیم میں نائب امیر کا تقرر کیا جائے گا۔ اس کو امیر تنظیم کے نمائندہ کی حیثیت حاصل ہوگی۔ تقرر ہونے کی صورت میں نائب امیر اصولی طور پر امیر تنظیم اور پوری تنظیم کے مابین اور عملی اعتبار سے امیر تنظیم اور ناظمین مرکزی شعبہ جات کے مابین ربط (Link) کا فرض سرانجام دے گا۔

2.3 تنظیم اسلامی کے مرکزی ذمہ داران میں لازمی اور بنیادی تو تین ہی ہیں یعنی (i) ناظم اعلیٰ (ii) معتمد عمومی اور (iii) ناظم مرکزی بیت المال، تاہم ان میں سے بھی اہم ترین ذمہ داری ناظم اعلیٰ کی ہے۔

اہل اور با صلاحیت سینئر رفقاء کی دستیابی (Availability) کے مطابق مرکز میں مزید شعبے بھی شروع کیے جا سکتے ہیں جیسے شعبہ تربیت، شعبہ دعوت اور شعبہ نشر و اشاعت وغیرہ، بصورت دیگر ان کے سلسلے کے جملہ فرائض بھی ناظم اعلیٰ ہی کو ادا کرنے ہوں گے۔ البتہ نائب امیر کے تقرر کی صورت میں یہ حیثیت نائب امیر کو حاصل ہوگی اور تمام ناظمین مرکزی شعبہ جات بشمول ناظم اعلیٰ ان کو جواب دہ ہوں گے۔ ان تمام ذمہ داران کو جدید اصطلاح میں ''مرکزی مجلس عاملہ'' کہا جائے گا۔

2.4 تنظیم کے مرکزی حسابات کی جانچ پڑتال کیلئے ایک محاسب کا تقرر تنظیم کی مجلس مشاورت کرے گی اور وہ اپنی رپورٹ مرکزی مجلس مشاورت کو پیش کرے گا۔

2.5 تنظیم کے جملہ ماتحت امراء/ ناظمات (جیسے حلقہ جات اور مقامی تنظیموں کے امراء/ ناظمات وغیرہ) کی حیثیت بھی اصولی طور پر امیر تنظیم کے نائبین ہی کی ہوگی اور ان کا نصب و عزل بالکلیہ ان ہی کی صوابدید پر ہوگا۔ اگرچہ وہ اس کے لئے متعلقہ رفقاء/ رفیقات سے حسبِ منشا مشورہ کر سکیں گے۔

دفعہ 3: شمولیت

3.1 روئے ارضی کے کسی بھی مقام پر قیام پذیر ہر بالغ مسلمان (خواہ مرد ہو خواہ عورت) تنظیم میں شامل ہوسکتا ہے بشرطیکہ وہ:

3.1.1 تنظیم کے اساسی نظریات اور تصورات سے فی الجملہ متفق ہو، اور

3.1.2 امیر تنظیم سے بیعت مسنونہ کے رشتے میں منسلک ہو جائے۔

3.2 تنظیم میں شمولیت کے لئے بیعت کے الفاظ:

3.2.1 مردوں کے لئے

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم	اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے
اَشۡهَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ	میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں
وَحۡدَهٗ لَا شَرِيۡكَ لَهٗ	وہ تنہا ہے اُس کا کوئی ساجھی نہیں
وَاَشۡهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ	اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں
اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰهَ رَبِّيۡ مِنۡ كُلِّ ذَنۡبٍ	میں اللہ تعالیٰ سے اپنے تمام گناہوں کی معافی کا خواستگار ہوں
وَّاَتُوۡبُ اِلَيۡهِ تَوۡبَةً نَّصُوۡحًا	اور خلوصِ دل کے ساتھ اُس کی جناب میں توبہ کرتا ہوں

اِنِّیۡ اُعَا هِدُاللّٰهَ	میں اللہ تعالیٰ سے عہد کرتا ہوں کہ:
عَلٰی اَنۡ اَهۡجُرَ کُلَّ مَایَـــکۡرَهُــهُ	اُن تمام چیزوں کو ترک کردوں گا جو اُسے ناپسند ہیں
وَاُجَاهِدَ فِیۡ سَبِیۡلِهٖ جُهۡدَ اِسۡتِطَاعَتِیۡ	اور اُس کی راہ میں مقدور بھر جہاد کروں گا
وَاُنۡفِقَ مَالِیۡ وَابۡـذُلَ نَفۡسِیۡ	اور اپنا مال بھی صَرف کروں گا اور جان بھی کھپاؤں گا
لِاِ قَامَةِ دِیۡنِهٖ وَاِعۡلَاءِ کَلِمَتِهٖ	اُس کے دین کی اقامت اور اُس کے کلمہ کی سر بلندی کیلئے

وَ لِاَجۡلِ ذٰلِكَ اُبَـــایِعُ حافظ عَاكِف سَعِید ، امیر التنظیم الاسلامی

اور اِس مقصد کی خاطر میں امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید سے بیعت کرتا ہوں

اَسۡتَعِیۡنُ اللّٰهَ رَبِّیۡ وَأَسۡتَقۡدِرُ هٗ عَلَی الۡاِسۡتِقَامَةِ عَلَی الدِّیۡنِ وَاِیۡفَاءِ

هٰذَا الۡعَهۡدِ

میں اللہ سے مدد اور توفیق کا طلبگار ہوں کہ وہ مجھے دین پر استقامت اور اس عہد کے پورا کرنے کی ہمت عطا فرمائے

3.2.2 خواتین کے لئے

خواتین کے لئے بیعت کے الفاظ بعینہٖ وہی ہوں گے جو قرآن حکیم میں سورۂ ممتحنہ میں وارد ہوئے ہیں۔ (اور حدیث نبویؐ میں بھی بیعت عقبہ اولیٰ کے ضمن میں مذکور ہیں!)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے
اَشۡهَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ	میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں
وَحۡدَهٗ لَا شَرِیۡكَ لَــــهٗ	وہ تنہا ہے اُس کا کوئی ساجھی نہیں
وَاَشۡهَدُاَنَّ مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُـــهٗ	اور میں گواہی دیتی ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں
اَسۡتَغۡفِرُاللّٰهَ رَبِّیۡ مِنۡ کُلِّ ذَنۡبٍ	میں اللہ تعالیٰ سے اپنے تمام گناہوں کی معافی کی خواستگار ہوں
وَّاَتُوۡبُ اِلَـیۡهِ تَوۡبَةً نَّصُوۡحًا	اور خلوصِ دل کے ساتھ اُس کی جناب میں توبہ کرتی ہوں
اِنِّیۡ اُعَا هِدُاللّٰهَ	میں اللہ تعالیٰ سے عہد کرتی ہوں کہ:

عَلٰی اَنْ اَهْجُرَ كُلَّ مَايَكْرَهُهٗ	اُن تمام چیزوں کو ترک کردوں گی جو اُسے ناپسند ہیں
وَاُجَاهِدَ فِیْ سَبِیْلِهٖ جُهْدَ اِسْتِطَاعَتِیْ	اوراُس کی راہ میں مقدور بھر جہاد کروں گی
وَاُنْفِقَ مَالِیْ وَاَبْذُلَ نَفْسِیْ	اوراپنامال بھی صرف کروں گی اور جان بھی کھپاؤں گی
لِاِ قَامَةِ دِیْنِهٖ وَاِعْلَاءِ کَلِمَتِهٖ	اُس کے دین کی اقامت اوراُس کے کلمہ کی سربلندی کیلئے

وَ لِاَجْلِ ذٰلِكَ اُبَايِعُ حافظ عَاكِف سَعِيد ، امير التنظيم الاسلامی

اور اِس مقصد کی خاطر میں امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید سے بیعت کرتی ہوں

اَسْتَعِيْنُ اللّٰهَ رَبِّیْ وَأَسْتَقْدِرُهٗ عَلَى الْاِسْتِقَامَةِ عَلَى الدِّيْنِ وَاِيْفَاءِ هٰذَا العَهْدِ

میں اللہ سے مدد اور توفیق کا طلبگار رہوں کہ وہ مجھے دین پر استقامت اور اس عہد کے پورا کرنے کی ہمت عطا فرمائے

علٰی اَن لَّا اُشْرِكَ بِاللّٰهِ شَيْئًا	کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤں گی
–وَلَا اَسْرِقَ	کبھی چوری نہیں کروں گی
–وَلَا اَزْنِیَ	کبھی بے حیائی کا ارتکاب نہیں کروں گی
–وَلَا اَقْتُلَ اَوْلَادِیْ	کبھی بچوں کو قتل نہ کروں گی
–وَلَا اٰتِیَ بِبُهْتَانٍ	کبھی بہتان طرازی نہ کروں گی
–وَلَا اَعْصِيَهٗ فِیْ مَعْرُوْفٍ	اور کسی بھی بھلے کام میں اُنکے حکم سے سرتابی نہ کروں گی

اَسْئَلُ اللّٰهَ رَبِّی الْاِسْتِقَامَةَ عَلٰی هٰذَاالعَهْدِ

میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے اس عہد پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے!

3.3 تنظیم میں شامل مرد ’’رفیق‘‘ اور خواتین ’’رفیقہ‘‘ کہلائیں گی۔

دفعہ 4: رفقاء/رفیقات تنظیم کے مطلوبہ اوصاف

تنظیم اسلامی کی اساسی دعوت تین بنیادی دینی اصطلاحات پر مبنی ہے، یعنی (i) تجدید ایمان (ii) توبہ اور (iii) تجدید عہد......یہی وجہ ہے کہ تنظیم میں شمولیت جس عہد نامے کے ذریعے ہوتی ہے اس میں بھی ان ہی تین امور کا ذکر ہے۔ یعنی (۱) کلمہ شہادت کی ادائیگی جو گویا تجدید ایمان کے مترادف ہے۔ (۲) توبہ اور

استغفار، اور (۳) اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کہ (i) ہر اس چیز کو ترک کر دوں گا/ گی جو اسے پسند نہیں اور (ii) اس کی راہ میں یعنی اقامت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی جدوجہد میں امکان بھر اپنا مال بھی صرف کروں گا/ گی اور جان یعنی بدنی قوتیں اور صلاحیتیں بھی کھپاؤں گا/ گی۔

بنابریں تنظیم کے ہر رفیق/ رفیقہ کو جن امور کا خصوصی اہتمام کرنا چاہئے وہ تفصیلاً ان کے متعلقہ نظام العمل میں درج کر دیئے گئے ہیں۔

دفعہ 5: رفقاء/ رفیقات کی درجہ بندی

5.1 تنظیم اسلامی کے عہد نامہ رفاقت پر دستخط کرنے اور تنظیم کی طرف سے قبولیت کے تحریری فیصلے کے بعد ہی کوئی تنظیم کا رفیق/ رفیقہ متصور ہوگا/ ہوگی اور اسے فوری طور پر کسی اُسرہ یا مقامی تنظیم یا حلقہ سے منسلک کر دیا جائے گا۔ رفقاء/ رفیقات کے لئے تنظیمی درجہ بندی کے قواعد علیحدہ علیحدہ نظام العمل میں درج ہیں۔

دفعہ 6: مشاورت

نظام بیعت کے مطابق تنظیم اسلامی کی سربراہی اور رہنمائی اصلاً امیر تنظیم کی ذمہ داری ہے۔ تاہم قرآن حکیم کی ہدایات: (i) وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (الشوریٰ:۳۸) اور وہ آپس میں اپنے معاملات پر مشاورت کرتے ہیں اور (ii) وَشَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ (آل عمران:۱۵۹) اور معاملات میں ان سے مشاورت کیجئے! کی رُو سے مشورہ امیر تنظیم کی دینی اور تنظیمی ''ضرورت'' ہے۔ جس کو پورا کرنے کیلئے تنظیم میں مناسب مواقعوں کا اہتمام کیا جائے گا۔ لیکن ''بیعت'' کے دینی و منطقی تقاضے کے طور پر یہ واضح رہنا چاہئے کہ ہر معاملے میں امیر تنظیم ہی کا فیصلہ آخری اور حتمی ہوگا اور رفقاء تنظیم اسے ''منشط'' اور ''مکرہ'' دونوں صورتوں میں تسلیم کرنے کے پابند ہوں گے۔ اِلاّ یہ کہ کوئی ایسی صورت درپیش ہو جس پر درج ذیل احادیث نبوی ﷺ کے الفاظ کا انطباق ہوتا ہو۔

(i) اِلَّآ اَنۡ تَرَوۡا كُفۡرًا بَوَاحًا عِنۡدَكُمۡ مِنَ اللّٰهِ فِيۡهِ بُرۡهَانٌ

''(تم امیر کی اطاعت اُس وقت تک کرتے رہو) جب تک کہ تم کھلا کفر نہ دیکھو جس کے بارے میں اللہ کی طرف سے تمہارے پاس واضح دلیل موجود ہو۔'' (صحیح مسلم)

یا/ اور (ii) فَاِذَا اُمِرَ بِمَعۡصِيَةٍ فَلاَ سَمۡعَ وَلاَ طَاعَةَ

''پس جب حکم دیا جائے اللہ کی معصیت کا، تو نہیں ہے سمع وطاعت۔'' (متفق علیہ)
نظام مشاورت کی تفصیلات رفقاء/رفیقات تنظیم کے لئے علیحدہ علیحدہ نظام العمل میں درج ہیں۔

دفعہ 7: صدقات وانفاق

7.1 تنظیم اپنے جملہ دعوتی وتنظیمی اخراجات کے لئے انحصار اپنے رفقاء/رفیقات ہی کے جذبہ انفاق پر کرے گی اور عام چندے کی اپیل نہیں کرے گی۔

7.2 رفقاء/رفیقات تنظیم اپنے صدقات واجبہ یعنی زکوٰۃ وعشر میں سے اگر ان کے قریبی رشتہ داروں اور پڑوسیوں میں مستحقین موجود ہوں تو ان کو پہنچانے کے بعد جو باقی بچے اسے تنظیم کے بیت المال میں جمع کرانے کا اہتمام کریں گے/گی۔

7.3 ہر رفیق/رفیقہ اپنے آپ کو پابند سمجھے گا/گی کہ کچھ نہ کچھ صدقات نافلہ بھی آیہ بر (سورۂ بقرہ: ۱۷۷) کے مطابق ہر ماہ ضرور کرے لیکن یہ ایک راز رہے گا اس کے اور اللہ تعالیٰ کے مابین۔

دفعہ 8: اختلاف کے حقوق اور آداب

8.1 جملہ رفقاء/رفیقات تنظیم پوری طرح آزاد ہوں گے/گی کہ اہل سنت کے جس فقہی مذہب یا مسلک پر چاہیں عمل کریں۔ لیکن اس ضمن میں مناظرانہ بحث وتمحیص سے کلی اجتناب ضروری ہوگا۔ اگرچہ خالص علمی انداز میں اور افہام وتفہیم کے جذبے کے تحت تبادلہ خیالات پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔

8.2 اسی طرح تنظیم کے طے شدہ اساسی فکر سے جو کہ دستور کی دفعہ 1 میں درج ہے، اختلاف کی گنجائش نہیں ہے البتہ تنظیم اپنے مقصد کے حصول کے لئے جو عملی تدابیر اختیار کرے یا ملکی حالات ومسائل کے بارے میں جو آراء امیر تنظیم ظاہر کریں ان سے اختلاف کا حق بھی رفقاء/رفیقات تنظیم کو پوری طرح حاصل ہوگا اور مناسب احتیاط (دیکھئے شق 8.3) کے ساتھ اس کے اظہار میں کوئی قباحت نہ ہوگی، تاکہ نہ تنظیم میں گھٹن محسوس ہو، نہ ذہنوں پر تالے پڑیں، بلکہ آزادی فکر اور اظہار رائے کا صحت مند ماحول برقرار رہے اور اس طرح اختلاف رائے تنظیم میں رحمت اور اس کے مقاصد کے لئے مفید ثابت ہو۔ اختلاف رائے اور اس کے اظہار کے ''صحت مند'' ہونے کی علامت یہ ہوگی کہ متعلقہ رفیق/رفیقہ کے طرزِ عمل میں نظم کے اعتبار سے کوئی کمی یا تساہل نظر نہ آئے۔

8.3 اختلاف رائے کا اظہار اصولاً تو تنظیم کے نظم کے ذریعہ متعلقہ اصحاب امر تک پہنچانا ہی مناسب ہے۔

یا پھر تنظیم میں مشاورت و اظہارِ خیال کے متعلقہ فورم پر بلحاظِ مرتبہ ومنصب بھی کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اظہارِ رائے کے سلسلے میں حسب ذیل احتیاطیں ضروری ہوں گی:-

8.3.1 یہ اظہار رائے صرف ملتزم رفقاء/ رفیقات ہی کے مابین ہونا چاہئے، چنانچہ ملتزم رفقاء / رفیقات کا مبتدی رفقاء/ رفیقات کے ساتھ اس قسم کی گفتگو کرنا نظم کی خلاف ورزی متصور ہوگا۔ وہ مبتدی رفقاء/ رفیقات کی بات سن کر اگر انہیں مطمئن کر سکیں تو دوسری بات ہے ورنہ سکوت لازم ہوگا۔

8.3.2 ملتزم رفقاء/ رفیقات کے ساتھ گفتگو میں بھی ان آیات قرآنیہ کے مفہوم اور مدلول کے مطابق مخاطب کی استعداد اور ذہنی سطح کو ملحوظ رکھنا نہ صرف تنظیم بلکہ خود اس رفیق/ رفیقہ کی خیر خواہی کے اعتبار سے بھی ضروری ہوگا جس سے اس نوع کی گفتگو کی جا رہی ہو۔

☆ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا (النساء : ۵۸)

بیشک اللہ تعالیٰ حکم فرماتے ہیں کہ ذمہ داریاں ان کے اہل کو دی جائے۔

☆ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ (النساء : ۸۳)

تا کہ جان لیں وہ لوگ جو اس سے استنباط کرنے کے اہل ہیں۔ (یعنی ذمہ دار لوگ جو حالات سے واقف ہیں)

8.3.3 جو رفقاء/ رفیقات تنظیمی مناصب پر فائز ہوں ان کے لئے ضروری ہوگا کہ اختلاف کا اظہار صرف بالا تر ذمہ دار حضرات/خواتین کے سامنے کریں، ان کی اپنے ماتحت عہدیداروں یا عام رفقاء/ رفیقات سے ایسی گفتگو نظم کی خلاف ورزی متصور ہوگی۔

دفعہ 9: ذاتی تنقید اور محاسبہ

9.1 تنظیم کی پالیسی یا امیر تنظیم کی سیاسی آراء سے اختلاف کے مقابلے میں کسی رفیق/ رفیقہ اور بالخصوص ذمہ دار حضرات/خواتین پر ذاتی تنقید اور شخصی محاسبہ کے ضمن میں بہت زیادہ احتیاط اور حد درجہ احساس ذمہ داری کو ملحوظ رکھنا لازم ہوگا۔

9.2 اس سلسلے میں اس داخلی احساس اور شعوری تنبہ کے ساتھ ساتھ کہ اس میں نہ اپنے عجب اور تکبر کو دخل ہو، نہ کسی دوسرے کی توہین و تذلیل یا اسے صدمہ پہنچانے کا جذبہ کارفرما ہو بلکہ تنقید اور محاسبہ سراسر

خلوص واخلاص اورنصح وخیرخواہی کے جذبے کے تحت ہو،حسب ذیل ضابطوں کی پابندی بھی لازمی ہوگی اوران کی خلاف ورزی کرنے والا/ والی سرزنش کا/ کی مستحق اورتادیبی کارروائی کا/ کی مستوجب ہوگا/ گی۔

9.2.1 جس رفیق/ رفیقہ تنظیم یا ذمہ دار ساتھی میں کوئی قابلِ اصلاح پہلو نظر آئے لازم ہوگا کہ پہلے اسے علیحدگی میں بالمشافہ گفتگو کے ذریعے اصلاح کی جانب متوجہ کیا جائے اوراس سلسلے میں ایک مناسب مدت تک انتظار بھی کیا جائے۔اس مرحلے کو طے کئے بغیر براہ راست تنقید اگر متعلقہ شخص کی غیر حاضری میں ہوگی تو ''غیبت'' کے حکم میں آئے گی جسے قرآن مجید میں مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا گیا ہےاوراگر روبرو لیکن دوسروں کی موجودگی میں ہوگی تو ''ھمز''اور''لمز'' کے حکم میں ہوگی جس پر''ویل'' کی وعید سورۂ ھمزہ میں وارد ہوئی ہے۔

9.2.2 لیکن اگر شق 9.2.1 کے مطابق مناسب کوشش کے بعد بھی محسوس ہو کہ متعلقہ رفیق/ رفیقہ میں یا تو اصلاح کا ارادہ ہی موجود نہیں ہے یا قوت ارادی اتنی کمزور ہے کہ اصلاح پر قدرت حاصل نہیں اور دوسری طرف اس کی کمزوری یا کوتاہی بھی اس نوعیت یا درجہ کی ہے کہ اس سے تنظیم کے مقصد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تب بھی اس معاملے کا عام چرچا غلط ہوگا اور صحیح طرزِعمل یہ ہوگا کہ زیرتنقید رفیق/ رفیقہ تنظیم کے نظم کی جس سطح پر ہو اس کا معاملہ اس سے بالاتر سطح تک پہنچا کر اپنے آپ کو کم ازکم فوری طور پر بری الذمہ سمجھا جائے۔

9.2.3 پھر اگر یہ محسوس ہو کہ اس معاملے میں بالاتر نظم بھی کوتاہی یا تساہل سے کام لے رہا ہے تو معاملے کو درجہ بدرجہ اوپر لایا جاسکتا ہے چنانچہ بلالحاظ مرتبہ ومنصب جملہ رفقاء/ رفیقات تنظیم کے معاملات براہ راست امیر تنظیم کے سامنے بھی لائے جاسکیں گے اور استثنائی حالات میں کسی رکن مجلس مشاورت کے توسط سے مرکزی مجلس مشاورت کے اجلاس میں بھی پیش کئے جاسکیں گے جب کہ خود امیر تنظیم پر تنقید اسی طریق کار کے مطابق مرکزی مجلس مشاورت میں بھی ہوسکے گی اور توسیعی مشاورت کے اجلاس میں بھی۔

9.3 نظم کے ذمہ دار حضرات کے اپنے حلقہ نظم میں شامل رفقاء/ رفیقات کے بارے میں ایسے صلاح ومشورہ

پر جو تنظیم کے مصالح کیلئے ناگزیر ہو شق 9.2.1 کا اطلاق نہیں ہوگا۔

9.4 نظم سے متعلق معاملات اور اس حوالے سے ذمہ دار حضرات کا طرزِ عمل جیسے اُمور براہِ راست نظم بالا/امیر تنظیم کے علم میں لائے جاسکیں گے۔ بشرطیکہ یہ شکایت متعلقہ ذمہ دار کے سامنے کم از کم ایک مرتبہ لائی جا چکی ہو نیز شکایت کنندہ کیلئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی تحریر کی کاپی متعلقہ ذمہ دار کو بھی فراہم کرے۔ تاہم نظم بالا کیلئے ضروری ہوگا کہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے متعلقہ ذمہ دار کو وضاحت کا موقع ضرور دے۔

دفعہ 10: بامعاوضہ/ زیرِ کفالت کارکن

بامعاوضہ اور ہمہ وقتی کارکن تحریکوں اور تنظیموں کی ناگزیر ضرورت بھی ہوتے ہیں اور دوسری جانب اگر احتیاط نہ رکھی جائے تو یہ ادارہ تحریکوں اور تنظیموں کی تباہی کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ تنظیم اسلامی میں اس سلسلے میں حسب ذیل احتیاطیں ملحوظ رکھی جائیں گی۔

10.1 اسروں کے نقباء، مقامی تنظیموں کے امراء، امراء حلقہ جات/ ناظمات اور امیر تنظیم کو حسب حالات مختلف قسم کی ضروریات زندگی (جیسے رہائش یا ٹرانسپورٹ وغیرہ) تو بہم پہنچائی جاسکتی ہیں، لیکن ان مناصب پر کبھی کوئی باضابطہ تنخواہ یافتہ کارکن فائز نہیں ہوسکے گا/گی۔ جب کہ باقی جملہ تنظیمی یا دفتری مناصب کے لئے ہمہ وقتی یا جز وقتی بنیادوں پر زیرِ کفالت یا بامعاوضہ کارکنوں کی حیثیت سے باصلاحیت رفقاء/ رفیقات کی خدمات حاصل کی جاسکیں گی۔

10.2 تنظیم اگر کسی رفیق سے ہمہ وقتی خدمات کا تقاضا کرے یا کسی رفیق کی ہمہ وقتی خدمات کی پیشکش کو قبول کرے تو ایسے رفقاء کی کفالت تنظیم کے ذمہ ہوگی اور تنظیم ان کے حالات وضروریات کے پیش نظر کفالت کا اہتمام کرے گی۔

10.3 تنظیم کا کوئی زیرِ کفالت یا بامعاوضہ تنظیمی کارکن نہ صرف رفقاء/ رفیقاتِ تنظیم، بلکہ ایسے لوگوں سے بھی جن سے اس کا تعارف تنظیم ہی کی وساطت سے ہوا ہو:

10.3.1 کوئی صدقہ یا اعانت قبول نہیں کرسکے گا/گی۔

10.3.2 نظم بالا کی اطلاع اور اجازت کے بغیر ہدایا وصول نہیں کرسکے گا/گی۔ (ماسوائے ان گھریلو ہدیوں کے جن کا تبادلہ پڑوس یا قریبی تعلقات کی بنیاد پر ہوتا ہے) اور نہ ہی کوئی

قرض لے سکے گا/گی۔ بلکہ اپنی کسی ہنگامی ضرورت کے لئے تنظیم ہی سے رجوع کرے گا/گی۔ جو ضرورت کی نوعیت اور اپنے ذرائع کی وسعت کے مطابق تعاون کرنے کی کوشش کرے گی۔

نوٹ : شق 10.3 میں مذکور پابندیوں کا اطلاق امراء/ ناظمات حلقہ جات پر بھی ہوگا۔

10.4 دفتری یا دیگر عمومی نوعیت کی خدمات (جیسے کلرک، قاصد اور گاڑیوں کے ڈرائیور وغیرہ) کے لئے گورنمنٹ پے سکیل سے رہنمائی لیتے ہوئے معاوضے دیئے جائیں گے۔

دفعہ 11: تنظیم اسلامی اور ملکی انتخابات

11.1 تنظیم اسلامی نہ بحیثیت جماعت ملکی انتخابات میں حصہ لے گی، نہ ہی اپنے کسی رفیق/ رفیقہ کو اجازت دے گی کہ وہ کسی انتخاب میں خود بحیثیت امیدوار کھڑا/کھڑی ہو یا کسی دوسرے امیدوار یا جماعت یا محاذ کے حق میں کنویسنگ کرے۔ اس معاملے میں خلاف ورزی اخراج عن التنظیم پر بھی منتج ہو سکے گی۔

11.2 البتہ رفقاء/ رفیقات تنظیم اپنا حق رائے دہی، جو اصلاً قومی امانت ہے، ادا کرنے کے لئے کسی امیدوار کو ووٹ دے سکیں گے/گی۔ بشرطیکہ وہ امیدوار:

11.2.1 کم از کم ظاہری اعتبار سے فسق و فجور کا مرتکب نہ ہو۔ اور

11.2.2 کسی ایسی جماعت سے وابستہ نہ ہو جس کے منشور یا اس کی اعلیٰ قیادت کے اعلانیہ نظریات و تصورات میں کوئی بات خلاف شریعت موجود ہو۔ تاہم نظم کے اعتبار سے اس ضمن میں متعلقہ رفیق/ رفیقہ کی ذاتی رائے اور صوابدید ہی حتمی ہوگی۔

11.3 اس دفعہ کا اطلاق مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں اور سینٹ کے علاوہ بلدیاتی اداروں پر بھی ہوگا البتہ سماجی تنظیموں اور اداروں، یا پیشہ ورانہ اور محکمانہ یونینوں (Trade Unions) کے ضمن میں خاص حالات میں نرمی برتی جاسکتی ہے۔ تاہم ان کے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے بھی تنظیم کی اجازت ضروری ہوگی۔

دفعہ 12: تنظیم سے علیحدگی یا اخراج

12.1 ویسے تو چونکہ تنظیم اسلامی ہرگز اس ''الجماعت'' کی حیثیت نہیں رکھتی جس سے علیحدگی کے ضمن میں مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ ''جو (جماعت سے) علیحدہ ہوا وہ جہنم میں جھونک دیا گیا۔'' کی وعید وارد ہوئی ہے۔ لہٰذا امیر تنظیم سے اپنی بیعت فسخ کر کے تنظیم سے علیحدگی اختیار کرنے کا حق ہر رفیق/ رفیقہ کو ہر دم حاصل ہوگا۔ لیکن ایک خالص دینی ہیئت اجتماعیہ بالخصوص ''بیعت جہاد'' کی اساس پر قائم ہونے والی تنظیم سے علیحدگی عام سیاسی یا سماجی تنظیموں سے علیحدگی کے مانند نہیں ہے، لہٰذا رفقاء/ رفیقات کے احساس ذمہ داری اور عہد رفاقت کی مسؤلیت کے پیش نظر توقع کی جائے گی کہ کوئی رفیق/ رفیقہ تنظیم یہ انتہائی قدم اسی صورت میں اٹھائے جب یا تو امیر تنظیم پر اعتماد باقی نہ رہے، یا پالیسی اور طریق کار کے ضمن میں کوئی بنیادی اختلاف پیدا ہو جائے جو پوری امکانی کوشش کے باوجود کسی طرح بھی رفع نہ ہو سکے۔ مزید برآں یہ توقع کی جائے گی کہ علیحدہ ہونے والا رفیق/ رفیقہ اپنے فیصلہ سے امیر تنظیم کو باضابطہ مطلع کر دے، بصورت دیگر عنداللہ جواب دہی باقی رہے گی۔

12.2 البتہ اگر کسی رفیق/ رفیقہ تنظیم کے بارے میں یہ بات علم میں آئے کہ:

12.2.1 وہ کسی فرض کا/ کی تارک یا صریحاً حرام شے کا/ کی مرتکب ہے اور اس میں اصلاح حال کا کوئی حقیقی ارادہ موجود نہیں ہے۔ یا

12.2.2 اس کے کسی عمل یا روش سے تنظیم کی بدنامی کا اندیشہ ہے، ____ یا

12.2.3 وہ تنظیم کے نظم کو نقصان پہنچانے کے درپے ہے،

تو ایسے رفیق/ رفیقہ کو تنظیم سے خارج کیا جا سکے گا۔

12.3 ایسے کسی رفیق/ رفیقہ کے تنظیم سے اخراج کا فیصلہ صرف امیر تنظیم کریں گے، ماتحت نظم صرف سفارش کر سکے گا۔ اور متعلقہ رفیق/ رفیقہ کو وضاحت کا پورا موقع دیا جائے گا۔

12.4 اگر ضرورت داعی ہو تو ایسے کسی رفیق/ رفیقہ کے اخراج کا اعلان عام بھی کیا جا سکے گا۔

☆—☆—☆

(د)

نظامُ العمل

نظام العمل

(حصہ اول ---- برائے حضرات)

دفعہ 1: رفقاءِ تنظیم کے مطلوبہ اوصاف

ہر رفیق تنظیم

1.1 اپنے ایمان اور یقین میں پختگی اور گہرائی پیدا کرنے کی ہر دم کوشش کرتا رہے۔ جس کے لئے فہم اور تدبر کے ساتھ قرآن مجید کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کو معمول بنائے اور قرآن حکیم کے دروس کی محفلوں میں پابندی اور تسلسل کے ساتھ شرکت کرے۔

1.2 وقتاً فوقتاً مراقبہ کرے اور اپنے باطن میں جھانک کر جائزہ لیتا رہے کہ کیا واقعتاً اس کا نصبُ العین اور مقصدِ حیات اللہ کی رضا اور اخروی فلاح کا حصول بن چکا ہے؟...اور اسی طرح کیا فی الواقع اس کی نماز اور قربانی کی طرح اس کا جینا اور مرنا بھی صرف اللہ کے لئے ہو گیا ہے؟...اور اگر اس میں کمی محسوس ہو تو اپنا پہلا فرض اسی کو سمجھے کہ اس کمی کو پورا کرے۔ اس لئے کہ باقی تمام دعوتی اور تنظیمی ذمہ داریوں کی ادائیگی کا دارومدار اسی پر ہے۔

1.3 اپنے عقائد کو درست کرے اور کلمہ شہادت کے مضمرات اور لازمی نتائج کو ہمیشہ دل و دماغ میں تازہ کرتا رہے۔ اس کے لئے ''تعارفِ تنظیم'' کے صفحات 60 تا 68 کا گاہ بگاہ مطالعہ ضروری ہے۔

1.4 جُملہ فرائض اور واجبات ادا کرے اور تمام حرام اشیاء وافعال اور جملہ مکروہاتِ تحریمی سے لازماً اجتناب کرے اور اپنی معیشت اور معاشرت کو دیگر مکروہات سے پاک کرنے اور سنتِ رسول ﷺ، سنتِ خلفاء راشدینؓ اور تعاملِ صحابہؓ سے قریب سے قریب تر کرنے کے لئے مسلسل کوشاں رہے۔ اس سلسلے میں ''تعارفِ تنظیم'' کے صفحات 69 تا 71 کو مسلسل پیش نظر رکھنا مفید ہے۔

1.5 اپنے دینی علم میں ترقی کے لئے مسلسل کوشاں رہے اور اس سلسلے میں جو تعلیمی اور تربیتی نصاب اور تدریسی پروگرام تنظیم کی جانب سے ترتیب دیئے جائیں ان کی جلد از جلد تکمیل کی مقدور بھر کوشش کرے۔

1.6 خود ذاتی حیثیت میں ''داعی الی اللہ'' بننے کی امکان بھر کوشش کرے اور اس سلسلے میں ان اصولوں

اور ہدایات کو مسلسل پیشِ نظر رکھے جو تنظیم کی قرار داد تاسیس کی توضیحات کے سلسلے میں ''تعارف تنظیم'' کے صفحات 29 تا 31 پر درج ہیں۔

1.7 ہر رفیق تنظیم ایک جانب تنظیم کے جملہ لٹریچر کے مطالعے اور مرکزی قائدین کی اہم تقاریر، خصوصاً امیر تنظیم کے خطباتِ جمعہ کے سننے کا اہتمام کرے۔ (اس کے لئے تنظیم کے جرائد ''میثاق'' اور ''ندائے خلافت'' کا مطالعہ مفید رہے گا) اور دوسری جانب.... اپنے آپ کو ''ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے'' کے مصداق تنظیم کے نظم کی پابندی کا خوگر بنائے۔ چنانچہ اجتماعات میں پابندی کے ساتھ شرکت کرتا رہے تاکہ بالاتر نظم کی جانب سے موصولہ ہدایات کا علم بروقت ہوتا رہے۔!

1.8 دوسرے رفقاء اور ذمہ دار حضرات پر تنقید، احتساب اور اختلاف کے سلسلے میں ان اصولوں اور ہدایات کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھے جو دستورِ تنظیم کی دفعات 8 اور 9 کے ذیل میں درج ہیں اور وقتاً فوقتاً مراقبہ کر کے اپنے باطن کا جائزہ لیتا رہے کہ دل میں بالکل غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر شیطانی وساوس کے ذریعے رفقاء تنظیم اور خصوصاً بالاتر نظم کے خلاف ''غِلّ'' یعنی کدورت پیدا نہ ہو جائے۔

1.9 دعوتی اور تنظیمی سرگرمیوں کے لئے اوقات کو فارغ کرنے کے ضمن میں طے کرے کہ روزانہ کچھ وقت (اوسطاً ڈیڑھ گھنٹہ) ان کاموں کے لئے وقف کرے گا۔

1.10 ''انفاق فی سبیل اللہ'' کے ضمن میں طے کرے کہ وہ ہر ماہ اپنی استطاعت کے مطابق، اپنی حلال آمدنی کا ایک مخصوص حصہ تنظیم کے بیت المال میں جمع کرائے گا۔ اس انفاق کے کم از کم ہدف کے طور پر اپنی ماہانہ آمدنی کا پانچ فیصد ہر رفیق کے ذہن میں ہونا چاہیے۔

دفعہ 2: رفقاء کی درجہ بندی اور تنظیمی فرائض

2.1 عہد نامۂ رفاقت

تنظیم اسلامی کے عہد نامہ رفاقت جس کے الفاظ ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں، پر دستخط کرنے اور تنظیم کی طرف سے قبولیت کے تحریری فیصلے کے بعد ہی ایک شخص تنظیم کا رفیق متصور ہوگا اور اسے فوری طور پر کسی اُسرہ یا مقامی تنظیم یا دفتر حلقہ سے منسلک کر دیا جائے گا۔ ایسا شخص مبتدی رفیق کہلائے گا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ	اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے
اَشۡهَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ	میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں

وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ	وہ تنہا ہے اُس کا کوئی ساجھی نہیں
وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ	اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور رسول ہیں
اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ	میں اللہ تعالیٰ سے اپنے تمام گناہوں کی معافی کا خواستگار ہوں
وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا	اور خلوصِ دل کے ساتھ اُس کی جناب میں توبہ کرتا ہوں
اِنِّيْ اُعَاهِدُ اللّٰهَ	میں اللہ تعالیٰ سے عہد کرتا ہوں کہ:
عَلٰى اَنْ اَهْجُرَ كُلَّ مَا يَكْرَهُهٗ	اُن تمام چیزوں کو ترک کردوں گا جو اُسے ناپسند ہیں
وَاُجَاهِدَ فِيْ سَبِيْلِهٖ جُهْدَ اِسْتِطَاعَتِيْ	اور اُس کی راہ میں مقدور بھر جہاد کروں گا
وَاُنْفِقَ مَالِيْ وَاَبْذُلَ نَفْسِيْ	اور اپنا مال بھی صَرف کروں گا اور جان بھی کھپاؤں گا
لِاِقَامَةِ دِيْنِهٖ وَاِعْلَاءِ كَلِمَتِهٖ	اُس کے دین کی اقامت اور اُس کے کلمہ کی سربلندی کیلئے

وَلِاَجْلِ ذٰلِكَ اُبَايِعُ حافظ عَاكِف سَعِيد ، امير التنظيم الاسلامی

اور اِس مقصد کی خاطر میں امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید سے بیعت کرتا ہوں

اَسْتَعِيْنُ اللّٰهَ رَبِّيْ وَأَسْتَقْدِرُهٗ عَلَى الْاِسْتِقَامَةِ عَلَى الدِّيْنِ وَاِيْفَاءِ هٰذَا الْعَهْدِ

میں اللہ سے مدد اور توفیق کا طلبگار ہوں کہ وہ مجھے دین پر استقامت اور اس عہد کے پورا کرنے کی ہمت عطا فرمائے

2.2 مبتدی رفیق

ہر مبتدی رفیق کے لئے لازم ہوگا کہ حتی الامکان، دین کی طرف سے عائد کردہ جملہ فرائض و واجبات کی ادائیگی اور ہر نوع کے حرام و مکروہات سے اجتناب اور شعائر دینی کے اہتمام کے ساتھ ساتھ:

2.2.1 تنظیم اسلامی کی رفاقت اختیار کرتے ہی فوری طور پر ایک تعارفی اجتماع میں شرکت کرے جو کہ حلقوں کی سطح پر حسب ضرورت یا کم از کم سہ ماہی بنیادوں پر منعقد ہوا کرے گا۔

2.2.2 بعد ازاں پہلی فرصت میں ہفت روزہ مبتدی تربیتی کورس میں شرکت کرے جو کہ مرکز کے زیر اہتمام ایک معین تسلسل کے ساتھ کسی بھی مناسب مقام پر منعقد ہوا کرے گی۔

2.2.3 معین مبتدی تربیتی نصاب برائے مطالعہ/سماعت کو جلد از جلد مکمل کرے۔

2.2.4 منفرد ہونے کی صورت میں ترجیحی بنیادوں پر ''علمی وفکری راہنمائی کیلئے خط و کتابت کورس'' میں داخلہ و

تکمیل۔

2.2.5 اپنے آپ کو نظم کی پابندی کا خوگر بنائے جس کے ضمن میں نظم کے ذمہ دار حضرات کا اطمینان ضروری ہوگا۔ چنانچہ اپنے متعلقہ نظم کے احکامات کی تعمیل کرے اور اُسرہ یا مقامی تنظیم سے وابستگی کی صورت میں اجتماعات میں شرکت کا اہتمام کرے اور منفرد ہونے کی صورت میں اپنی ماہانہ رپورٹ دفترِ حلقہ کو ارسال کرے۔

2.2.6 ماہانہ بنیاد پر مقدور بھر انفاق فی سبیل اللہ کا اہتمام کرے اور وہ رقم تنظیم کے بیت المال میں جمع کروائے۔ (واضح رہے کہ انفاق مال کے حوالے سے تنظیم میں یہ طے ہے کہ اُن رفقاء سے انفاق قبول نہیں کیا جائے گا جو سود میں براہِ راست ملوث ہوں اور ان کی آمدنی کا غالب عنصر حرام کمائی پر مشتمل ہو۔)

2.3 عہد نامہ برائے ملتزم رفقاء

مذکورہ شرائط بالا کی تکمیل کر لینے والے رفیق کو امیرِ حلقہ اپنے اطمینان کے بعد ملتزم کی بیعتِ سمع و طاعت کی دعوت دے گا۔ اور ایسے رفقاء ''عہد نامہ برائے ملتزم رفقاء'' پر دستخط کرنے کے بعد ہی ملتزم متصور ہوں گے۔ جس کے الفاظ ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے
اَشۡهَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ	میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں
وَحۡدَهٗ لَا شَرِيۡكَ لَـــهٗ	وہ تنہا ہے اُس کا کوئی ساجھی نہیں
وَاَشۡهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُـــهٗ	اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں
اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰهَ رَبِّىۡ مِنۡ كُلِّ ذَنۡبٍ	میں اللہ تعالیٰ سے اپنے تمام گناہوں کی معافی کا خواستگار ہوں
وَّاَتُوۡبُ اِلَـيۡهِ تَوۡبَةً نَّصُوۡحًا	اور خلوصِ دل کے ساتھ اُس کی جناب میں توبہ کرتا ہوں
اِنِّىۡ اُعَاهِدُ اللّٰهَ	میں اللہ تعالیٰ سے عہد کرتا ہوں کہ:
عَلٰى اَنۡ اَهۡجُرَ كُلَّ مَايَـــكۡرَهُـــهٗ	اُن تمام چیزوں کو ترک کر دوں گا جو اُسے ناپسند ہیں
وَاُجَاهِدَ فِىۡ سَبِيۡلِهٖ جُهۡدَ اِسۡتِطَاعَتِىۡ	اور اُس کی راہ میں مقدور بھر جہاد کروں گا
وَاُنۡفِقَ مَالِىۡ وَاَبۡـذُلَ نَفۡسِىۡ	اور اپنا مال بھی صرف کروں گا اور جان بھی کھپاؤں گا
لِاِ قَامَةِ دِيۡنِهٖ وَاِعۡلَاءِ كَلِمَتِهٖ	اُس کے دین کی اقامت اور اُس کے کلمہ کی سربلندی کیلئے

وَ لِاَجْلِ ذٰلِکَ اُبَــــایِعُ حافظ عَاکِف سَعِید ، امیر التنظیم الاسلامی

اور اس مقصد کی خاطر میں امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید سے بیعت کرتا ہوں

عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِی الْمَعْرُوْفِ — اُن کا ہر حکم سنوں گا اور مانوں گا جو شریعت کے دائرے سے باہر نہ ہو

فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ — خواہ تنگی ہو خواہ آسانی

وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ — خواہ میری طبیعت آمادہ ہو خواہ مجھے اس پر جبر کرنا پڑے

وَعَلٰی اَثَرَةٍ عَلَیَّ — اور خواہ دوسروں کو مجھ پر ترجیح دی جائے

وَعَلٰی اَنْ لَّا اُنَــازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَــہٗ — اور یہ کہ نظم کے ذمہ دار لوگوں سے ہرگز نہیں جھگڑوں گا

لَا اَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَةَ لَائِمٍ — اور اللہ کے دین کے معاملے میں کسی ملامت کی پرواہ نہیں کروں گا

اَسْتَعِیْنُ اللّٰہَ رَبِّیْ وَاَسْتَقْدِرُہٗ عَلَی الْاِسْتِقَامَةِ عَلَی الدِّیْنِ وَاِیْفَاءِ ھٰذَا الْعَھْدِ

میں اللہ سے مدد اور توفیق کا طلبگار رہوں کہ وہ مجھے دین پر استقامت اور اس عہد کے پورا کرنے کی ہمت عطا فرمائے

2.4 ملتزم رفیق

ہر ملتزم رفیق کے لئے لازم ہوگا کہ:

2.4.1 اپنے متعلقہ نظم کے احکامات کی تعمیل کرے؛ چنانچہ اُسرہ یا مقامی تنظیم سے وابستگی کی صورت میں اجتماعات میں شرکت کا التزام کرے اور منفرد ہونے کی صورت میں اپنی ماہانہ رپورٹ دفتر حلقہ کو ارسال کرے۔

2.4.2 ایک ششماہی جائزہ فارم پُر کر کے اپنے متعلقہ نظم کے حوالے کرے۔ یہ فارم ہر ششماہی ختم ہونے پر اگلے ماہ کے اختتام تک (۳۱ جنوری، ۳۱ جولائی تک) متعلقہ نظم (یعنی نقیبِ اُسرہ/ مقامی امیر/ امیرِ حلقہ) تک پہنچ جانا چاہئے۔

2.4.3 ملتزم تربیتی کورس میں شرکت کرے جس کا اہتمام مرکز حسبِ ضرورت کرے گا۔

2.4.4 معین ملتزم تربیتی نصاب برائے مطالعہ/ سماعت کی تکمیل کرے۔

2.4.5 منفرد ہونے کی صورت میں ترجیحی بنیادوں پر ''علمی وفکری راہنمائی کیلئے خط وکتابت کورس'' میں داخلہ و تکمیل۔

2.4.6 ذاتی انفرادی دعوتی کام کا اہتمام کرے جس میں ''الاقربُ فالاقرب'' کی ترتیب ملحوظ رہنی چاہئے۔

2.4.7 ماہانہ بنیاد پر مقدور بھر انفاق فی سبیل اللہ کا اہتمام کرے اور یہ رقم تنظیم کے بیت المال میں جمع کروائے۔

(واضح رہے کہ انفاق مال کے حوالے سے تنظیم میں یہ طے ہے کہ اُن رفقاء سے انفاق قبول نہیں کیا جائے گا جو سود میں براہِ راست ملوث ہوں اور انکی آمدنی کا غالب عنصر حرام کمائی پر مشتمل ہو۔)

2.4.8 ہر شادی شدہ رفیق اپنے اہل خانہ پر مشتمل ایک گھریلو اُسرہ قائم کرے اور مرکز کی طرف سے مجوزہ نصاب (جو کہ رہنمائی کیلئے نظام العمل کے آخر میں منسلک ہے) کے مطابق چلانے کی کوشش کرے۔

2.5 ملتزم سے مبتدی

جو رفقاء ملتزم قرار پانے کے بعد کسی سبب سے اضمحلال کا شکار ہو جائیں اور نظم کی پابندی نہ کریں، وہ دوبارہ مبتدی رفقاء شمار ہوں گے، لیکن اس کا فیصلہ بھی ماتحت نظم کے مشورہ سے امیر/ ناظم حلقہ خود کریں گے۔ اور انہیں دوبارہ متحرک اور ملتزم بنانے کی کوشش میں مقامی نظم کے علاوہ حلقہ کا نظم بھی حصہ لے گا۔

2.5.1 اگر کوئی ملتزم رفیق حسب ذیل چار میں سے کسی کوتاہی کا مرتکب ہوگا تو امیر/ ناظم حلقہ اسے متعلقہ نظم کی سفارش پر دوبارہ مبتدی رفیق قرار دے سکے گا۔

2.5.1.1 فرائض وواجبات اور شعائرِ دینی کے ضمن میں نمایاں پسپائی۔

2.5.1.2 طے شدہ اجتماعات سے بلا حقیقی عذر مسلسل غیر حاضری اور منفرد ہونے کی صورت میں تین ماہ تک ماہانہ رپورٹ ارسال نہ کرنا۔

2.5.1.3 ذاتی انفرادی دعوتی کام سے مسلسل پہلوتہی۔

2.5.1.4 ماہانہ انفاق کے معاملے میں مسلسل کوتاہی۔

2.5.2 ایسے مبتدی رفیق کو از سرِ نو ملتزم قرار پانے کے لئے اپنی اس کوتاہی کو دور کرنا ہوگا جس کی بناء پر وہ دوبارہ مبتدی قرار دیا گیا ہو۔ چنانچہ تین ماہ کے مسلسل جائزے کے بعد اگر صورتِ حال اطمینان بخش ہو تو متعلقہ نظم کی سفارش پر امیر/ ناظم حلقہ اس کو دوبارہ ملتزم رفیق قرار دے سکے گا۔

2.6 تقرریٔ ذمہ داران

تنظیم میں اسروں کے نقیب، مقامی تنظیموں کے امراء، امرائے حلقہ اور مقامی و مرکزی ناظمین و دیگر ذمہ داران کا تقرر ملتزم رفقاء میں سے ہوگا۔ نیز تنظیم کی مرکزی مجلس مشاورت کے تشکیل کے ضمن میں حقِ رائے دہی بھی صرف ملتزم رفقاء ہی کو حاصل ہوگا۔

دفعہ 3: ذمہ داران کے مطلوبہ اوصاف

3.1 اولین اور اہم ترین یہ کہ تنظیم اسلامی میں ذمہ داریاں اور مناصب صرف ایسے ملتزم رفقاء کے سپرد کئے جائیں گے جو اپنی معیشت کو حرامِ بیّن سے اور معاشرت کو بدعات اور لایعنی رسومات سے پاک کر چکے ہوں۔ البتہ

بدعات و رسومات سے اجتناب اور ستر وحجاب کے احکام کی تنفیذ کے ضمن میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اپنے دائرہ اختیار میں تو ان پر سختی سے کاربند ہونا ضروری ہوگا لیکن دوسرے اعزہ و اقرباء اور تعلیم و تلقین کے لئے منعقد ہونے والی مجالس یا ملاقاتوں کے ضمن میں حکمتِ دین، مصلحتِ دعوت اور تدریجِ تبلیغ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوگا۔ اسی طرح منکرات سے خود تو پوری طرح اجتناب لازمی ہوگا لیکن ''عمومِ بلوٰی'' یعنی ان منکرات کی معاشرت میں کثرت اور عموم کے پیش نظر ان کی بنا پر معاشرتی انقطاع نہ ضروری ہے نہ مناسب۔

3.2 تنظیم اسلامی میں ذمہ داریوں اور مناصب کے حامل رفقاء کیلئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ وہ قراردادِ تاسیس اور اس کی توضیحات کی بنیادی روح کو زیادہ سے زیادہ پیش نظر رکھیں، اور اپنی ذاتی دینی ترقی کو تنظیمی سرگرمیوں کے بھینٹ نہ چڑھنے دیں۔ چنانچہ عبادات میں نوافل کے اہتمام اور وضع قطع، بود و باش اور معیارِ زندگی کے ضمن میں سنتِ رسول ﷺ کے زیادہ سے زیادہ اتباع کے لئے مسلسل کوشاں رہیں۔

3.3 ذمہ دار حضرات کے بارے میں یہ امر بھی اظہر من الشمس ہے کہ انہیں عام رفقاء کے مقابلے میں دعوتی اور تنظیمی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے زیادہ وقت صَرف کرنا ہوگا۔

3.4 اسی طرح ذمہ داری کے یہ مناصب صرف ایسے رفقاء کے سپرد کئے جاسکیں گے جو کچھ مدت بحیثیت ملتزم رفیق بسر کر چکے ہوں۔ چنانچہ استثنائی صورتوں سے قطع نظر بالعموم نقیب کی ذمہ داری صرف ایسے رفیق کو سونپی جائے گی جو کم از کم ایک سال سے ملتزم رفیق ہو اور ملتزم تربیتی کورس میں شمولیت اختیار کر چکا ہو۔ اسی طرح مقامی تنظیم کی امارت نیز مقامی و حلقہ جاتی مناصب ایسے رفقاء کے حوالے کئے جائیں گے جو کم از کم دو سال سے التزامِ نظم کا اہتمام کر رہے ہوں اور مرکزی شعبوں کے ناظمین اور امراء و ناظمین حلقہ جات صرف ایسے رفقاء میں سے مقرر کئے جائیں گے جو کم از کم پانچ سال سے تنظیم کے ساتھ پابندی، تسلسل اور استقلال کے ساتھ منسلک رہے ہوں۔

3.5 مرکزی مشاورت کے اراکین کے لئے قانونی شرط تو صرف یہ ہوگی کہ وہ بحیثیت ملتزم رفیق پانچ سال سے تنظیم کے ساتھ منسلک رہے ہوں۔ البتہ ان کے حق میں رائے دینے والے رفقاء اصولی طور پر متذکرہ بالا جملہ امور کو پیش نظر رکھ سکتے ہیں، اگرچہ ان کے ضمن میں تفتیش اور تجسّس کی اجازت نہیں ہوگی۔ مرکزی مشاورت کی تشکیل کے ضمن میں رائے دیتے ہوئے متعلقہ رفقاء کی عمر اور تجربہ، علم و فہم، اصابتِ رائے اور تنظیم اسلامی کے اساسی فکر اور منہج و مزاج سے کما حقہ واقفیت اور انشراحِ صدر کو اولیت دینا مناسب ہوگا۔

دفعہ 4:   تنظیمی ڈھانچہ

تنظیم اسلامی پاکستان کا تنظیمی ڈھانچہ مرکزی وحلقہ جاتی نظام، مقامی تنظیموں، اُسرہ جات اور منفرد رفقاء پر مشتمل ہوگا۔ جس کی تفصیلی دفعات ذیل میں بیان کی جارہی ہیں۔

دفعہ 5:   منفرد رفقاء

5.1 اگر کسی مقام پر رفقاء کی تعداد تین سے کم ہو یا کوئی ایسے رفیق موجود نہ ہوں جو نقیب کی ذمہ داری سنبھال سکیں تو وہ سب ''منفرد رفیق'' شمار ہوں گے اور براہِ راست حلقہ کے نظم سے منسلک ہوں گے۔

5.2 ایسے رفقاء کو بھی منفرد قرار دے کر براہِ راست مرکز یا حلقہ سے منسلک کرلیا جائے گا جن کا کسی خاص سبب کے باعث عام نظم سے وابستہ ہونا مناسب نہ ہو۔

دفعہ 6:   نظام اُسرہ

6.1 ضابطۂ قیام وہدف

تنظیم اسلامی کے تنظیمی ڈھانچے میں سب سے بنیادی یونٹ اُسرہ ہے جس کے معنی ایک خاندان کے ہیں۔ کسی معاشرے میں جو حیثیت ایک خاندان کی ہوتی ہے وہی حیثیت تنظیم میں ''اُسرہ'' کی ہے۔ جس کی صحت اور کارکردگی پوری تنظیم پر اثر انداز ہوتی ہے۔

6.1.1 جس مقام پر رفقاء کی تعداد تین یا اس سے زائد ہوجائے اور کوئی ایسے رفیق بھی موجود ہوں جو نقیب کی ذمہ داریاں سنبھال سکیں وہاں نظام اُسرہ قائم کردیا جائے گا۔

6.1.2 اُسرہ کے نقیب کا تقرر مقامی امیر یا امیر حلقہ کریں گے اور ہر نقیب اپنی تنظیمی ذمہ داریوں کے حوالے سے اپنے تقرر کرنے والے ہی کو رپورٹ کرے گا۔

6.1.3 ایک اُسرہ میں کم از کم تین رفقاء شامل ہوں گے اور کوشش کی جائے گی کہ رفقاء کی تعداد زیادہ سے زیادہ دس ہوجانے پر جلد از جلد علیحدہ اُسرہ قائم کردیا جائے۔

6.2 نقیبِ اُسرہ کے فرائض منصبی

تنظیم اسلامی کے تنظیمی ڈھانچے میں سب سے بنیادی اور فیصلہ کن ذمہ داری نقیبِ اُسرہ کی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ نقباء کے مناسب حد تک فعال اور متحرک ہونے پر ہی تنظیم کی پیش رفت کا اصل انحصار اور دارومدار ہے۔ لہٰذا جملہ رفقاءِ تنظیم پر عائد شدہ ذمہ داریوں پر مستزاد نقیبِ اُسرہ پر حسبِ ذیل اضافی فرائض عائد ہوں گے۔

6.2.1 اپنے اُسرہ میں شامل رفقاء کے ذاتی اور خاندانی حالات سے باخبر رہنا اور ایک سربراہِ خاندان کے

مانند رفقاء کے ذاتی اور خانگی مسائل و معاملات میں دلچسپی لینا،ضروری رہنمائی فراہم کرنا اور حتی الامکان تعاون کی صورتیں پیدا کرنا۔

6.2.2 رفقاء کی علمی اور عملی تربیت اور ترقی کی نگرانی کرنا۔ نیز اصلاحِ حال کے لئے مشورے دینا۔

6.2.3 نظمِ بالا سے موصولہ احکام اور ہدایات کو رفقاء تک بروقت پہنچانے کا اہتمام کرنا۔

6.2.4 اُسرہ کی سطح پر طے شدہ دعوتی اور تنظیمی پروگرام منعقد کرنا اور ان کی رپورٹ نظمِ بالا کو بروقت پہنچانا۔

6.2.5 رفقاء کے بروقت ماہانہ انفاق کو یقینی بنانے کے لئے ترغیب وتشویق جاری رکھنا۔

6.2.6 متعلقہ نظمِ بالا کی جانب سے طلب کردہ تنظیمی، تربیتی اور مشاورتی اجتماعات میں شرکت کرنا۔

6.3 نظامِ اجتماعات

اُسرہ جات کے لئے درج ذیل اجتماعات کا انعقاد لازم ہوگا۔ تاہم رفقاء کے ساتھ باہمی مشورے سے اگر امیرِ حلقہ، مقامی امیر یا نقیبِ اُسرہ اس سے زیادہ اجتماعات کے انعقاد کو ممکن العمل بنا سکے تو اُس کی اس کوشش کو بنظرِ تحسین دیکھا جائے گا۔

6.3.1 حلقہ جاتِ قرآنی

قرآن مجید کے مقام واہمیت اور سیرت النبی ﷺ میں قرآن کریم کے مرکز ومحورِ دعوت ہونے کے پیش نظر حلقہ ہائے ترجمہ یا دروس قرآن کا ترجیحاً ہفتہ وار بنیادوں پر مستقل اور مسلسل اہتمام اُسرہ جات کی سطح پر کیا جائے۔

6.3.2 اجتماعِ اُسرہ (تنظیمی وتربیتی)

یہ اجتماع ترجیحاً ہفتہ وار (کم از کم پندرہ روزہ) بنیادوں پر منعقد کیا جائے گا۔ اس کا دورانیہ کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ ہوگا۔ پورے نصاب کو ایک ہی اجتماع میں مکمل کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ بعض حصوں کو اگر مکمل نہ کیا جا سکے تو آئندہ اجتماع میں پہلی ترجیح دے کر مکمل کیا جائے۔

6.3.2.1 تنظیمی حصہ (جائزہ ومشاورت)

6.3.2.1.1 اُسرہ کے تحت حلقہ جات قرآنی کا جائزہ اور اُن کو بہتر بنانے کی تدابیر پر غور اور مشورہ۔

6.3.2.1.2 رفقاء کو انفرادی دعوتی سرگرمیوں کے لئے ترغیب وتشویق اور اُن کے احباب کی فہرست کے ضمن میں پیش رفت کا جائزہ اور اشکالات و مشکلات کے حوالے سے مشورہ، رہنمائی و معاونت۔

6.3.2.1.3 اُسرے کے ماحول ونظم کو بہتر سے بہتر بنانے کا جائزہ اور مشورے۔

یہ واضح رہے کہ فیصلہ کا اختیار نقیب کا ہوگا۔

6.3.2.2 تربیتی حصہ (نصاب)

تربیتی نصاب سے بہتر استفادے کیلئے نقیب اُسرہ باہمی مشورے سے اور باصلاحیت رفقاء کا تعاون حاصل کرتے ہوئے مطالعہ، سماعت، تدریس، مذاکرہ، افہام وتفہیم، ورکشاپ یا کوئی دیگر مفید انداز اختیار کرسکتا ہے۔ تلاوت مع تجوید تمام رفقاء سے ایک ہی اجتماع میں کرانا مطلوب نہیں بلکہ سب سے وقتاً فوقتاً کرایا جائے تاکہ تجوید کا جائزہ ہوسکے۔ نیز تجوید کی باقاعدہ تدریس یا قرآن کا حفظ کرانے کی بجائے پیش رفت کا جائزہ، ترغیب وتشویق اور رہنمائی مطلوب ہے۔ اسی طرح رفقاء کے ادعیہ ماثورہ واذکار مسنونہ کے حفظ کا بھی جائزہ لیا جائے۔

6.3.2.2.1 قرآن مجید:

- ☆ تلاوت مع تجوید...... لحنِ جلی (حرام غلطیوں سے پاک)
- ☆ حفظ........................آخری بیس سورتیں، منتخب نصاب مکمل
- ☆ تذکیر (ترجمہ وترجمانی).....آخری منزل یعنی سورۃ ''ق'' سے سورۃ ''الناس'' تک
- ☆ تفہیم (مذاکرہ)............ منتخب نصاب

6.3.2.2.2 سنت وسیرت رسول ﷺ:

- ☆ مطالعۂ احادیث (اخلاقیات، معاملات، آداب، شرعی پردہ اور سود کی حرمت وشناعت) مجموعہ ہائے احادیث تنظیم اسلامی
- ☆ ادعیۂ ماثورہ.....روزمرہ کے معمولات میں آنحضورؐ سے ماثور دعائیں۔
- ☆ اذکارِ مسنونہ.....نظامِ صلوٰۃ سے ملحق اور دیگر مسنون اذکار۔

6.4 نظام مالیات

اُسرہ جات سے متعلق رفقاء (اگران کا اُسرہ حلقہ سے منسلک ہوتو) اپنا انفاق براہِ راست حلقہ کے بیت المال میں جمع کرائیں گے اور اگر اُسرہ کسی مقامی تنظیم سے منسلک ہوتو اس کے بیت المال میں جمع کرائیں گے۔ گویا اُسرہ کی سطح پر کوئی مستقل ''بیت المال'' نہیں ہوگا۔ البتہ صرف وہ اُسرہ جات جو براہِ راست حلقہ سے متعلق ہوں اپنی کُل آمدنی کے زیادہ سے زیادہ ایک تہائی کی حد تک مقامی طور پر صَرف کرسکیں گے اور نقیبِ اُسرہ کی ذمہ داری ہوگی کہ ماہ بماہ اخراجات کے واؤچر اور بقیہ تمام رقم لازماً حلقہ کو ارسال کردے۔

دفعہ 7:   مقامی تنظیم

7.1   ضابطۂ قیام وہدف

7.1.1   تنظیم کا پہلا باضابطہ تنظیمی یونٹ مقامی تنظیم ہے۔ جو اتنی چھوٹی بھی ہوسکتی ہے جس میں دو اُسرے قائم ہوں اور اتنی بڑی بھی ہوسکتی ہے کہ اُسروں کی تعداد اتنی ہو جائے کہ انہیں مختلف ''علاقوں'' کی صورت میں مجتمع کر دیا جائے اور ان پر نقباء اعلیٰ مقرر کر دیئے جائیں جن کی حیثیت مقامی امیر کے معاونین کی ہوگی۔

7.1.2   جس مقام پر رفقاء کی مجموعی تعداد پندرہ یا اس سے زائد ہو اور کم از کم پانچ ملتزم رفقاء موجود ہوں اور کوئی ایسے باصلاحیت رفیق بھی موجود ہوں جو امارت کی ذمہ داری سنبھالنے کے اہل ہوں وہاں مقامی تنظیم قائم کر دی جائے گی۔

7.1.3   مقامی تنظیم کے امیر تنظیمی ذمہ داریوں کے حوالے سے متعلقہ حلقہ کے امیر/ ناظم کو رپورٹ کریں گے۔

7.1.4   بڑے شہروں میں ایک سے زائد مقامی تنظیمیں قائم کی جاسکیں گی۔

7.1.5   بڑی تنظیموں میں حسبِ ضرورت ناظم کا تقرر بھی ہو سکے گا اور دیگر معاونین کی خدمات بھی کل وقتی، جز وقتی، اعزازی یا بامعاوضہ حاصل کی جاسکیں گی لیکن نظمِ بالا کے ساتھ رابطے کی ذمہ داری اصلاً مقامی امیر ہی کی ہوگی۔

7.2   مقامی تنظیم کے ذمہ داران کے فرائض

ہر مقامی تنظیم میں تین ذمہ دار لازماً ہوں گے (۱) امیر مقامی تنظیم (۲) معتمد اور (۳) ناظم بیت المال اور حسب ضرورت ناظم اور دیگر معاونین کا تقرر بھی کیا جاسکتا ہے جو اصلاً مقامی امیر کے نائب کی حیثیت سے کام کریں گے۔ یہ سب حضرات اپنی تنظیمی ذمہ داریوں کے حوالے سے مقامی امیر کو رپورٹ کریں گے۔ ذمہ داروں کے مابین فرائض کی تقسیم حسبِ ذیل ہوگی۔

7.2.1 مقامی امیر

7.2.1.1 فرائض

7.2.1.1.1 اپنے علاقہ میں جہاں اُسرے قائم نہ ہوں وہاں توسیعِ دعوت وتعارف تنظیم کیلئے مسلسل کوشش کرنا، حلقہ جات قرآنی قائم کرنا، دعوتی پروگرام تشکیل دینا۔

7.2.1.1.2 امر بالمعروف ونہی عن المنکر (باللسان) کے ضمن میں مہماتِ تقسیم ہینڈ بل وغیرہ، وفود کی شکل میں علاقے کے نمایاں حضرات سے ملاقاتیں کرنا اور حسب موقع مظاہروں کا

اہتمام کرنا۔

7.2.1.1.3 نقباء کے ضمن میں براہِ راست اور جملہ رفقاء کے ضمن میں نقباء کی وساطت سے ان تمام فرائض کی انجام دہی جو نقیبِ اُسرہ کے فرائض منصبی کے طور پر اوپر بیان ہو چکے ہیں۔

7.2.1.1.4 مقامی سطح پر معین دعوتی اور تنظیمی پروگراموں کے انعقاد کو یقینی بنانے کے علاوہ نظم بالا سے موصولہ اطلاعات بواسطہ نقباء یا بصورت دیگر براہِ راست رفقاء تک پہنچانا، تنظیمی فیصلوں کی تنفیذ کا اہتمام کرنا اور مطلوبہ رپورٹس بروقت نظمِ بالا کو پہنچانا۔

7.2.1.1.5 مقامی تنظیم کے دفتر کی نگرانی اور املاک کی حفاظت کرنا۔

7.2.1.1.6 نقباء سے اُسرے کے رفقاء (مبتدی و ملتزم) کی دینی، تنظیمی اور دعوتی سرگرمیوں کا جائزہ لینا، مناسب رہنمائی فراہم کرنا نیز رپورٹ تیار کرنا اور ہر دو ماہ میں ایک مرتبہ یہ شخصی ریکارڈ امیر/ ناظم حلقہ کو پیش کرنا۔

7.2.1.2 اختیارات

7.2.1.2.1 مقامی تنظیم کی ضروریات اور مالی وسعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مقامی تنظیم کے دفتر کیلئے جز وقتی ماتحت عملے کے تقرر اور ضابطہ کے مطابق ان کی تنخواہ کے تعین کا اختیار۔

7.2.1.2.2 مقامی بیت المال سے اپنے حصے کی رقم مقامی تنظیم و اُسرہ جات کی تنظیمی و دعوتی ضروریات پر خرچ کرنے کا اختیار۔

7.2.1.2.3 مقامی تنظیم کی سطح پر اضافی اجتماعات کو منعقد اور انہیں لازم کرنے کا اختیار۔

7.2.1.2.4 امیر حلقہ کے مشورہ و اجازت سے تنظیم کے تحت اُسرہ جات کے قیام اور ان کے نقباء کے نصب و عزل کا اختیار۔

7.2.1.2.5 مقامی تنظیم کے ناظم بیت المال، معتمد/ ناظم کے تقرر کی امیر حلقہ کو سفارش۔

7.2.1.2.6 مبتدی رفقاء کو ملتزم اور ملتزم کو مبتدی قرار دینے کی سفارش۔

7.2.1.2.7 کسی رفیق کی نظم بالا کو اخراج کی سفارش

7.2.2 معتمد مقامی تنظیم

7.2.2.1 دفتر سے متعلق جملہ اُمور کی انجام دہی اور ریکارڈ کی حفاظت کرنا۔

7.2.2.2 مقامی تنظیم کے رفقاء (مبتدی، ملتزم) کا ریکارڈ رکھنا۔

7.2.2.3 تنظیم کی ماہانہ رپورٹ کے ضمن میں مقامی امیر کی معاونت کرنا۔

7.2.2.4 مقامی امیر کی ہدایت کے مطابق دفترِ حلقہ اور رفقائے تنظیم سے رابطہ رکھنا۔

7.2.2.5 مقامی مشاورتی اجتماعات کی کاروائی کا ریکارڈ رکھنا اور فیصلوں کا ذمہ دار حضرات تک پہنچانا و یاددہانی کرانا۔

7.2.2.6 مقامی امیر کی ہدایت پر حسب ضرورت دیگر تنظیمی اُمور میں اُن کی معاونت کرنا۔

7.2.3 مقامی ناظم بیت المال

7.2.3.1 رفقاء سے انفاق کی رقوم کی وصولی اور دفترِ حلقہ کو گوشواروں کے ساتھ اس کے حصے کی بروقت ترسیل۔

7.2.3.2 مقامی تنظیم کے آمدوخرچ کے حسابات کی ذمہ داری۔

7.2.3.4 مقامی تنظیم کی جملہ املاک، بالخصوص مکتبہ اور لائبریری کے اثاثہ جات کی نگرانی۔

7.2.3.5 مقامی حسابات کی جانچ پڑتال (Audit) کروانا۔

7.2.4 مقامی ناظم تربیت

7.2.4.1 رفقاء (مبتدی/ملتزم) کے تربیتی اہداف کی نگرانی، پیش رفت کا جائزہ و مقامی امیر کو مطلع رکھنا۔

7.2.4.2 زیرِ نظم کے نظام العمل میں طے شدہ تربیتی اجتماعات کی نگرانی و جائزہ اور مقامی امیر کو مطلع رکھنا۔

7.2.4.3 مقامی تنظیم کے نظام العمل میں طے شدہ تربیتی اجتماعات کی منصوبہ بندی، انعقاد، نظامت اور بعد ازاں تأثرات حاصل کرنے میں مقامی امیر کی معاونت کرنا۔

7.2.5 مقامی ناظم دعوت

7.2.5.1 زیرِ نظم کے نظام العمل میں طے شدہ دعوتی اجتماعات کی نگرانی و جائزہ اور تأثرات سے مقامی امیر کو مطلع رکھنا۔

7.2.5.2 مقامی تنظیم کے نظام العمل میں طے شدہ دعوتی اجتماعات و سرگرمیوں کی منصوبہ بندی، انعقاد، نظامت اور بعد ازاں تأثرات حاصل کرنے کے لئے مقامی امیر کی معاونت کرنا۔

7.2.5.3 توسیع دعوت کے ضمن میں مقامی امیر کو مشورے/تجاویز دینا اور منظوری کی صورت میں ان پر عمل درآمد میں معاونت کرنا۔

7.3 نظام اجتماعات

مقامی تنظیموں کے لئے درج ذیل اجتماعات کا انعقاد لازم ہوگا۔تاہم رفقاء کے ساتھ باہمی مشورے سے اگر امیر حلقہ یا مقامی امیر اس سے زیادہ اجتماعات کے انعقاد کو ممکن العمل بنا سکے تو اُس کی اس کوشش کو بنظرِ تحسین دیکھا جائے گا۔

7.3.1 فہم دین پروگرام

یہ نشستیں حسب ضرورت (کم از کم ماہانہ بنیادوں پر) منعقد کی جائیں۔ان نشستوں میں اُسروں کی سطح پر قائم حلقہ جات قرآنی میں باقاعدگی سے شرکت کرنے والے اور دعوتی نصاب سے گزرے ہوئے احباب کو خصوصی دعوت دے کر تنظیم کی فکر یعنی

۱) دین کا ہمہ گیر تصور ''دین و مذہب میں فرق'' ۲) فرائض دینی کا جامع تصور

۳) التزام جماعت و بیعت کی اہمیت ۴) منہج انقلاب نبوی ﷺ

پیش کی جائے اور افہام و تفہیم کے ماحول میں سوال و جواب کا مناسب موقع دیا جائے۔

7.3.2 ماہانہ تربیتی اجتماع

یہ اجتماع ماہانہ بنیادوں پر ترجیحاً شب بیداری کی شکل میں منعقد کیا جائے اور اس کا دورانیہ اوسطاً 5 گھنٹے ہو۔اس اجتماع کو مفید بنانے کیلئے مقامی تنظیم کے تحت اُسرہ جات و رفقاء میں مختلف ذمہ داریاں تقسیم کی جائیں اور رفقاء کے باہمی تعارف کیلئے مواقع بھی فراہم کئے جائیں۔ ہر مقامی تنظیم اپنے قابل توجہ پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر یا نظم بالا کی رہنمائی پر کسی مرکزی مضمون کا تعین کرے اور اسے موضوع تربیت بنائے ،درج ذیل تربیتی نصاب سے بہتر استفادے کیلئے مطالعہ، سماعت، تدریس ، مذاکرہ، افہام و تفہیم ،ورکشاپ یا کوئی دیگر مفید انداز اختیار کیا جا سکتا ہے۔

☆ تذکیر (درس قرآن و درس حدیث) مرکزی مضمون

☆ تفہیم (مذاکرہ) حزبُ اللہ کے اوصاف (منتخب نصاب ۲)

☆ تدریس (تشریح/حاصل مطالعہ) تحریکی و دعوتی نصاب (#)

تزکیہ نفس (باطنی بیماریوں کے حوالے سے)

سیرت نبی ﷺ وسیرت صحابہؓ

☆تنظیمی (جائزہ ومشاورت)...............دعوتی سرگرمیاں وتنظیمی پیش رفت

شرکاء کی تجاویز وتاثرات

مقامی امیر کا پیغام

(#)تحریکی ودعوتی نصاب

☆ دین کا ہمہ گیر تصور (دین ومذہب میں فرق) ☆ فرائض دینی کا جامع تصور

☆ التزام جماعت وبیعت ☆ منہج انقلاب نبوی ﷺ

☆ تنظیم کا تاریخی پس منظر ☆ تعارف تنظیم اسلامی

☆ دستور ونظام العمل ☆ جہاد فی سبیل اللہ

☆ دعوت دین اوراس کا طریقہ کار (منتخب ابواب)

☆ شورائیت وآداب مشاورت ☆ ہم عصر تحریکوں کا تقابلی جائزہ

7.3.3 امر بالمعروف ونہی عن المنکر باللسان

اجتماعی سطح پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر باللسان کے ضمن میں مقامی تناظیم کم ازکم ہر دوسرے ماہ ایک دن مختص کریں۔جس میں زندگی کے تین اجتماعی گوشوں (i) معاشرتی (ii) معاشی (iii) ریاستی میں سے کسی ایک گوشے سے متعلق کوئی ایک منکر کو ہدف بنا کر اپنے اُسروں کے رفقاء کی نصرت سے اپنے علاقہ میں آ گاہیٔ منکرات مہم چلائیں۔اس میں ہینڈ بل کی تقسیم، کتبوں کیساتھ منظّم، پُرامن وخاموش مظاہرہ/ مارچ/ ریلی اور کارنر میٹنگ کی شکل میں اختتامی خطاب جیسی سرگرمیاں کی جائیں۔

7.3.4 توسیع دعوت

جہاں اُسروں کا قیام عمل میں نہ آیا ہو وہاں باہم مشورہ اور زیریں نظم کی نصرت سے خطابات جمعہ، حلقہ جات قرآنی اوراپنے علاقے میں مختلف مقامات پر عمومی نوعیت کی مہمات، اجتماعات، پروگرام کسی بھی ایسی صورت میں منعقد کریں جس سے عوام کو تنظیم کے انقلابی فکر وطریقہ کار سے موثر انداز میں آ گاہ کیا جاسکے۔

7.4 نظام مالیات

7.4.1 مقامی بیت المال مقامی تنظیم کے امیر، ناظم مقامی بیت المال اور کسی تیسرے شخص (معتمد یا ناظم) کی مشترک تحویل میں ہوگا۔

7.4.2 مقامی تنظیم کے بیت المال سے مقامی تنظیم واُسروں کی تنظیمی ودعوتی ضروریات پر خرچ کرنے کا اختیار امیرِ مقامی تنظیم کو حاصل ہوگا تاہم مقامی تنظیم کے بیت المال سے معمول کے اخراجات

کے علاوہ بڑے اخراجات (پانچ ہزار روپے سے زیادہ) کے بارے میں تنظیم کے نقباءِ اُسرہ سے مشورہ کیا جائیگا۔

7.4.3 مقامی تنظیمیں اپنی کُل آمدنی کا دوتہائی حلقہ کے بیت المال کو منتقل کردیں گی (کسی خاص پراجیکٹ کے لئے جمع کردہ رقوم اس قانون سے مستثنیٰ رہیں گی) اس کے علاوہ حلقہ کی ضروریات اور مقامی تنظیموں کی سہولت کے مطابق مزید رقوم بھی دفترِ حلقہ میں طلب کی جاسکیں گی۔

7.4.4 مقامی تنظیموں کے بیت المال کے حسابات اور تمام املاک نیز مکتبہ اور لائبریری کے اثاثہ جات کی جانچ پڑتال مرکزی ناظم بیت المال کریں گے۔

7.5 نظامِ مشاورت

جائزہ، مشاورتِ باہمی وتربیت کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مقامی تنظیموں کی سطح پر متعلقہ امیر ترجیحاً پندرہ روزہ (کم از کم ماہانہ) بنیادوں پر اجتماع نقباء ومعاونین کا اہتمام کرے گا، یہ واضح رہے کہ فیصلہ کا اختیار متعلقہ امیر ہی کو حاصل ہوگا۔

دفعہ 8: نظامِ حلقہ جات

8.1 ضابطۂ قیام وہدف

دعوت کی توسیع اور تنظیمی رابطوں کو آسان اور مستحکم بنانے کے لئے ملک کے مختلف حصوں میں، صوبوں یا ضلعوں کی سطح پر، حلقہ جات قائم کئے جائیں گے۔ تنظیم اسلامی کے تنظیمی ڈھانچے میں حلقہ جات کو خود مختار یونٹ کی حیثیت حاصل ہوگی۔ لہٰذا امرائے حلقہ کو اپنے اپنے علاقہ میں امیر تنظیم اسلامی کے نمائندہ کی حیثیت حاصل ہوگی۔ وہ اپنے اپنے علاقے میں نظام العمل کے مطابق دعوتی اور تنظیمی سرگرمیوں نیز مالی معاملات کے حوالے سے خود مکتفی اور ذمہ دار ہوں گے۔ البتہ حلقہ جات کو نظام العمل کے مطابق چلانے کیلئے ناگزیر انتظامی عملے کا تقرر ضروری ہوگا اس ضمن میں اگر ضرورت ہو تو مرکز افرادی اور مالی اسباب فراہم کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔

حلقہ جات کے امراء/ ناظمین اپنی تنظیمی ذمہ داریوں کے ضمن میں تنظیم کے ناظم اعلیٰ کو رپورٹ کریں گے۔

8.2 حلقہ کے ذمہ داران اور ان کے فرائض

ہر حلقہ میں تین ذمہ دار لازماً ہوں گے (i) امیر/ ناظم حلقہ (ii) معتمد (iii) ناظمِ بیت المال اور اگر ضرورت ہو تو چوتھا منصب نائب امیر/ ناظم کا قائم کیا جاسکتا ہے۔ جو حلقہ کی وسعت کے اعتبار سے ایک سے زائد بھی ہوسکتے ہیں۔ نیز یہ ہمہ وقتی بھی ہوسکتے ہیں اور جز وقتی بھی، بامعاوضہ بھی ہوسکتے ہیں اور بلا معاوضہ بھی۔ اس کے علاوہ حسبِ ضرورت

دیگر معاونین (مثلاً ناظمینِ تربیت، دعوت، نشرواشاعت وغیرہ) کی خدمات بھی اعزازی یا بامعاوضہ حاصل کی جاسکیں گی۔ یہ سب حضرات اپنی تنظیمی ذمہ داریوں کے حوالے سے امیر/ ناظم حلقہ کو رپورٹ کریں گے۔
ذمہ داران کے مابین فرائض کی تقسیم حسبِ ذیل ہوگی۔

8.2.1 امیر حلقہ

8.2.1.1 فرائض

8.2.1.1.1 اپنے علاقے میں جہاں مقامی تناظیم یا اُسرہ جات قائم نہ ہوں وہاں توسیعِ دعوت وتعارفِ تنظیم کیلئے منصوبے بنانا، خطاباتِ جمعہ، حلقہ جات قرآنی قائم کرنا، دعوتی پروگرام (تعارفی کیمپ/ جلسۂ عام/ کارنر میٹنگ/ تفہیمِ دین/ ایک روزہ، دوروزہ، سہ روزہ وغیرہ کی صورت میں) تشکیل دینا اور رضا کارانہ بنیادوں پر زیریں نظم کی نصرت سے ان کی تنفیذ کرنا۔

8.2.1.1.2 امر بالمعروف ونہی عن المنکر (باللسان) کے ضمن میں مہماتِ تقسیم ہینڈ بل وغیرہ، وفود کی شکل میں علاقے کے نمایاں حضرات سے ملاقاتیں کرنا اور حسب موقع مظاہروں کا اہتمام کرنا۔

8.2.1.1.3 مقامی امراء، حلقہ کے تحت اُسرہ جات کے نقباء اور منفرد رفقاء کے ضمن میں براہِ راست اور دیگر رفقاء کے ضمن میں انکے توسط سے اُن فرائض کی انجام دہی جو نقیبِ اُسرہ کے فرائض منصبی کے طور پر اوپر بیان ہوچکے ہیں۔

8.2.1.1.4 مقامی سطح پر معین دعوتی اور تنظیمی پروگراموں کے انعقاد کو یقینی بنانا۔

8.2.1.1.5 دفترِ حلقہ کی نگرانی اور املاک کی حفاظت کرنا۔

8.2.1.1.6 مقامی تنظیموں کے امراء سے اُن کے نقباء وحلقہ کے تحت اُسرہ جات کے نقباء سے اُن کے رفقاء کی دینی، تنظیمی اور دعوتی سرگرمیوں کا جائزہ لینا اور مناسب رہنمائی فراہم کرنا نیز رپورٹ تیار کرنا اور ہر سہ ماہی میں یہ شخصی ریکارڈ مرکز کو پیش کرنا۔

8.2.1.2 اختیارات

8.2.1.2.1 معتمدِ حلقہ کے تقرر کا اختیار

8.2.1.2.2 دفترِ حلقہ وذیلی حلقہ جات کے لئے ماتحت عملے کا تقرر نیز ماتحت عملے کی Increment اور پروموشن کا اختیار (مرکز کی جانب سے دیئے گئے Service Structure کے مطابق)۔

8.2.1.2.3 حلقہ کے بیت المال سے اپنے حصے کی رقم حلقہ وزیریں نظم کی تنظیمی ودعوتی ضروریات پر خرچ کرنے کا اختیار۔

8.2.1.2.4 مقامی تنظیم کے امیر کے مشورے سے مقامی نظم کے تحت اُسرہ جات کا قیام وتحلیل اوراُن کے نقباء کے نصب وعزل کی منظوری کا اختیار۔

8.2.1.2.5 مقامی تنظیم کے امیر کے مشورے سے مقامی ناظمِ بیت المال، معتمد/ ناظم کے تقرر کا اختیار۔

8.2.1.2.6 زیریں نظم کی سفارش پر مبتدی سے ملتزم اور ملتزم سے مبتدی قرار دینے کا اختیار۔

8.2.1.2.7 حلقہ کی سطح پر اجتماعات کو منعقد اور لازم کرنے کا اختیار۔

8.2.1.2.8 حلقہ کے تحت اُسرہ جات کے قیام اور ان کے نقباء کے تقرر کا اختیار۔

8.2.1.2.9 نظم بالا کی منظوری سے ذیلی حلقہ جات کا قیام اور متعلقہ امیر/ ناظم کے تقرر کا اختیار۔

8.2.1.2.10 نئی تنظیموں کے قیام نیز مقامی تنظیم کے امراء کے تقرر کی نظم بالا کو سفارش۔

8.2.1.2.11 مقامی امیر/نقیب اُسرہ کی سفارش پر کسی رفیق کے اخراج کی نظم بالا کو سفارش۔

8.2.2 معتمدِ حلقہ

8.2.2.1 دفتر سے متعلق جملہ اُمور کی انجام دہی اور ریکارڈ کی حفاظت کرنا۔

8.2.2.2 حلقہ کے رفقاء (مبتدی، ملتزم) کا ریکارڈ رکھنا۔

8.2.2.3 حلقہ کی تنظیمی رپورٹ کے ضمن میں امیرِ حلقہ کی معاونت کرنا۔

8.2.2.4 امیر/ ناظمِ حلقہ کی ہدایت کے مطابق مرکز اور زیریں نظم اور منفرد رفقاء سے رابطہ رکھنا۔

8.2.2.5 مقامی مشاورتی اجتماعات کی کارروائی کا ریکارڈ رکھنا اور فیصلوں کا ذمہ دار حضرات تک پہنچانا و یاددہانی۔

8.2.2.6 امیر/ ناظمِ حلقہ کی ہدایت پر حسبِ ضرورت دیگر تنظیمی اُمور میں اُن کی معاونت کرنا۔

8.2.3 ناظمِ بیت المال (حلقہ)

8.2.3.1 حلقہ کے جملہ رفقاء سے انفاق کی وصولی کی براہِ راست یا بواسطہ زیریں نظم نگرانی کرنا۔

8.2.3.2 مرکز کو گوشوارۂ انفاق کے ساتھ اس کے حصے کی بروقت ترسیل۔

8.2.3.3 حلقہ کی سطح پر آمد و خرچ کے حسابات کی ذمہ داری۔

8.2.3.4 دفترِ حلقہ کی جملہ املاک نیز مکتبہ اور لائبریری کے اثاثہ جات کی نگرانی۔

8.2.3.5 حلقہ کی سطح پر حسابات کی جانچ پڑتال (آڈٹ) کروانا۔

8.2.4 ناظمِ تربیت (حلقہ)

8.2.4.1 منفرد (مبتدی/ ملتزم) رفقاء کی شخصی رپورٹوں کا جائزہ لینا اور ہر رفیق کو مناسب رہنمائی فراہم کرنا۔

8.2.4.2 رفقاء (نقباء، امراء اور مدرسین) کی تربیتی اہداف کی نگرانی، پیش رفت کا جائزہ اور امیر/ ناظم حلقہ کو مطلع رکھنا۔

8.2.4.3 زیریں نظم کے نظام العمل میں طے شدہ تربیتی اجتماعات کی نگرانی و جائزہ اور امیر/ ناظم حلقہ کو مطلع رکھنا۔

8.2.4.4 حلقہ کی سطح پر نظام العمل میں طے شدہ تربیتی اجتماعات کی منصوبہ بندی، انعقاد، نظامت اور بعدازاں تأثرات حاصل کرنے میں امیر/ ناظم حلقہ کی معاونت کرنا۔

8.2.4.5 مذکورہ تربیتی پروگراموں کے معیار کو بہتر بنانے کیلئے امیر/ ناظم حلقہ کو مشورے/تجاویز دینا اور منظوری کی صورت میں عمل درآمد میں معاونت کرنا۔

8.2.5 ناظم دعوت (حلقہ)

8.2.5.1 زیریں نظم کے نظام العمل میں طے شدہ دعوتی اجتماعات/ سرگرمیوں کی نگرانی/ جائزہ وتأثرات سے امیر/ ناظم حلقہ کو مطلع رکھنا۔

8.2.5.2 حلقہ کی سطح پر نظام العمل میں طے شدہ دعوتی اجتماعات/سرگرمیوں کی منصوبہ بندی، انعقاد، نظامت اور بعدازاں تأثرات حاصل کرنے کے لئے امیر/ ناظم حلقہ کی معاونت کرنا۔

8.2.5.3 توسیع دعوت کے ضمن میں امیر/ ناظم حلقہ کو مشورے/ تجاویز دینا اور منظوری کی صورت میں عمل درآمد میں معاونت کرنا۔

8.2.6 نائب امراء/ ناظمینِ شعبہ جات/ ذیلی حلقہ جات

امراء/ ناظمین حلقہ کے نائبین کی حیثیت سے ان کی ہدایات کے مطابق کام کریں گے۔

8.3 نظامِ مالیات

8.3.1 حلقہ کا بیت المال امیرِ حلقہ، ناظمِ بیت المال (حلقہ) اور کسی تیسرے شخص (معتمد یا نائب امیر/ ناظمِ حلقہ) کی مشترک تحویل میں ہوگا۔

8.3.2 حلقہ کے بیت المال سے حلقہ وزیریں نظم کی تنظیمی ودعوتی ضروریات پر خرچ کرنے کا اختیار امیرِ حلقہ کو حاصل ہوگا۔ تاہم حلقہ کے بیت المال سے معمول کے اخراجات کے علاوہ بڑے اخراجات (مبلغ پندرہ ہزار روپے سے زائد) کے بارے میں حلقہ کی مقامی تنظیموں کے امراء اور حلقہ کے تحت اُسرہ جات کے نقباء سے مشورہ کیا جائے گا۔

8.3.3 حلقہ اپنی کُل آمدنی کا ایک تہائی تو لازماً مرکزی بیت المال کو منتقل کردے گا۔ (کسی خاص پراجیکٹ کے لئے جمع کردہ رقوم اس قانون سے مستثنیٰ رہیں گی)۔ اس کے علاوہ مرکز کی ضروریات اور حلقہ کی سہولت کے مطابق مزید رقوم بھی مرکز طلب کی جاسکیں گی۔

8.3.4 حلقہ جات کے بیت المال کے حسابات اور جملہ املاک نیز مکتبہ اور لائبریری کے اثاثہ جات کی جانچ پڑتال مرکزی ناظم بیت المال کریں گے۔

8.4 نظامِ مشاورت

8.4.1 حلقہ جاتی سطح پر انتظامی اُمور اور روزمرہ کی کارکردگی کے ضمن میں امیرِ حلقہ ضروری فیصلے ذمہ دارانِ حلقہ کے مشورے سے کرتے رہیں گے۔

8.4.2 تاہم حلقہ جاتی سطح پر عملی پیش قدمی اور کارکردگی کے جائزے کی خاطر نیز مشاورت باہمی و تربیت کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے درج ذیل اہتمام کیا جائے گا۔

8.4.2.1 اجتماع معاونین

یہ اجتماع ترجیحاً ہفتہ وار (کم از کم پندرہ روزہ) منعقد کیا جائے گا۔

8.4.2.2 اجتماع امراء

یہ اجتماع ترجیحاً پندرہ روزہ (کم از کم ماہانہ) بنیادوں پر منعقد کیا جائے گا۔

8.4.2.3 مجلس مشاورتِ حلقہ

اس میں حلقہ کے ذمہ دار حضرات اور امراءِ مقامی تناظیم و نقباءِ اُسرہ (حلقہ کے تحت اُسرہ جات) کے علاوہ حلقہ سے مرکزی مشاورت کے اراکین بھی شامل ہوں گے۔ یہ واضح رہے کہ فیصلہ کا اختیار امیر/ ناظم حلقہ ہی کو حاصل ہوگا۔ حلقہ کی مالیاتی رپورٹ بھی حلقہ کی مجلسِ مشاورت کے اجلاس میں پیش کی جائے گی۔ اس مجلسِ مشاورت کا اجلاس بالعموم ہر تین ماہ بعد ہوگا یعنی سال میں چار اجلاس لازماً ہوں گے۔

دفعہ 9: مرکزی نظام

9.1 ضابطہ

9.1.1 تنظیم اسلامی کی سربراہی اور راہنمائی اصلاً امیرِ تنظیم کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ فیصلہ کا اختیار بھی ان کو حاصل ہوگا لہٰذا امیر تنظیم حسبِ موقع وضرورت دستور/ نظام العمل کی کسی دفعہ یا تمام دفعات کو کُلی یا جزوی طور پر ساقط یا ان میں کمی بیشی کرسکیں گے۔

9.1.2 امیر تنظیم اگر ضرورت محسوس کریں تو تنظیم میں نائب امیر کا تقرر کیا جائے گا۔ اس کو امیر تنظیم کے نمائندہ کی حیثیت حاصل ہوگی۔ تقرر ہونے کی صورت میں نائب امیر اصولی طور پر امیر تنظیم اور پوری تنظیم کے مابین اور عملی اعتبار سے امیر تنظیم اور ناظمین مرکزی شعبہ جات کے مابین ربط (Link) کا

فرض سرانجام دے گا۔

9.1.3 ایک انقلابی تحریک کے اعصابی مرکز (Nerve Centre) ہونے کی بنا پر مرکزی ذمہ داران کے مابین فرائض و اختیارات کی تقسیم محض اعتباری ہے ورنہ اگر تحریک کو واقعتاً فعال اور متحرک بنانا مقصود ہے تو مرکز کے تمام ذمہ دار حضرات کو عام اصطلاح میں امیر تنظیم کی قیادت میں ایک مربوط ٹیم اور قرآنی اصطلاح میں بنیانِ مرصوص کی حیثیت سے کام کرنا ہوگا۔

9.1.4 تنظیم اسلامی کے مرکزی ذمہ داران میں لازمی اور بنیادی تین ہیں یعنی (i) ناظم اعلیٰ (ii) معتمد عمومی اور (iii) ناظم مرکزی بیت المال۔ اہل اور باصلاحیت سینئر رفقاء کی دستیابی (Availability) کے مطابق مرکز میں مزید شعبے بھی شروع کئے جا سکتے ہیں مثلاً شعبۂ تربیت، شعبۂ دعوت اور شعبۂ نشر و اشاعت وغیرہ، بصورت دیگر ان کے سلسلے کے جملہ فرائض بھی ناظم اعلیٰ ہی کو ادا کرنے ہوں گے۔ البتہ نائب امیر کے تقرر کی صورت میں یہ حیثیت نائب امیر کو حاصل ہوگی اور تمام ناظمین مرکزی شعبہ جات بشمول ناظم اعلیٰ ان کو رپورٹ کریں گے۔ ان تمام ذمہ داران کو مرکزی اُسرہ یا جدید اصطلاح میں ''مرکزی مجلس عاملہ'' کہا جائے گا۔

9.1.5 تنظیم کے جملہ ماتحت امراء/ ناظمین (جیسے حلقہ جات اور مقامی تنظیموں کے امراء/ ناظمین وغیرہ) کی حیثیت بھی اصولی طور پر امیر تنظیم کے نائبین ہی کی ہوگی اور ان کا نصب و عزل بالکلیہ ان ہی کی صوابدید پر ہوگا۔ اگرچہ وہ اس کے لئے متعلقہ رفقاء سے حسبِ منشا مشورہ کر سکیں گے۔

9.1.6 اختیارات کے ضمن میں جیسا کہ ابتداء ہی میں یہ صراحت کی جا چکی ہے کہ ہر معاملے میں امیر تنظیم ہی کا فیصلہ آخری اور حتمی ہوگا اور جملہ تنظیمی اختیارات امیر تنظیم ہی کو حاصل ہیں، تاہم نظم کو چلانے کے لئے مرکزی ناظمین و دیگر ذمہ داران کو ان کے فرائض کی مناسبت سے امیر تنظیم کی جانب سے اختیارات تفویض کئے گئے ہیں لیکن درج ذیل اُمور میں فیصلہ کرنے کے مجاز صرف اور صرف امیر تنظیم ہی ہوں گے:

9.1.6.1 مرکزی ناظمین، امراء و ناظمینِ حلقہ جات و ناظمِ بیت المال (حلقہ) نیز مقامی امراء کا تقرر اور علیحدگی۔

9.1.6.2 کسی رفیق کا تنظیم سے اخراج کا فیصلہ کرنا۔

9.1.6.3 تنظیم اسلامی کے سالانہ بجٹ کی منظوری دینا۔

9.1.6.4 بجٹ کے علاوہ خصوصی پراجیکٹس کے لئے رقم کی منظوری دینا۔

9.1.6.5 مرکزی دفتر کے ماتحت عملے کے تقرر کی منظوری نیز Increment اور پروموشن کا اختیار (واضح رہے کہ مرکزی دفتر کے ماتحت عملے کی Increment اور پروموشن کی سفارش مرکزی ناظمین کرتے ہیں۔)

9.1.6.6 مرکزی وتوسیعی عاملہ اور مرکزی مجلس مشاورت کی سطح پر کیے گئے کسی بھی فیصلہ میں جزوی ردوبدل یا مکمل طور پر تبدیل کرنے کا اختیار۔

9.1.6.7 کسی بھی سطح کے تنظیمی نزاعات میں آخری اپیل پر فیصلہ کرنے کا اختیار۔

9.2 مرکزی ذمہ داران کے فرائض واختیارات

9.2.1 ناظم اعلیٰ

9.2.1.1 فرائض

9.2.1.1.1 مرکز کے جملہ شعبوں کی نگرانی اور ان کے مابین رابطہ اور ہم آہنگی پیدا کرنا۔

9.2.1.1.2 امیر تنظیم کے مرکزی وتوسیعی مجلس عاملہ، مرکزی مجلس مشاورت اور دیگر سطحوں پر کیے گئے فیصلوں کی تنفیذ۔

9.2.1.1.3 امیر تنظیم اور امرائے حلقہ کے مابین رابطے کے فرائض سرانجام دینا۔

9.2.1.1.4 امرائے حلقہ جات سے خط وکتابت اور ملاقاتوں کے ذریعے مضبوط بنیادوں پر رابطہ رکھنا نیز حلقہ جات کے مابین رابطہ اور ہم آہنگی پیدا کرنا۔

9.2.1.1.5 حلقہ جات نیز دفاترِ حلقہ کی کارکردگی کا جائزہ لیتے رہنا اور امیرِ تنظیم کو ان کی کارکردگی سے آگاہ رکھنا۔

9.2.1.1.6 حلقہ جات کے امراء/ ناظمین کے ضمن میں براہِ راست اور دیگر رفقاء کے ضمن میں زیریں نظم کے توسط سے اُن فرائض کی انجام دہی جو نقیبِ اُسرہ کے فرائض منصبی کے طور پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

9.2.1.1.7 حلقہ جات کے امراء/ ناظمین سے مقامی امراء، حلقہ کے تحت اُسرہ جات کے نقباء و حلقہ کے منفرد رفقاء کی دینی ، تنظیمی اور دعوتی سرگرمیوں کا جائزہ لینا، مناسب رہنمائی فراہم کرنا، رپورٹ تیار کرنا اور سال میں تین مرتبہ امیر تنظیم/ نائب امیر کو پیش کرنا۔

9.2.1.1.8 اجلاس مرکزی مجلس مشاورت اور سالانہ اجتماع میں تنظیم اسلامی پاکستان کی کارکردگی کی جامع رپورٹ پیش کرنا۔

9.2.1.2 اختیارات (ناظم اعلیٰ)

9.2.1.2.1 مرکز کے لئے منظور شدہ بجٹ کے مطابق حصے کی رقم خرچ کرنے کا اختیار۔

9.2.1.2.2 خصوصی پراجیکٹس کے لئے رقم کی منظوری کی امیر تنظیم کو سفارش۔

9.2.1.2.3 اپنے ماتحت عملے کے تقرر کی سفارش۔ (ماتحت عملہ (1) معاون ناظم اعلیٰ (2) آفس اسسٹنٹ وغیرہ)

9.2.1.2.4 ماتحت عملے کی Increment اور پروموشن کی سفارش۔

9.2.1.2.5 امیر حلقہ کے مشورہ سے حلقہ کے ناظم بیت المال کے تقرر کی امیر کو سفارش۔

9.2.1.2.6 امیر حلقہ کے مشورہ سے حلقہ کے تحت نئی مقامی تنظیم کے قیام اور اس کے امیر کے تقرر کی امیر کو سفارش۔

9.2.2 معتمدِ عمومی

9.2.2.1 فرائض

9.2.2.1.1 تنظیم کے ریکارڈ کی ترتیب اور حفاظت کرنا۔

9.2.2.1.2 سالانہ اجتماع، مرکزی تربیتی کورسز اور مرکزی سطح کے پروگراموں کی اطلاعات جاری کرنا۔

9.2.2.1.3 مرکزی مشاورت، مجلس عاملہ، توسیعی مشاورت اور سالانہ اجتماع کی رودادیں قلم بند کرنا اور برائے توثیق پیش کرنا۔

9.2.2.1.4 امیر تنظیم کے مرکزی عاملہ، توسیعی عاملہ اور مرکزی مشاورت کے دوران یا دیگر کئے گئے فیصلوں سے متعلقہ لوگوں کو آ گاہ کرنا اور یاددہانی کروانا۔

9.2.2.1.5 تنظیم اسلامی پاکستان کی کارگزاری کی سالانہ رپورٹ کی تیاری میں نائب امیر/ ناظم اعلیٰ کی مدد کرنا۔

9.2.2.2 اختیارات (معتمد عمومی)

9.2.2.2.1 مرکزی دفتر کے جنرل سٹاف کے تقرر کی سفارش۔ (ماتحت عملہ (1) کیئر ٹیکر، ٹائپسٹ، ڈسپیچ اسسٹنٹ، باورچی، قاصدین/ نائب قاصدین، ڈرائیور وغیرہ کا تقرر)۔

9.2.2.2.2 اپنے ماتحت سٹاف کی Increment اور پروموشن کی سفارش۔

9.2.2.2.3 مقرر کردہ دستِ گرداں رقم (Imprest) کو مرکزی دفتر کے روزمرہ کے اخراجات پر خرچ کرنے کا اختیار۔

9.2.3 مرکزی ناظمِ بیت المال

9.2.3.1 فرائض

9.2.3.1.1 تنظیم اسلامی کے تمام مالی معاملات کی نگرانی، آمد وخرچ میں توازن کی نگہداشت اور اس کے لئے مناسب تدابیر کی تجویز اور صحیح صورت حال سے نائب امیر/ ناظم اعلیٰ اور مرکزی مشاورت کو مطلع رکھنا۔

9.2.3.1.2 مرکز کے جملہ اثاثہ جات کا باقاعدہ ریکارڈ رکھنے اور تمام حسابات کی کتابوں اور واؤچرز، بل (bills) اور متعلقہ کاغذات کی نگہداشت کے انتظامات کرنا۔

9.2.3.1.3 حلقہ جات/ مقامی تنظیموں کے حسابات کی جانچ پڑتال

9.2.3.1.4 دفاتر حلقہ/ مقامی تنظیموں اور اُسرہ جات میں کتب اور کیسٹ لائبریریوں اور دیگر اثاثہ جات کی جانچ پڑتال۔

9.2.3.1.5 مرکزی بیت المال کے حسابات کے صحیح اندراج اور مرکزی مجلسِ مشاورت کے مقرر کردہ محاسب سے جانچ پڑتال (Audit) کروانا۔

9.2.3.2 اختیارات (مرکزی ناظمِ بیت المال)

9.2.3.2.1 ماتحت مناصب پر عملے کے تقرر کی سفارش۔ (ماتحت عملہ (1) اکاؤنٹنٹ (2) کیشئر وغیرہ)

9.2.3.2.2 ماتحت عملے کی Increment اور پروموشن کی سفارش۔

9.2.4 مرکزی ناظم تربیت

9.2.4.1 فرائض

9.2.4.1.1 رفقاء (خصوصاً ملتزم، نقباء وامراء، معاونین اور مدرسین) کے تربیتی اہداف کی نگرانی، پیش رفت کا جائزہ اور اس حوالے سے امیر تنظیم وناظم اعلیٰ کو مطلع رکھنا۔

9.2.4.1.2 زیریں نظم کے نظام العمل میں طے شدہ تربیتی اجتماعات وغیرہ کی نگرانی وجائزہ اور اپنے تاثرات امیر تنظیم وناظم اعلیٰ کو پیش کرنا۔

9.2.4.1.3 مبتدی، ملتزم اور ذمہ دارانِ تنظیم کے لئے تربیتی کورسز کا نصاب تجویز کرنا وترتیب دینا، معین تسلسل کے ساتھ انعقاد کا اہتمام اور ان کیلئے معلم ومربی حضرات کی تربیت اور فراہمی۔

9.2.4.1.4 جملہ رفقاء تنظیم کے دینی علم وفہم، تزکیہ نفوس وتصفیہ قلوب اور تحریکی شعور وبصیرت کے اضافے کے لئے درجہ وار نصاب برائے مطالعہ تجویز کرنا، مواد کی ترتیب وفراہمی اور جرائد وخط وکتابت کے ذریعے ان کی تعلیم وتدریس کا اہتمام۔

9.2.4.1.5 وقتاً فوقتاً نظریاتی ریفریشر وفنی تربیت کے لئے پروگرام تجویز کرنا وترتیب دینا۔

9.2.4.2 اختیارات (مرکزی ناظم تربیت)

9.2.4.2.1 ماتحت مناصب پر عملے کے تقرر کی سفارش۔ (ماتحت عملہ۔ (1) معاون ناظم تربیت وغیرہ)

9.2.4.2.2 ماتحت عملے کی Increment اور پروموشن کی سفارش۔

9.2.5 مرکزی ناظم دعوت

9.2.5.1 فرائض

9.2.5.1.1 زیریں نظم کے نظام العمل میں طے شدہ دعوتی سرگرمیوں کی نگرانی و جائزہ اوراس حوالے سے اپنے تاثرات، بہتری کے لئے مناسب مشورے/تجاویز امیر تنظیم وناظم اعلیٰ کوفراہم کرنا۔

9.2.5.1.2 زیریں نظم کی دعوتی سرگرمیوں کے حوالے سے حسبِ ضرورت عملی رہنمائی فراہم کرنااور پروگراموں کے انعقادمیں معاونت کرنا۔

9.2.5.1.3 مختلف ومتفرق اسلوب دعوت کاتعین، تفصیلی ہدایات مرتب کرنا اور ان اسلوبِ بیان کے لئےخصوصی تربیت اورعملی رہنمائی فراہم کرنا۔

9.2.5.1.4 امیرمحترم کی تقاریروخطابات میں سے دعوتی نقطۂ نگاہ سےاہم تقاریر کاتعین، ان کا ودیگر بلا معاوضہ قابلِ اشاعت وتقسیم مواد برائے دعوت، امر بالمعروف ونہی عن المنکر (آ گاہی منکرات) وغیرہ کی تیاری بصورت مضامین، ہینڈبل، بروشراور پمفلٹ وغیرہ۔ نیز موجودہ دعوتی لٹریچرکی تسہیل کااہتمام۔

9.2.5.2 اختیارات (مرکزی ناظم دعوت)

9.2.5.2.1 ماتحت مناصب پر عملے کے تقرر کی سفارش۔ (ماتحت عملہ۔ (1)معاون ناظم دعوت وغیرہ)

9.2.5.2.2 ماتحت عملےکیIncrementاور پروموشن کی سفارش۔

9.2.6 مرکزی ناظم نشرواشاعت

9.2.6.1 فرائض

9.2.6.1.1 اخبارات و جرائد سے مسلسل رابطہ، امیر تنظیم کے خطابِ جمعہ کی بالخصوص اوردیگر بیانات پرمشتمل پریس ریلیز کااجراء۔

9.2.6.1.2 باصلاحیت رفقاءکواخبارات اورجرائد کے نام خطوط لکھنے کی ہدایت، رہنمائی اورحوصلہ افزائی۔

9.2.6.1.3 مختلف دینی، ملی اور قومی تقریبات یا اہم ایام کے موقع پر تنظیم کے لٹریچر سے قابلِ اشاعت مضامین کی تیاری اور ان کی اخبارات میں اشاعت کی کوشش۔

9.2.6.1.4 تنظیم کی اسٹیشنری اور مختلف مواقع پر اخباری اشتہارات، ہینڈ بلوں اور پوسٹروں کی تیاری۔

9.2.6.2 اختیارات (مرکزی ناظم نشرواشاعت)

9.2.6.2.1 ماتحت مناصب پر عملے کے تقرر کی سفارش۔ (ماتحت عملہ (1) معاون ناظم نشرو اشاعت (2) کمپیوٹر اسسٹنٹ (3) ریکارڈنگ اسسٹنٹ وغیرہ)

9.2.6.2.2 ماتحت عملے کی Increment اور پروموشن کی سفارش۔

9.2.7 محاسب تنظیم اسلامی پاکستان

9.2.7.1 مرکز کے جملہ اثاثہ جات اور حسابات کی جانچ پڑتال

9.2.7.2 مرکزی مجلس مشاورت کے موقع پر پیش کئے جانے والے مرکز کے آمد و خرچ کے میزانئے کا قبل از وقت جائزہ لینا۔

9.3 نظامِ مشاورت

نظام بیعت کے مطابق تنظیم اسلامی کی سربراہی اور رہنمائی اصلاً امیر تنظیم کی ذمہ داری ہے۔ تاہم قرآن حکیم کی ہدایات:

(i) وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (الشورٰی ۳۸)

اور وہ آپس میں اپنے معاملات پر مشاورت کرتے ہیں

اور (ii) وَشَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ (آل عمران ۱۵۹)

اور معاملات میں ان سے مشاورت کیجئے!

کی رُو سے مشورہ امیر تنظیم کی دینی اور تنظیمی ''ضرورت'' ہے۔ جس کو پورا کرنے کیلئے تنظیم میں مناسب مواقعوں کا اہتمام کیا جائے گا۔ لیکن ''بیعت'' کے دینی و منطقی تقاضے کے طور پر یہ واضح رہنا چاہئے کہ ہر معاملے میں امیر تنظیم ہی کا فیصلہ آخری اور حتمی ہوگا اور رفقاء تنظیم اسے ''منشط'' اور ''مکرہ'' دونوں صورتوں میں تسلیم کرنے کے پابند ہوں گے۔ اِلّا یہ کہ کوئی ایسی صورت درپیش ہو جس پر درج ذیل احادیث نبوی ﷺ کے الفاظ کا انطباق ہوتا ہو۔

(i) ((اِلاَّ اَنْ تَـرَوْا کُفْرًا بَواحًا عِنْدَکُمْ مِنَ اللّٰہِ فِیْہِ بُرْھَانٌ))

’’(تم امیر کی اطاعت اُس وقت تک کرتے رہو) جب تک کہ تم کھلا کفر نہ دیکھو جس کے بارے میں اللہ کی طرف سے تمہارے پاس واضح دلیل موجود ہو۔‘‘ (صحیح مسلم عن عبادہ ابن صامتؓ)

یا/اور (ii) ((فَاِذَا اُمِرَ بِمَعْصِیَۃٍ فَلاَ سَمْعَ وَلاَ طَاعَۃَ))

’’پس جب حکم دیا جائے اللہ کی معصیت کا، تو نہیں ہے سمع وطاعت۔‘‘(متفق علیہ عن ابن عمرؓ)

نظامِ مشاورت کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

9.3.1 مرکزی اُسرہ/مجلس عاملہ

تنظیم اسلامی کے مقاصد کے حصول کے لئے عملی پیش قدمی کے ضمن میں ضروری فیصلے امیر تنظیم، نائب امیر، ناظم اعلیٰ، معتمد اور مرکز کے مختلف شعبوں کے ناظمین (مرکزی اُسرہ/مجلس عاملہ) کے مشورے سے کرتے رہیں گے۔

9.3.2 توسیعی مجلس عاملہ

مرکز کے مختلف شعبوں کے ناظمین (مرکزی اُسرہ/مجلس عاملہ) اور امرائے حلقہ پر مشتمل ایک ’’توسیعی مجلس عاملہ‘‘ تشکیل دی جائے گی جس کا اجلاس بالعموم ہر دو ماہ بعد امیر تنظیم کی زیر صدارت منعقد ہوگا۔ اس موقع پر تنظیم کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے گا نیز ضروری اُمور پر مشورہ ہوگا اور فیصلے کئے جائیں گے۔

9.3.3 مرکزی مجلس مشاورت

ایک معین ’’مرکزی مجلس مشاورت‘‘ قائم کی جائے گی جس میں شق ’’ا‘‘ اور ’’ب‘‘ میں مذکور مرکزی اُسرہ/مجلس عاملہ اور توسیعی مجلس عاملہ کے علاوہ تنظیم کی وسعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک مناسب تعداد میں تنظیم کے ملتزم رفقاء کی آراء کی روشنی میں صائب الرائے رفقاء شامل کئے جائیں گے۔

مرکزی مشاورت کے اراکین کے لئے قانونی شرط تو صرف یہ ہوگی کہ وہ بحیثیت ملتزم رفیق پانچ سال سے تنظیم کے ساتھ مسلسل منسلک ہوں البتہ ان کے حق میں رائے دینے والے رفقاء اصولی طور پر ذمہ داران کے مطلوبہ اوصاف میں بیان کئے گئے جملہ اُمور کو پیش نظر رکھ سکتے ہیں، اگرچہ ان کے ضمن میں تفتیش اور تجسّس کی اجازت نہیں ہوگی۔ مرکزی مشاورت کی تشکیل کے ضمن میں رائے دیتے ہوئے متعلقہ رفقاء کی اصابتِ رائے، علم و فہم، تجربہ، عمر اور تنظیم اسلامی کے اساسی فکر اور منہج و مزاج سے کماحقہ واقفیت اور انشراحِ صدر کو اولیت دینا مناسب ہوگا۔

9.3.3.1 اس مجلس کی نئی تشکیل ہر دو سال بعد ہو گی۔

9.3.3.2 اس مجلس کی تشکیل کے لئے رائے صرف انہی رفقاء کے حق میں دی جا سکے گی جو پانچ سال سے ملتزم ہوں اور رائے صرف ملتزم رفقاء سے لی جائے گی۔

9.3.3.3 اس کی تشکیل تنظیم کے ملتزم رفقاء کی کل تعداد اور مطلوبہ تعدادِ اراکینِ مجلس کو سامنے رکھتے ہوئے رفقاء کی ایک معین تعداد میں سے ایک رکن کے اصول پر ہو گی۔

9.3.3.4 اس مجلس کے اجلاس حتی الامکان لگ بھگ چار ماہ کے وقفے سے ضرور ہوتے رہیں گے اور ہر سال کم از کم تین اجلاس ضرور ہوں گے۔

9.3.3.5 اس مجلس میں پالیسی، طریق کار اور کارکردگی کے اُمور پر امیر تنظیم اراکین کی آراء، تجاویز اور تاثرات سے استفادہ کریں گے۔ مالیاتی رپورٹ بھی پیش ہوگی نیز امیر تنظیم اور اراکین مجلس عاملہ پر تنقید کی جا سکے گی۔ بشرطیکہ دستور دفعہ ۹ شق '9.2' کا تقاضا پورا کیا جا چکا ہو۔

9.3.3.6 کوشش کی جائے گی کہ اس کا ایجنڈا اجلاس سے پندرہ یوم قبل اراکین کو مل جائے۔

9.3.3.7 اگر کوئی رکن مجلس کسی معاملے میں معلومات حاصل کرنا چاہے۔ تو اس کا سوال اجلاس سے ایک ماہ قبل معتمد تنظیم کو موصول ہو جانا لازمی ہو گا۔

9.3.3.8 مشاورت باہمی کی متذکرہ بالا جملہ مجالس میں امیر تنظیم حسبِ منشا دوسرے رفقاء کو بھی شرکت کی دعوت دے سکیں گے۔

9.3.4 توسیعی مشاورت

تنظیم کے جملہ رفقاء کی آراء سے مستفید ہونے کے لئے وقتاً فوقتاً توسیعی مشاورت کے اجلاس منعقد کئے جائیں گے۔ جو تنظیم کی توسیع کی مناسبت سے کچھ حلقوں کو ملا کر یا حلقہ جات کی سطح پر بھی منعقد کئے جا سکیں گے، جس میں

9.3.4.1 جملہ رفقاء کو پالیسی اور طریق کار کے ضمن میں تو اظہار رائے کی مکمل آزادی ہوگی لیکن ذاتی تنقید یا محاسبہ صرف امیر تنظیم کا کیا جا سکے گا۔ بشرطیکہ دستور دفعہ ۹ شق '9.2' کا تقاضا پورا کیا جا چکا ہو۔

9.3.4.2 اس اجلاس میں امیر تنظیم، نائب امیر/ ناظم اعلیٰ و نائبین ناظم اعلیٰ اور متعلقہ حلقہ کے امراء/ ناظمین لازماً جبکہ دیگر اراکین مرکزی اُسرہ و توسیعی مجلس عاملہ نیز اراکین مجلس مشاورت حسب سہولت شریک ہوں گے۔ لیکن ان سب کی حیثیت اصلاً سامع کی ہوگی تاکہ رفقاء کی رائے سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جاسکے۔

9.3.4.3 البتہ اگر کسی معاملے میں امیر تنظیم شدید ضرورت محسوس کریں تو وضاحت بھی کریں گے۔

9.3.4.4 یہ اجلاس عموماً پورے دن پر محیط ہوگا لیکن اس میں اظہار خیال کا حق صرف ان رفقاء کو ہوگا، جو اجلاس کے آغاز سے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کی تاخیر سے پہنچ جائیں۔

☆-☆-☆

ضمیمہ

شادی شدہ رفقاء کے لئے ''گھریلو اُسرہ'' کا قیام

اپنے بیوی بچوں اور زیرِ کفالت افراد کی تربیت سربراہ کنبہ کی ذمہ داری ہے۔ فرمان نبوی ﷺ ہے کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّ کُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ چنانچہ تنظیم اسلامی کے ملتزم شادی شدہ رفقاء کی اس ذمہ داری میں معاونت کے لئے یہ لازم کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اہل خانہ پر مشتمل ایک ''گھریلو اُسرہ'' کا قیام عمل میں لائیں۔ اس کا اندراج نظام العمل کی دفعہ نمبر 2، شق (2.4) ملتزم رفیق' کے نکتہ نمبر (2.4.8) میں ہے۔ یہ اُسرہ درج ذیل نظام کے تحت کام کرے گا۔

1- ملتزم رفیق بحیثیت سربراہ کنبہ ''گھریلو اُسرہ'' کا نقیب ہوگا اور خاتون خانہ اس کی نیابت سرانجام دیں گی تاکہ رفیق کی غیر حاضری کی صورت میں اُسرہ کے پروگرام جاری رہیں۔

2- مجلس اُسرہ ہفتہ وار منعقد کی جائے جس کا دورانیہ کم از کم ایک گھنٹہ ہو۔

3- اُسرہ کا نصاب درج ذیل تجویز کیا جارہا ہے جو کہ گھرانے کے مختلف افراد کو تفویض/تقسیم کیا جائے اور ترغیب و تشویق سے کام لیا جائے تو بہتر ہوگا۔

(i) تلاوت اور ترجمۂ قرآن

(ii) آدابِ زندگی اور بنیادی اخلاقیات کا مطالعہ کیا جائے۔

(iii) سیرۃ النبی ﷺ (ترجیحاً الرحیق المختوم) کا سلسلے وار مطالعہ کیا جائے۔

(iv) سیرۃ صحابہؓ /صحابیاتؓ کا مطالعہ کیا جائے۔ نیز مشاہیرِ اسلام سے متعارف کروایا جائے۔

نوٹ: بچوں کی عمر اور افتادِ طبع کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُسرہ کے پروگرام میں دلچسپی بڑھانے کی خاطر اگر بچوں سے حمد و نعت پر مشتمل معیاری کلام یا کلامِ اقبال کے منتخبات سنے جائیں تو یہ بھی مفید ہوگا۔ اِس اُسرہ کا جائزہ لینے کے لئے ملتزم رفقاء کی ششماہی رپورٹ میں استفسار ہوگا۔

☆☆☆

نظام العمل

(حصہ دوم ----- برائے خواتین)

دفعہ 1 : اہداف

خواتین کی دینی ذمہ داریوں کی وضاحت میں بانی تنظیم اسلامی' محترم ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم ومغفور نے فرائض دینی کی تین سطحوں کو سہ منزلہ عمارت سے تشبیہہ دی ہے اور یہ بیان فرمایا ہے کہ پہلی منزل یعنی اسلام' اطاعت' تقویٰ یا عبادت کے حوالے سے مرد اور عورت کے دینی فرائض میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ عبادات کی نوعیت کے اعتبار سے عورتوں کے ستر وحجاب کی پابندی اور گھروں میں قرار پکڑنے کے حکم کی بنا پر معمولی سا فرق ملحوظ رکھا جائے گا۔ دوسری منزل یعنی دعوت و تبلیغ کے حوالے سے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ خواتین کے لئے دعوت وتبلیغ اور نصیحت واصلاح کا اولین دائرہ ان کا اپنا گھر ہے۔ ان کے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے ضمن میں اُن پر ایک عظیم ذمہ داری کا بوجھ ڈالا گیا ہے۔ مزید براں' جان پہچان کی خواتین اور محرم مردوں کا حلقہ بھی حسبِ استطاعت ومرتبہ اور حسبِ فراغت ان کی ان ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ اس اعتبار سے خواتین کی مناسب تعلیم وتربیت کا اہتمام اور ستر وحجاب کی پابندیوں کے ساتھ منظّم انداز میں اجتماعات وکلاسز کا انعقاد یقیناً مطلوب ہے۔ اسی طرح اپنے والد' بھائیوں اور دیگر محرم مردوں کو تبلیغ کرنا اور انہیں صحیح راستے کی طرف بلانا ان کے دعوت وتبلیغ کے میدان کا حصہ ہے۔ فرائض دینی کی تیسری منزل یعنی اقامت دین کی جدوجہد کے حوالے سے خواتین کا کردار میدان میں آ کر باطل سے پنجہ آزمائی کرنے کا نہیں بلکہ در حقیقت پہلی منزل کے تتمے کا ہے اور عورتوں پر یہ ذمہ داری براہ راست عائد نہیں کی گئی۔ البتہ خواتین سے مطلوب یہ ہے کہ وہ اس جدوجہد میں نہ صرف اپنے مردوں کی مدد ومعاون ہوں' ان کے لئے اس راستے میں زیادہ سے زیادہ وقت فارغ کرنا ممکن بنائیں' اور ان پر اپنی فرمائشوں کا بوجھ اس طرح نہ

لا دیں کہ وہ انہی مسائل میں الجھ کر رہ جائیں اور دین کی سر بلندی کے لئے جہد و کوشش نہ کر سکیں' بلکہ اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے اپنے باپ' بیٹوں' بھائیوں' شوہروں اور محرم رشتہ داروں کو تیار کریں۔گویا دینی فرائض' خاص طور پر تیسری منزل کے حوالے سے مردوں عورتوں میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ ان کے کردار (رول) کا ہے۔مردوں کو میدان میں آ کر کام کرنا ہے جبکہ عورتوں کو وہی کام چادر اور چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ایک مختلف دائرہ کار میں کرنا ہے۔

دفعہ 2 : رفیقاتِ تنظیم کے مطلوبہ اوصاف

نظام العمل حلقہ خواتین کی دفعہ نمبر1:''اہداف'' کے ذیل میں خواتین کی دینی ذمہ داریوں کی وضاحت تین سطحوں کے تحت کی گئی ہے۔ان تین سطحوں کے اعتبار سے ذیل میں رفیقاتِ تنظیم اسلامی کے مطلوبہ اوصاف درج ہیں۔

2.1 پہلی سطح (یعنی ایمان' اطاعت' تقویٰ' عبادت)

2.1.1 اپنے ایمان اور یقین میں پختگی اور گہرائی پیدا کرنے کی ہر دم کوشش کرتی رہیں۔جس کے لیے فہم اور تدبر کے ساتھ قرآن مجید کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کو معمول بنائیں اور قرآنِ حکیم کے دروس کے سننے کا اہتمام کریں۔

2.1.2 وقتاً فوقتاً مراقبہ کریں اور اپنے باطن میں جھانک کر جائزہ لیتی رہیں کہ کیا واقعتاً اس کا نصبُ العین اور مقصدِ حیات اللہ کی رضا اور اخروی فلاح کا حصول بن چکا ہے؟۔

2.1.3 اپنے عقائد کو درست کریں اور کلمہ شہادت کے مضمرات اور لازمی نتائج کو ہمیشہ دل و دماغ میں تازہ کرتی رہیں۔اس کے لیے''تعارفِ تنظیم'' کے صفحات 60 تا68 کا گاہ بگاہ مطالعہ ضروری ہے۔

2.1.4 جملہ فرائض اور واجبات ادا کریں اور تمام حرام اشیاء و افعال اور جملہ مکروہات تحریمی سے لازماً اجتناب کریں اور اپنی معیشت اور معاشرت کو دیگر مکروہات سے پاک کرنے اور سنتِ رسول ﷺ اسوۂ ازواجِ مطہراتؓ اور صحابیاتؓ سے قریب سے قریب تر کرنے کے لیے مسلسل کوشاں رہیں۔ اس سلسلے میں''تعارفِ تنظیم'' کے صفحات 69 تا71 کو مسلسل پیشِ نظر رکھنا مفید ہے۔

2.1.5 اپنے دینی علم میں ترقی کے لیے مسلسل کوشاں رہیں اور اس سلسلے میں جو تعلیمی اور تربیتی نصاب اور تدریسی پروگرام تنظیم کی جانب سے ترتیب دیئے جائیں ان کی جلد از جلد تکمیل کی مقدور بھر کوشش

کریں۔

2.1.6 گھر دار خواتین اپنے گھر میں دینی ماحول اور اسلامی طرزِ حیات کو اختیار کریں۔

2.1.7 شریعت کے تقاضوں کے مطابق اپنے شوہر کی معروف میں اطاعت کریں۔

2.1.8 ستر و حجاب کے جملہ احکام کی پابندی کریں۔ بغیر شرعی عذر' بلا ضرورت اور بغیر شوہر کی اجازت کے، گھر سے باہر نہ نکلیں۔

2.1.9 اپنے مالی تقاضوں کو کم سے کم رکھتے ہوئے اپنے مردوں (باپ' بھائی' شوہر' بیٹا) کو حلال پر قائم رکھنے میں اپنے حصے کی ذمہ داری ادا کریں اور دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے ان کی مدد و معاون بنیں۔

2.1.10 تنظیم اسلامی کی طرف سے دی گئی رپورٹ بک کو باقاعدگی سے پُر کریں۔

2.2 دوسری سطح (یعنی دعوت و تبلیغ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، شہادت علی الناس)

2.2.1 خواتین کے لیے دعوت و تبلیغ اور نصیحت کا اولین دائرہ اپنا گھر ہے' لہٰذا اپنے بچوں کی دینی تعلیم و تربیت اور نماز' روزہ وغیرہ کا خصوصیت کے ساتھ اہتمام کریں۔

2.2.2 جان پہچان کی خواتین اور محرم مردوں کو دین کی دعوت دیں اور قرآنی تعلیمات اور تنظیم اسلامی سے متعارف کروائیں۔

2.2.3 نظام العمل میں طے کیے گئے تنظیمی مشاغل میں اہتمام کے ساتھ شریک ہوں۔

2.3 تیسری سطح (یعنی غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد)

فرائض دینی کی تیسری سطح یعنی اقامت دین کی جدوجہد کے حوالے سے خواتین کا کردار میدان میں آ کر باطل سے پنجہ آزمائی کرنے کا نہیں بلکہ درحقیقت پہلی منزل کے تتمے کا ہے۔ لہٰذا خواتین سے مطلوب یہ ہے کہ وہ اس جدوجہد میں نہ صرف اپنے مردوں کی مدد و معاون ہوں' ان کے لئے اس راستے میں زیادہ سے زیادہ وقت فارغ کرنا ممکن بنائیں' اور ان پر اپنی فرمائشوں کا بوجھ اس طرح نہ لادیں کہ وہ انہی مسائل میں الجھ کر رہ جائیں اور دین کی سر بلندی کے لئے جہد و کوشش نہ کر سکیں' بالخصوص اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے اپنی اولاد کو ذہناً و عملاً تیار کریں۔

دفعہ 3 : رفیقات کی درجہ بندی

تنظیم میں شمولیت اختیار کرنے والی خواتین کو ذمہ داریوں کے اعتبار سے دو حصوں (categories) میں منقسم کیا جائے گا۔

3.1 رکن رفیقات

ہر رفیقہ جو اپنے اصل میدان کار یعنی گھریلو ذمہ داریوں میں پوری طرح مصروف ہے ''رکن رفیقہ'' کہلائے گی۔

3.2 کارکن رفیقات

ایسی رفیقات جن کے پاس اپنی اصل گھریلو ذمہ داریوں کی ادائیگی کے بعد وقت کی فراغت ہو اور درس وتدریس یا تعلیم وتعلّم یا انتظامی خدمات سرانجام دے سکیں وہ کارکن رفیقات کہلائیں گی۔

دفعہ 4 :رفیقات تنظیم کے درجہ وار تنظیمی فرائض (ذمہ داریاں)

4.1 رکن رفیقات کی ذمہ داریاں

4.1.1 سیرت النبی ﷺ اور ازواج مطہرات کے اسوہ سے رہنمائی لیتے ہوئے خود اپنی ذات میں بندگیٔ رب کے تقاضے پورے کرنا۔

4.1.2 اپنے دینی علم میں اضافہ اور جذبۂ ایمانی میں اضافے اور اعمال صالحہ کی کوشش کرتے رہنا۔

4.1.3 اُس تربیتی نصاب اور دعوتی لیٹریچر کی تکمیل کرنا جو خواتین کا مرکزی اُسرہ معین کرے۔

4.1.4 اولاد، جان پہچان کی خواتین اور محرم مردوں تک تبلیغ ودعوت کا کام کرنا۔

4.1.5 اپنے شوہر، باپ بیٹوں اور بھائی کے تعاون سے ''گھریلو اسرہ'' (وضاحت کے لئے دفعہ 5.1.7 ملاحظہ کیجئے) کے انعقاد کی کوشش کرنا۔

4.1.6 اللہ کے دین کے غلبہ کی جدوجہد میں ماہانہ بنیادوں پر انفاق کرنا۔

4.2 کارکن رفیقات کی ذمہ داریاں

4.2.1 اُن فرائض کی ادائیگی جو رکن رفیقات کی ذمہ داریوں کے ذیل میں مذکور ہیں۔

4.2.2 بطور معاونہ تقرر کی صورت میں رفیقات اور مردوں کے مقامی نظم کے مابین محرم مردوں کے ذریعے رابطہ کی خدمات سرانجام دینا۔

4.2.3 بطور معاونہ تقرر کی صورت میں باہم مشورہ سے نظام العمل میں طے شدہ تنظیمی، تربیتی و دعوتی پروگرام منعقد کروانا۔

4.2.4 بطور معاونہ تقرر کی صورت میں رفیقات سے انفاق کی وصولی کرنا اور اسے مقامی نظم میں جمع کروانا۔

4.2.5 مدرسہ/معلّمہ کی ذمہ داری تفویض کئے جانے کی صورت میں خواتین کے دروس کے حلقوں میں تدریسی فرائض سرانجام دینا۔

دفعہ 5 : تنظیمی ڈھانچہ

5.1 مقامی نظم

رفیقات کا تنظیمی ڈھانچہ ترتیب دینا اور اُسروں کا قیام و تحلیل وغیرہ امیر/ ناظم حلقہ کی ذمہ داری ہوگی۔ خواتین کا نظم مردوں کے اسرہ/مقامی تنظیم/ حلقہ کے تحت ہوگا۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھا جائے گا۔

5.1.1 مردوں کا خواتین کے ساتھ رابطہ صرف محرم خواتین کے ذریعے رکھا جائے گا۔ نامحرم مردوں کے ساتھ براہ راست رابطہ درست نہ ہوگا۔

5.1.2 خواتین کا جو ریکارڈ ذمہ دار مردوں کے جائزے اور ملاحظے میں آئے گا اُس میں رفیقات کے نام کے بجائے ''ام فلاں''، ''بنت فلاں''، ''زوجہ فلاں'' وغیرہ ایسے القابات کے استعمال کو ترجیح دی جائے گی۔

5.1.3 رفیقات کے لیے دو الگ الگ کوائف فارم جاری کیے جائیں گے۔ ایک فارم تفصیلی کوائف پر مشتمل ہوگا جو خواتین کے مرکزی اسرہ کو ارسال کیا جائے گا۔ دوسرا فارم مختصر نوعیت کا ہوگا جس میں صرف ضروری کوائف درج ہوں گے۔ یہ فارم تنظیم کے مرکز/ حلقہ/ مقامی تناظیم کے ریکارڈ کے لئے ہوگا۔

5.1.4 خواتین کے پروگراموں میں خطاب/ درس وغیرہ کی ذمہ داری خواتین خود ادا کریں

گی۔

5.1.5 مہمان خواتین کے خطابات یا دروس وغیرہ متعلقہ نظم کی اجازت سے ہوسکیں گے۔

5.1.6 مردوں کے دعوتی پروگراموں میں جہاں سہولت کے ساتھ خواتین کی شرکت ممکن ہو وہاں اس کا اہتمام کیا جائے گا۔

5.1.7 ''گھریلو اسرہ'' کے قیام کے لئے مرد رفقائے تنظیم کی رہنمائی کی جائے گی۔اس لئے کہ خواتین اور اولاد کی دینی تعلیم و تربیت اصلاً سربراہ کنبہ کی ذمہ داری ہے۔حسب فرمان نبویؐ ((کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّکُلُّکُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ)) چنانچہ اس ذمہ داری کی ادائیگی کی خاطر رفقائے تنظیم کیلئے ان کا اپنا گھر ''بنیادی اُسرہ'' کا درجہ رکھتا ہے۔لہٰذا رفقاء تنظیم اپنے گھر کی سطح پر ایک ''گھریلو اُسرہ'' کا اہتمام کریں گے اور مرکز کی طرف سے تجویز شدہ نظام اور نصاب کے مطابق چلائیں گے۔

5.2 منفرد رفیقہ

اگر کسی علاقہ میں تنظیم میں شامل رفیقات کی کسی بھی وجہ سے اُسرہ میں تشکیل ممکن نہ ہو تو اُس علاقے کی رفیقات ''منفرد رفیقات'' کہلائیں گی اور ان رفیقات سے خواتین کا مرکزی اُسرہ براہِ راست رابطہ رکھے گا۔

5.3 اُسرہ

اسرہ کے قیام اور نگرانی کے لئے حسبِ حالات نقیب/ مقامی امیر/ امیر حلقہ یا آخری درجہ میں کسی رفیق تنظیم کی محرم ''کارکن رفیقات'' میں سے ایک ''معاونہ'' (coordinator) کا تقرر کیا جائے گا۔

5.4 ناظمہ عالیہ

خواتین کے امور کی نگرانی کے سلسلے میں امیر تنظیم اسلامی کی معاونت کے لئے مرکز میں امیر تنظیم کی محرم رفیقات میں سے کسی باصلاحیت خاتون کو ''ناظمہ عالیہ'' متعین کیا جائے گا۔

5.5 مرکزی اسرہ

ناظمہ عالیہ کی سرپرستی میں ایک ''مرکزی اسرہ'' قائم کیا جائے گا جس میں ایسی باعلم، باصلاحیت اور وقت کی فراغت رکھنے والی رفیقات کو شریک کیا جائے گا جو تنظیمی امور میں تجربہ رکھتی ہوں اور سہولت کے ساتھ مرکزی دفتر میں وقت دے سکیں۔

دفعہ 6: مرکزی ذمہ داران اور اُن کے فرائضِ منصبی

6.1 مرکزی اسرہ رفیقات کے لیے انفرادی تربیتی نصاب، تربیتی و دعوتی اجتماعات کا نصاب، انفرادی جائزہ رپورٹیں اور تدریسی کورسز مرتب و تجویز کرے گا۔

6.2 مرکزی دفتر میں تمام رفیقاتِ تنظیم کا ایک duplicate record رکھا جائے گا۔

6.3 ناظمہ عالیہ یا مرکزی اسرہ کی وہ رفیقات جو امیر تنظیم کی محرم ہیں، امیر تنظیم کے ساتھ چھ ماہ یا سال میں ایک مرتبہ تمام تنظیمی حلقہ جات / مقامی تناظیم کا دورہ کریں گی اور اُس علاقہ کی رفیقات کے اجتماعات میں شرکت کے علاوہ تنظیمی اور دعوتی امور سے متعلق معاملات کا جائزہ لے کر امیر تنظیم کو اپنے تأثرات، مشورے اور تجاویز پیش کریں گی۔

6.4 اگر خواتین کے بعض مسائل مقامی تنظیم / حلقہ کی سطح پر طے نہ ہو پا رہے ہوں تو خواتین کے مرکزی اسرہ سے تعاون لیا جائے گا۔

6.5 یہ اسرہ باہمی مشاورت سے خواتین کی تربیت، دعوت کے لیے بدلتے حالات کے مطابق تبدیلیاں تجویز کرے گا۔

6.6 تنظیم کی طرف سے معین تربیتی و دعوتی سرگرمیوں کے علاوہ خواتین اگر کوئی اور پروگرام کرنا چاہیں تو ناظمہ عالیہ سے اس کی اجازت لی جائے گی۔

6.7 مرکزی اسرہ میں حسبِ ضرورت ذمہ داریاں تفویض کی جائیں گی، مثلاً معتمدہ، ناظمہ برائے تربیت اور ناظمہ مالیات وغیرہ

6.8 تربیت کے حوالے سے خصوصی خط و کتابت کورسز مرتب و تجویز کئے جائیں گے۔

دفعہ 7: نظام اجتماعات (تعلیم وتربیت، مشاورت اور دعوت)

7.1 ماہانہ تربیتی و تنظیمی اجتماع

اسرہ کی سطح پر خواتین کا کم از کم ایک ماہانہ تربیتی و تنظیمی اجتماع مقامی حالات کے مطابق ترتیب دیا جائے گا' اوران اجتماعات میں خواتین کے مرکزی اسرہ سے موصول شدہ نصاب کے مطابق پروگرام کئے جائیں گے۔

7.2 ماہانہ دعوتی اجتماع

اسرہ کی سطح پر خواتین کا کم از کم ایک ماہانہ دعوتی اجتماع مقامی حالات کے مطابق ترتیب دیا جائے گا' اوران اجتماعات میں خواتین کے مرکزی اسرہ سے موصول شدہ نصاب کے مطابق پروگرام کئے جائیں گے۔

7.3 ششماہی مشاورت/ سالانہ اجتماع

جہاں ممکن ہو حلقہ مقامی تنظیم کی سطح پر ششماہی یا سالانہ اجتماع منعقد کروایا جائے گا جس میں ناظمہ عالیہ یا مرکزی اُسرہ سے خواتین کی شرکت ہو سکے۔

7.4 تعلیمی وتدریسی کورسز

جہاں ایسی کارکن رفیقات موجود ہوں جو تدریسی خدمات سرانجام دے سکیں وہاں اسرہ/ مقامی تنظیم حلقہ کی سطح پر تدریسی کورسز کا بندوبست کیا جائے گا۔

دفعہ 8 : نظام مالیات

8.1 منفرد رفیقات اپنے علاقے میں تنظیم اسلامی کے کسی بھی قریبی دفتر میں انفاق کی ادائیگی کر کے یا بذریعہ منی آرڈر رچیک رڈرافٹ مرکزی اسرہ کو انفاق ارسال کر کے رسید حاصل کر سکیں گی۔

8.2 اُسروں سے وابستہ رفیقات اپنی کوآرڈینیٹر کے ذریعے انفاق کی ادائیگی کر کے رسید حاصل کریں گی۔

8.3 اُسروں سے وصول شدہ انفاق اخراجات منہا کرنے کے بعد مردوں کے اُسرہ/ مقامی تنظیم/ حلقہ کے بیت المال میں جمع کرایا جائے گا۔

☆ — ☆ — ☆

(۱)

عہد نامۂ رفاقت

عَقدُ الرِّفاقةِ۔ لِلتَّنظِيمِ الإسلامِیْ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ
وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ
(صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ)

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ
وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا

- اِنِّیْ اُعَاھِدُ اللّٰہَ
  - عَلٰی اَنْ اَھْجُرَ کُلَّ مَا یَکْرَہُہٗ
  - وَاُجَاھِدَ فِیْ سَبِیْلِہٖ جُھْدَ اِسْتِطَاعَتِیْ
  - وَاُنْفِقَ مَالِیْ وَاَبْذُلَ نَفْسِیْ
  لِاِقَامَۃِ دِیْنِہٖ وَاِعْلَاءِ کَلِمَتِہٖ
- وَلِاَجْلِ ذٰلِکَ

اِنِّیْ اُبَایِعُ حَافِظ عَاکِف سَعِیْد اَمِیرَ التَّنْظِیمِ الاِسْلامِی

اَسْتَعِیْنُ اللّٰہَ رَبِّیْ وَاَسْتَقْدِرُہٗ عَلَی الاِسْتِقَامَۃِ
عَلَی الدِّیْنِ وَاِیْفَاءِ ھٰذَا العَھْدِ

عہد نامۂ رفاقت تنظیمِ اسلامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اس کا کوئی ساجھی نہیں۔
اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

میں اللہ تعالیٰ سے اپنے آج تک کے، تمام گناہوں کی معافی کا خواستگار ہوں،
اور (آئندہ کے لیے) خلوص دل کے ساتھ اس کی جناب میں توبہ کرتا ہوں۔

- میں اللہ تعالیٰ سے عہد کرتا ہوں کہ:
  - اُن تمام چیزوں کو ترک کر دوں گا جو اُسے ناپسند ہیں،
  - اور اُس کی راہ میں مقدور بھر جہاد کروں گا
  - اور اُس کے دین کی اقامت اور اُس کے کلمہ کی سربلندی کے لیے
  اپنا مال بھی صرف کروں گا اور جان بھی کھپاؤں گا۔
- اور اس مقصد کی خاطر

میں امیرِ تنظیمِ اسلامی حافظ عاکف سعید سے بیعت کرتا ہوں

میں اللہ ہی سے مدد اور توفیق کا طالب ہوں کہ وہ مجھے دین پر استقامت اور
اس عہد کے پورا کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔

نام ______________ ولدیت ______________

دستخط ______________ تاریخ ______________

رجسٹریشن نمبر | | | | - | | - | | | | | آپ کی بیعت قبول کی جاتی ہے۔ برائے امیرِ تنظیمِ اسلامی حافظ عاکف سعید ______________

(و)

ذاتی اصلاحی یادداشت

Revised Feb 2010

ذاتی اصلاح کے لئے یادداشت

(نظم بالا آپ کا محاسب یا ناقد نہیں بلکہ رضائے الٰہی کے حصول میں آپ کا ممد و معاون ہے)

رفیق کا نام ______ رجسٹریشن نمبر ______ یادداشت برائے ماہ ______ سنہ ء

باجماعت نماز کے لئے حرف (ج) بغیر جماعت کیلئے (غ) اور قضا نماز کیلئے (ق) استعمال کیجئے						سنت/ نوافل	تلاوت قرآن، ترجمہ (نصاب)	
تاریخ	فجر	ظہر	عصر	مغرب	عشاء	تہجد	تلاوت	ترجمہ
1								
2								
3								
4								
5								
6								
7								
8								
9								
10								
11								
12								
13								
14								
15								
16								
17								
18								
19								
20								
21								
22								
23								
24								
25								
26								
27								
28								
29								
30								
31								

دیگر قابل ذکر امور..

....

تجوید کی کیفیت	تسلی / غیر تسلی بخش
حفظ کی کیفیت	
ذخیرۂ حفظ میں اضافہ ہو رہا ہے یا اعادہ	
آخری بیس سورتیں	
اذکار مسنونہ	
ادعیہ ماثورہ	
منتخب نصاب	
باقی قرآن	

انفاق فی سبیل اللہ کی کیفیت کیا ہے؟	
ماہانہ انفاق جمع کرایا؟	
پہلے سے زیادہ؟	
5 فیصد یا 5 فیصد سے زیادہ	

اذکار مسنونہ و ادعیہ ماثورہ (✓/×)	
زندگی کا معمول بن گئے ہیں	
کوشش جاری ہے	

اجتماعات میں شرکت	
کیا آپ نظام العمل میں طے شدہ (پشت پر درج) یا نظم کی طرف سے بلائے گئے کسی اجتماع یا مہم وغیرہ سے غیر حاضر رہے؟	
اگر غیر حاضر رہے تو کیا غیر حاضری کے عذر سے آپ مطمئن تھے؟	
کیا غیر حاضری کے لئے نظم بالا سے پیشگی اجازت لی تھی؟	

مطالعہ اور سماعت کی کیفیت	
امیر محترم کا ہفتہ وار خطاب جمعہ سنا یا پڑھا ہے؟	۱ ۲ ۳ ۴ ۵
ندائے خلافت زیر مطالعہ رہا ہے؟	۱ ۲ ۳ ۴ ۵
میثاق کا مطالعہ کیا ہے؟	
نصاب کے مطالعہ / سماعت میں پیش رفت یا دہرائی ہوئی؟	
کیا کوئی مجموعہ حدیث اور کتب سیرت زیر مطالعہ رہی؟	
کیا دیگر دینی موضوعات زیر مطالعہ / سماعت رہے؟	

مراقبہ (درج ذیل پہلوؤں سے اپنے ظاہر و باطن کا جائزہ لیتے رہے ہیں) (☒/☑)	
اصلاح نیت / اخلاص / رضائے الٰہی / اُخروی نجات	☐
باطنی بیماریوں (نفاق / تکبر / غصہ / حسد / کینہ / بغض و عداوت)	☐
عبادات میں فرائض و واجبات کا اہتمام	☐
معاملات و اخلاقیات (حقوق العباد)	☐
معیشت میں حرام و مکروہات سے اجتناب	☐
معاشرت میں اتباع سنت (شرعی پردہ / مخلوط محافل، نامحرم و بدعات سے اجتناب / معیار زندگی / وضع قطع وغیرہ)	☐
اس ضمن میں مشکلات کے حوالے سے اپنے نقیب کی مدد طلب کر سکتے ہیں	

ذاتی انفرادی دعوتی کام (الاقرب فالاقرب / الدین النصیحہ)	
کیا کچھ احباب آپ کے زیر دعوت ہیں؟	
ان کو دعوت میں پیش رفت ہو رہی ہے؟	
زیر دعوت احباب میں اضافہ ہو رہا ہے؟	

اگر کسی رفیق کے ساتھ قرض حسنہ / کاروباری لین دین کیا ہے تو کیا؟	
تحریری شکل میں کیا؟	☐ جی ہاں ☐ جی نہیں
اس تحریر پر دو گواہ ٹھہرائے؟	☐ جی ہاں ☐ جی نہیں
یہ گواہ نظم بالا میں سے ہیں؟	☐ جی ہاں ☐ جی نہیں

نوٹ: قضا نماز سے ہماری مراد ہے نماز کی بعد از وقت ادائیگی۔ نماز کو یکسر چھوڑ دینا ہمارے نزدیک ایک مسلمان کے لئے ممکن ہی نہیں ہے۔ اصلاً تو رسول کا معمول یعنی آذان پر دنیاوی معاملات سے منقطع ہونا پیش نظر رہے اور باجماعت نماز تکبیر اولیٰ سے ہی ادا کرنے کی کوشش رہنی چاہئے۔

A-67، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور، 54000 فون: 36316638، 36366638، 36293939
فیکس: 36271241 ای میل: markaz@tanzeem.org

www.tanzeem.org

مراکز حلقہ جات

تیمرگرہ	فون: 0945-601337 موبائل: 0345-9535797 ای میل: timergara@tanzeem.org
پشاور	فون: 091-2262902 موبائل: 0300-5903211 ای میل: peshawar@tanzeem.org
اسلام آباد	فون: 051-4434438 موبائل: 0333-5382262 ای میل: islamabad@tanzeem.org
مظفرآباد	فون: 0992-504869 موبائل: 0345-5295450 ای میل: muzaffarabad@tanzeem.org
گوجرخان	فون: 051-3516574 موبائل: 0333-5133598 ای میل: gujarkhan@tanzeem.org
گوجرانوالہ	فون: 055-3015519 موبائل: 0300-7446250 ای میل: gujranwala@tanzeem.org
لاہور	فون: 042-35845090 موبائل: 0332-4353694 ای میل: lahore@tanzeem.org
عارف والا	فون: 0457-830884 موبائل: 0300-4120723 ای میل: arifwala@tanzeem.org
بہاولپور	فون: 063-2251104، 062-2280632/0333-6314487 haroonabad@tanzeem.org
فیصل آباد	فون 041-2624290 موبائل: 0300-6690953 ای میل: faisalabad@tanzeem.org
سرگودھا	فون: 048-3713835 موبائل: 0300-9603577 ای میل: sargodha@tanzeem.org
ملتان	فون: 061-8149212/0321-6313031 ای میل: multan@tanzeem.org
سکھر	فون 071-5631074 موبائل: 0300-3119893 ای میل: sukkur@tanzeem.org
حیدرآباد	فون: 022-2929434 موبائل: 0333-2608043 ای میل: hyderabad@tanzeem.org
کراچی شمالی	فون: 021-36311223، 021-36806561 ای میل: karachinorth@tanzeem.org
کراچی جنوبی	فون: 34306041، 021-34306040 ای میل: karachisouth@tanzeem.org
کوئٹہ	فون: 081-2842969 موبائل: 0346-8300216 ای میل: quetta@tanzeem.org

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید** حفظہ اللہ

انجمن خُدّامُ القرآن

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم وحِکمت** کی

وسیع پیمانے ......اور...... اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ -اور- غلبۂ دینِ حق کے دَورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

''اس امر کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ پیشِ نظر تنظیم ہرگز ''الجماعۃ'' کے حکم میں نہ ہوگی۔ الجماعۃ کا مقام ہماری دانست میں امتِ مسلمہ کو بحیثیت مجموعی حاصل ہے۔ پیشِ نظر اجتماعیت کی حیثیت مسلمانوں کی ایک ایسی تنظیم کی ہوگی جس میں وہ لوگ شریک ہوں گے جو خود اصلاحِ نفس اور تعمیرِ سیرت کے خواہش مند ہوں اور ان جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں (یعنی عبادتِ رب، شہادت علی الناس اور اقامتِ دین) سے عہدہ برآ ہونا چاہیں جو دین کی جانب سے اُن پر عائد ہوتی ہیں تاکہ ایک طرف اُن کا باہمی تعاون ایک دوسرے کے لئے سہارا بن سکے اور دوسری طرف اصلاحِ معاشرہ کے لئے ایک مؤثر قوت فراہم ہو جائے...... دین کی خدمت نہایت وسیع و عظیم کام ہے اور اس کے گوشے بے شمار ہیں۔ ہم ان تمام جماعتوں اور اداروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کسی بھی گوشے میں دین کی خدمت کا کام کر رہے ہیں اور ان شاء اللہ ان کے ساتھ ہمارا رویہ تعاون و تائید ہی کا ہوگا۔ اپنے فہم و فکر کے مطابق ہم بھی دین کی خدمت کی ایک ادنیٰ سی کوشش کے لئے جمع ہو رہے ہیں اور یہ توقع کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ دین کے تمام خادم ہمیں اپنے رفیقِ راہ ہی گردانیں گے...... اس تصریح کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ ہم واقعۃً تمام دینی عناصر خصوصاً علمائے کرام کے تعاون کی شدید احتیاج محسوس کرتے ہیں''۔

ماخوذ از

''توضیحاتِ قرار دادِ تاسیس''

از قلم بانیٔ تنظیمؒ